

ذراتِ تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا
اقبالؔ

کتابُ التقدیر

(دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا قابلِ فہم بصیرت افروز حل)

پرویزؔ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ۵۴۶۶۰

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	کتاب التقدير
مصنف	علامہ غلام احمد پرویز
شائع کردہ	طلوع اسلام ٹرسٹ (جسٹڈ) گلگت ۲، لاہور ۵۴۶۶۰
طابع	خالد منصور نسیم
مطبع	التور پرنٹرز و پبلیشرز، ۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵۔
ایڈیشن اول	اکتوبر ۱۹۷۱ء
ایڈیشن دوم	جون ۱۹۷۵ء
ایڈیشن سوم	ستمبر ۱۹۸۶ء (بلا ترمیم)
ایڈیشن چہارم	جون ۱۹۹۴ء (بلا ترمیم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مشمولات

کتاب التقدير

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۳	اشیائے کائنات مجبور، انسان صاحب اختیار انسانی اختیار کی حد۔	۳	فہرست مشمولات پیش لفظ
۳۴	۸۔ قانون مکافات عمل؛ اقتدارِ خداوندی کے تابع	۲۳	
	دوسرا باب — خدا کا تصور		پہلا باب — پس منظر
۳۵	۱۔ خدا کی ”دو دنیا یں“ — عالمِ امر اور عالمِ خلق	۳۰	۱۔ ابتدائے آفرینش کا انسان۔
۳۶	۲۔ عالمِ امر میں خدا کا مطلق ارادہ اور اختیار کار فرما ہے۔	”	۲۔ چاروں طرف خوفِ سامانیاں اور یہ بے دست و پا۔
	۳۔ تخلیق کے معنی — اس عمل میں انسان بھی شریک ہو سکتا ہے۔	۳۱	۳۔ اس کا اپنے متعلق پہلا تصور — کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے۔
۳۷	۴۔ عالمِ امر میں خدا کی مشیت کیسی ہے،	”	۴۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کا تصور۔
		۳۲	۵۔ عہدِ سحر (جادو کی کرشمہ زائیاں)
		”	۶۔ وحی کی رو سے عطا شدہ تصورات

[illegible]

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۷	قانون اس پر منطبق ہو جائے گا۔ قوموں کے عروج و زوال کے متعلق بھی یہی قانون متعین ہے۔	۵۲	ذمہ دار وہی قرار پا سکتا ہے جو صاحب اختیار و ارادہ ہو۔
۵۸	لفظ تقدیر کی مزید وضاحت۔ تقدیر کی جامع تعریف	۵۳	۳۔ قصہ آدم میں جبر و اختیار کی وضاحت۔ معصیت آدم سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ آدم نے اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اس لئے اس میں اصلاح کے امکانات پیدا ہو گئے۔ ابلیس نے کہا کہ وہ اپنے عمل کا ذمہ دار نہیں۔ اس سے معصیت خدا نے کرائی ہے اس لئے وہ اصلاح خویش سے بے طور پر محروم و مایوس ہو گیا۔
۵۹	حضرت عمرؓ نے اس نکتہ کی وضاحت کس بلغ انداز میں فرمائی۔	۵۴	۴۔ کفار و مشرکین کی بھی یہی روش ہوتی ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔
۶۰	مستحکم ارادے والا انسان، تقدیر کو اپنی مرضی کے تابع رکھتا ہے۔ عقیدہ جبر کے مویدین کی ایک اصولی دلیل اور اس کا جواب۔	۵۵	۵۔ ہم جو ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی، تو سوچئے کہ قرآن اس کی بابت کیا کہتا ہے؟
۶۱	انسان کو اپنے مستقبل کا علم نہیں ہو سکتا وہ ایسی دنیا میں گھرا ہوا ہے جہاں اس کے مستقبل پر مختلف عوامل اثر انداز ہوتے ہیں جن پر اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ دوسری دلیل۔ خدا کو انسان کے مستقبل کا علم ہوتا ہے۔ ایسا اسی کے متعلق ہو سکتا ہے جو مجبور ہو۔ اس دلیل کا جواب۔	۵۵	۶۔ انسانی دنیا میں انسان کی مشیت۔
۶۲	علم انسانی اور علم خداوندی میں فرق۔	۵۶	۷۔ لیکن یہ اختیار، عمل کرنے کا ہے۔ عمل کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوگا۔
		۵۶	۸۔ جس قسم کا عمل انسان کرے گا اسی قسم کا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۶۳	۱۵۔ انسان کے متعلق پیشگوئیاں محض ظن و قیاس ہیں۔ منجسم، رمال، فالیں بتانے والے، سب قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ انہیں علم کی بارگاہ سے آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔	۶۴	۸۔ اعمال کے نتائج غیر منتقل ہوتے ہیں نہ "عذاب" کسی اور کی طرف ٹوٹایا جاسکتا ہے نہ "ثواب" کسی دوسرے کو پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس میں کسی کی استثنائیں نہیں۔ حتیٰ کہ رسالت کی بھی نہیں۔
۶۵	۱۶۔ لیکن اب ہماری حالت !	۶۵	۹۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کا نتیجہ خود بھگتنا پڑتا ہے۔
چوتھا باب — قانون مکافا عمل			
۶۶	۱۔ انسانی زندگی کی دو سطحیں۔ (i) طبعی زندگی۔ (ii) انسانی ذات۔	۶۶	۱۷۔ عام روش یہ ہے کہ کامیابی کو انسان اپنی کاریگری کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور ناکامیوں کے لئے کہتا ہے کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔
۶۷	۲۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین۔	۶۷	۱۸۔ یہ ذہن انسانی کے عہد طفولیت کے اثرات ہیں۔
۶۸	۳۔ قرآن کریم ان تمام دوائریں انسان کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔	۶۸	۱۹۔ مصائب و آلام خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔
۶۹	۴۔ اس باب میں قرآنی تصریحات و شہادات۔	۶۹	۲۰۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ہلکت کا وقفہ۔
۷۰	۵۔ ہمارا "نصیب" کیا ہے۔	۷۰	۲۱۔ انسان اپنے عمل کا نتیجہ پہلے ہی آگے بھیج دیتا ہے۔
۷۱	۶۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، کا اصول۔	۷۱	۲۲۔
۷۲	۷۔ اعمال نامہ — انسانی اعمال کے مجموعی نتائج۔	۷۲	۲۳۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۸۲	ذلت و غوری بھی انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔	۹۳	اور اس کا اطمینان بخش جواب۔
۸۳	خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔	۱۵	نفع اور نقصان کی دو قسمیں۔
۸۵	سورہ نسا کی دو آیات — ایک میں کہا گیا ہے کہ مصائب و حسنات سب خدا کی طرف سے ہیں۔ دوسری کہا گیا ہے کہ حسنات خدا کی طرف سے ہیں اور مصائب تمہاری اپنی طرف سے۔ کیا یہ تضاد ہے؟ نہیں ان کا صحیح مفہوم۔	۹۴	(i) طبعی زندگی سے متعلق نفع یا نقصان طبعی قوانین کے مطابق واقع ہوتا ہے اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔
۸۶	ہمارے غلط تصورات اور ان کا نتیجہ۔	۹۵	(ii) دوسری (یعنی انسانی) زندگی سے متعلق نفع یا نقصان۔ مادی مفادات اور مستقل اقدار میں تضاد۔
۸۷	اتفاق یا (BY CHANCE) کے کیا معنی ہیں!		(iii) مادی مفادات کی اہمیت۔ حق و باطل کا ٹکراؤ۔ اس میں مضامین مشکلات کا سامنا۔
۸۸	غلط معاشرہ میں نیک ریت افراد کا حشر۔	۹۹	قسم کے نقصانات سے حفاظت صحیح (قرآنی) معاشرہ ہی میں ہو سکتی ہے۔
۸۹	فرد اور جماعت (معاشرہ) کا تعلق۔		طبعی نقصانات سے بھی اور انسانی ذات کے زیاں سے بھی۔
۹۰	اس کو جہنم میں لیڈر اور عوام کے مکالمات کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔		
۹۱	صدرِ اول میں ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہم ہر نتیجہ کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیتے تھے۔		
۹۳	دیانتدارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی پریشانیوں کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ہے؟ ایک اہم سوال۔		
			چھٹا باب — قوموں کی تقدیر
		۱۰۰	قوموں کی موت و حیات کا بنیادی اصول — خارجی تغیرات ہمیشہ نفسیاتی تبدیلی کے تابع ہوتے ہیں۔
		۱۰۱	تاریخی شواہد سے دلائل۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	سے بچنے کا راستہ کونسا ہے۔	۱۰۲	۳۔ تکذیبِ رُس سے کیا مراد ہے۔
	ساتواں باب — خیر و شر	۱۰۳	۴۔ قوموں پر ظلم (نا انصافی) کی وجہ سے تباہی آتی ہے۔
۱۲۶	۱۔ مسئلہ خیر و شر نے انسانی ذہن کو کس وقفہ اضطراب رکھا ہے۔	۱۰۴	۵۔ قوموں کی تباہی میں ہمدت کا وقفہ جسے اجل کہا جاتا ہے۔
۱۲۷	۲۔ حساس قلوب کے تاثرات۔ ہما تابد کادلی درو مند۔	۱۰۶	۶۔ ہر اجل کے لئے قانون ہے جو غیر تبدیل ہے۔ یعنی جیسا کسی قوم کا نظام ویسی اس کی اجل۔
..	۳۔ ان احساسات نے بعد میں فلسفہ کی شکل اختیار کر لی۔ سمجھا یہ گیا کہ مادی دنیا ہے ہی قابلِ نفرت۔	۱۰۷	۷۔ قرآن کی رُو سے "کتاب" کا مفہوم۔
..	اس مسلک کا نام تقوُّف ہے۔	۱۱۱	۸۔ مستودع اور مستقر کا مفہوم۔
..	۴۔ ہندوؤں نے خیر و شر کو عقیدہ تناسخ کی رُو سے حل کرنا چاہا۔	۱۱۳	۹۔ سورہ حدید کی آیات — ہر مصیبت ظاہر ہونے سے پہلے کتاب میں ہوتی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم۔
۱۲۸	۵۔ ایران کے مجوس نے کہا کہ دنیا میں اہرمین و یزداں کی جنگ مسلسل جاری ہے۔ اسے ثنویت کا مسلک کہا جاتا ہے۔	۱۱۴	۱۰۔ (ضمنی) قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں) باؤن اللہ کا صحیح مفہوم
..	۶۔ شوپنہار نے کہا کہ دنیا میں شر ہی شری ہے خیر کا وجود ہی نہیں۔	۱۱۸	۱۱۔ اذنِ خداوندی کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آتی۔ اس کا صحیح مفہوم۔
۱۲۹	۷۔ بعض نے کہا کہ خیر و شر کا خارج میں وجود ہی نہیں۔ یہ محض انسانی تاثرات کا نام ہے۔	۱۲۳	۱۲۔ قانونِ خداوندی سامنے رہے تو انسان کو ایسی روشنی مل جاتی ہے جس سے وہ دیکھ لیتا ہے کہ مصیبتوں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۳۵	کر لیتے ہیں، 'خیر' کو خدا نے اپنی فطرت منسوب کیا ہے، شر کو نہیں۔	۱۲۹	۸۔ قدر آنی تعلیم۔ کائنات بالحق، تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے، تخریبی نہیں۔
۱۳۶	۱۷۔ اخلاقی خیر اور شر۔	۱۳۰	۹۔ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔
..	۱۸۔ مقصد، معیار خیر و شر کا ہوتا ہے۔	۱۳۱	۱۰۔ ارباب فکر و تحقیق کی تحسین و آفریں۔
..	۱۹۔ لیکن مقصد کا تعین کون کرے؟	..	۱۱۔ اپنی کو قرآن علماء کہتا ہے۔
۱۳۸	۲۰۔ یہ وحی خداوندی ہی کر سکتی ہے۔	۱۳۲	۱۲۔ جب فطرت کی قوتیں بیک ہوں تو وہ تباہیاں لاتی ہیں۔
..	۲۱۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر قوت کا استعمال اور اس کا نتیجہ۔ عصر حاضر کا جہنم	۱۳۳	۱۳۔ جب وہ انسان کے کنٹرول میں آجائیں تو منفعت بخش نتائج پیدا کرتی ہیں۔
..	۲۲۔ اس سے طبقات و جود میں آتے ہیں۔	..	۱۳۔ ۱۔ درد کا مسئلہ۔
۱۳۹	۲۳۔ یعنی پیدا نشی امیر اور غریب، معزز اور ذلیل، حاکم اور محکوم۔	۱۳۴	۱۴۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کس شے کو کس مقدار میں استعمال کیا جائے یہی اس کی "تقدیر" ہوتی ہے۔
..	۲۴۔ ہندوؤں نے اسے پچھلے جنم کے کاموں کا نتیجہ قرار دیا۔	..	۱۴۔ ۲۔ ہومیو پیتھک طریق علاج۔
۱۴۰	۲۵۔ اور ہمارے ہاں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔	۱۳۵	۱۵۔ مقدار کا فرق۔
۱۴۱	۲۶۔ نفع نقصان کا ایک اور معیار۔ یعنی مستقل اقدار جس بات سے انسانی ذات کو استحکام حاصل ہو، وہ خیر۔	..	۱۶۔ من شر ما خلق کا مفہوم
..	۲۷۔ جس سے اس میں ضعف و انتشار پیدا ہو، وہ شر۔	۲۴۷	خدا چشمہ خیر ہے، شر ہم خود پیدا
۱۴۲	۲۸۔ اس کو اخلاقیات کہا جاتا ہے۔		
..	۲۹۔ سیکولر نظام میں اخلاقیات کی کوئی		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	مناظر۔		مستقل بنیاد نہیں ہوتی۔
۱۵۱	انسان جو کچھ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔	۱۲۲	۲۵۔ خیر مطلق اور شر مطلق سے مراد کیا ہے۔
		۱۲۳	۲۶۔ خیر کیسے حاصل ہوتا ہے۔
		۱۲۵	۲۷۔ مادی مفاد اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت احتساب خویش — یعنی دیکھنا کہ میری ذات کس قدر مستحکم ہو چکی ہے۔
۱۵۲	شیطان یا ابلیس کون ہے اور وہ کیا کرتا ہے۔ یہ انسان کے اپنے کوشش جذبات اور بے باک عقل کا نام ہے۔	۱۲۶	۲۸۔ عصر حاضر کا انسان، فیصلہ نفع و ضرر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ مستقل اقدار کی طرف سے بے نیاز ہو چکا ہے۔
۱۵۳	لیکن انسان اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول نہ کرنے کے لئے نہیں شیطان کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔	۱۲۷	۲۹۔ خیر و شر کے بجائے نفع نقصان کے الفاظ اس کا اختیار بھی فی ذاتہ کسی کو نہیں۔ نہ دیوی دیوتاؤں کو۔ نہ ہی کسی بزرگ کو — حتیٰ کہ حضور ذات رسالتؐ کو بھی نہیں۔
۱۵۴	انسانی جذبات کی موجودگی میں انسان محفوظ کیسے رہے؟	۱۲۸	۳۰۔ غلط معاشرہ میں انسانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچتا ہے۔
۱۵۵	ایک تابندہ حدیث — ابلیس کو مسلمان کر لو۔	۱۲۹	۳۱۔ اس کا علاج یہ ہے کہ غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر دو۔
۱۵۶	اسوۃ یوسفیؑ۔	۱۳۰	۳۲۔ ایک اہم نکتہ — مستقل اقدار کی مطابقت انسانی اعمال کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔
۱۵۷	”شیطان کو پیدا ہی کیوں کیا؟“ اس اعتراض کا جواب۔	۱۳۱	۳۳۔ جنگ بدر اور بیعت رضوان کے حسین
۱۶۱	آٹھواں باب — اگر..... تو		
	قانون کی تین مروجہ شکلیں۔		
	(۱) عدالتی قانون۔ اس میں عمل کا نتیجہ اس کے اندر مضمر نہیں ہوتا۔		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۴۱	۳۔ ہماری تاریخ ناقابلِ اعتماد ہے۔	۱۴۲	باہر سے وارد کیا جاتا ہے۔
۱۴۲	۴۔ تاریخ کے متعلق، صحیح مسلک —	..	(۲) طبعی قوانین۔ ان میں عمل کا نتیجہ
۱۴۳	عہدِ رسالتؐ اور صحابہ کبارؓ کی تاریخ کی	..	کے اندر ہوتا ہے۔
..	کسوٹی قرآنِ کریم ہے۔	۱۴۳	(۳) مستقل اقدارِ خداوندی۔
..	ظہورِ اسلام کے وقت جبر کا عقیدہ رکھنے	..	(۴) کتاب اور حکمت کا مفہوم۔
..	والے لوگ موجود تھے۔	..	(۵) دین اور مذہب میں فرق۔
..	قرآن انہیں کافر، مشرک، گمراہ،	..	میں "حکمت" نہیں ہوتی۔
..	کہتا ہے۔	..	احکام کی تعمیل کی جاتی ہے۔
۱۴۴	۵۔ حضرت عمرؓ نے جبر کا عقیدہ رکھنے والے	۱۴۴	(۶) "اگر.... تو" کی چند قرآنی مثالیں۔
..	کو سزا دی۔	..	(۷) قرآنِ کریم، ضابطہ قوانینِ خداوندی ہے
..	۶۔ جب قرآن نگاہوں سے اوجھل ہو گیا	۱۴۸	نوائیاب — یہ کیسے ہو گیا؟
..	اور صحیح اسلامی مرکزیت (خلافت	۱۔	یہ قرآنِ کریم کی تعلیم ہے۔ اس کے برعکس
..	علیٰ منہاجِ رسالت) باقی نہ رہی، تو	..	ہمارے مروجہ عقائد کیا ہیں؟
..	غیر قرآنی عقائد و تصورات کے لئے	..	یہ کہ انسان مجبور محض ہے۔ اس کے
..	دروازے کھل گئے۔	..	کے ہر بات مقدس ہے۔
۱۴۵	۸۔ پہلا دروازہ — شکست خوردہ اہل	..	قیمت کا لکھا امٹ ہے۔
..	ایران کا جذبہ انتقام۔	۱۴۹	۲۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے ہو گئی؟
۱۴۶	دوسرا دروازہ — عیسائیوں اور	..	اس کے لئے اسلاف کی منطقی بخشش
..	یہودیوں کی سازش۔	..	کو سامنے لانے سے کچھ حاصل نہیں
..	۹۔ ضمناً — عربی اسلام اور عجمی اسلام	..	ہوگا۔
..	سے کیا مراد ہے؟	۱۵۰	مثلاً — امام ابنِ حزم کے دلائل۔
۱۴۷	۱۰۔ امت میں سب سے پہلا اختلافی مسئلہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۸۹	مخالفین نے ان کے خلاف ایک لیبل لگا دیا اور یوں انہیں نکتہ بست کر رکھ دیا۔ سرسید کی مثال۔ اور خود راقم الحروف کی یہی ٹیکنک ہر جگہ استعمال ہوتی ہے۔	۱۷۷	جس سے فرقہ بندی کا آغاز۔ مسئلہ تقدیر۔
۱۹۱	مسئلہ جبر کی تائید میں قرآنی آیات اور اور ان کا صحیح مفہوم۔	۱۷۸	۱۱۔ ایران کے اساوہ۔ اس کے بانی تھے۔
۱۹۵	فہم قرآن کے سلسلہ میں بنیادی اصول۔	۱۷۹	۱۲۔ انہوں نے یہ عقائد عام کر دیئے۔
		۱۸۰	۱۳۔ عیسائیت کے اثرات۔
		۱۸۱	۱۴۔ اور یہودیت کے۔
		۱۸۲	۱۵۔ اس غیر قرآنی عقیدہ کی دینی سند کہاں سے قرآن کی گئی۔ روایات سے۔
		۱۸۳	۱۶۔ روایات (حدیث) کی تاریخ۔
		۱۸۴	۱۷۔ عقیدہ جبر کی تائید میں روایات
		۱۸۵	۱۸۔ ان پر بحث اور گفتگو کی ممانعت۔
		۱۸۶	۱۹۔ آیات متشابہات و محکمات۔
		۱۸۷	۲۰۔ اجزائے ایمان کا تعلق اصول دین سے ہے۔
		۱۸۸	۲۱۔ قرآن کریم میں اجزائے ایمان پانچ ہیں۔
		۱۸۹	۲۲۔ ان پر چھٹے جزو، یعنی تقدیر پر ایمان لانے کا اضافہ کیا گیا۔
		۱۹۰	۲۳۔ سید سلیمان ندوی مرحوم اسے سیرۃ النبی میں بیان کرتے ہیں۔
		۱۹۱	۲۴۔ اس عقیدہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی۔
		۱۹۲	
		۱۹۳	
		۱۹۴	
		۱۹۵	
		۱۹۶	
		۱۹۷	
		۱۹۸	
		۱۹۹	
		۲۰۰	
		۲۰۱	
		۲۰۲	
		۲۰۳	
		۲۰۴	
		۲۰۵	
		۲۰۶	
		۲۰۷	
		۲۰۸	
		۲۰۹	
		۲۱۰	
		۲۱۱	
		۲۱۲	
		۲۱۳	
		۲۱۴	
		۲۱۵	
		۲۱۶	
		۲۱۷	
		۲۱۸	
		۲۱۹	
		۲۲۰	
		۲۲۱	
		۲۲۲	
		۲۲۳	
		۲۲۴	
		۲۲۵	
		۲۲۶	
		۲۲۷	
		۲۲۸	
		۲۲۹	
		۲۳۰	
		۲۳۱	
		۲۳۲	
		۲۳۳	
		۲۳۴	
		۲۳۵	
		۲۳۶	
		۲۳۷	
		۲۳۸	
		۲۳۹	
		۲۴۰	
		۲۴۱	
		۲۴۲	
		۲۴۳	
		۲۴۴	
		۲۴۵	
		۲۴۶	
		۲۴۷	
		۲۴۸	
		۲۴۹	
		۲۵۰	
		۲۵۱	
		۲۵۲	
		۲۵۳	
		۲۵۴	
		۲۵۵	
		۲۵۶	
		۲۵۷	
		۲۵۸	
		۲۵۹	
		۲۶۰	
		۲۶۱	
		۲۶۲	
		۲۶۳	
		۲۶۴	
		۲۶۵	
		۲۶۶	
		۲۶۷	
		۲۶۸	
		۲۶۹	
		۲۷۰	
		۲۷۱	
		۲۷۲	
		۲۷۳	
		۲۷۴	
		۲۷۵	
		۲۷۶	
		۲۷۷	
		۲۷۸	
		۲۷۹	
		۲۸۰	
		۲۸۱	
		۲۸۲	
		۲۸۳	
		۲۸۴	
		۲۸۵	
		۲۸۶	
		۲۸۷	
		۲۸۸	
		۲۸۹	
		۲۹۰	
		۲۹۱	
		۲۹۲	
		۲۹۳	
		۲۹۴	
		۲۹۵	
		۲۹۶	
		۲۹۷	
		۲۹۸	
		۲۹۹	
		۳۰۰	
		۳۰۱	
		۳۰۲	
		۳۰۳	
		۳۰۴	
		۳۰۵	
		۳۰۶	
		۳۰۷	
		۳۰۸	
		۳۰۹	
		۳۱۰	
		۳۱۱	
		۳۱۲	
		۳۱۳	
		۳۱۴	
		۳۱۵	
		۳۱۶	
		۳۱۷	
		۳۱۸	
		۳۱۹	
		۳۲۰	
		۳۲۱	
		۳۲۲	
		۳۲۳	
		۳۲۴	
		۳۲۵	
		۳۲۶	
		۳۲۷	
		۳۲۸	
		۳۲۹	
		۳۳۰	
		۳۳۱	
		۳۳۲	
		۳۳۳	
		۳۳۴	
		۳۳۵	
		۳۳۶	
		۳۳۷	
		۳۳۸	
		۳۳۹	
		۳۴۰	
		۳۴۱	
		۳۴۲	
		۳۴۳	
		۳۴۴	
		۳۴۵	
		۳۴۶	
		۳۴۷	
		۳۴۸	
		۳۴۹	
		۳۵۰	
		۳۵۱	
		۳۵۲	
		۳۵۳	
		۳۵۴	
		۳۵۵	
		۳۵۶	
		۳۵۷	
		۳۵۸	
		۳۵۹	
		۳۶۰	
		۳۶۱	
		۳۶۲	
		۳۶۳	
		۳۶۴	
		۳۶۵	
		۳۶۶	
		۳۶۷	
		۳۶۸	
		۳۶۹	
		۳۷۰	
		۳۷۱	
		۳۷۲	
		۳۷۳	
		۳۷۴	
		۳۷۵	
		۳۷۶	
		۳۷۷	
		۳۷۸	
		۳۷۹	
		۳۸۰	
		۳۸۱	
		۳۸۲	
		۳۸۳	
		۳۸۴	
		۳۸۵	
		۳۸۶	
		۳۸۷	
		۳۸۸	
		۳۸۹	
		۳۹۰	
		۳۹۱	
		۳۹۲	
		۳۹۳	
		۳۹۴	
		۳۹۵	
		۳۹۶	
		۳۹۷	
		۳۹۸	
		۳۹۹	
		۴۰۰	
		۴۰۱	
		۴۰۲	
		۴۰۳	
		۴۰۴	
		۴۰۵	
		۴۰۶	
		۴۰۷	
		۴۰۸	
		۴۰۹	
		۴۱۰	
		۴۱۱	
		۴۱۲	
		۴۱۳	
		۴۱۴	
		۴۱۵	
		۴۱۶	
		۴۱۷	
		۴۱۸	
		۴۱۹	
		۴۲۰	
		۴۲۱	
		۴۲۲	
		۴۲۳	
		۴۲۴	
		۴۲۵	
		۴۲۶	
		۴۲۷	
		۴۲۸	
		۴۲۹	
		۴۳۰	
		۴۳۱	
		۴۳۲	
		۴۳۳	
		۴۳۴	
		۴۳۵	
		۴۳۶	
		۴۳۷	
		۴۳۸	
		۴۳۹	
		۴۴۰	
		۴۴۱	
		۴۴۲	
		۴۴۳	
		۴۴۴	
		۴۴۵	
		۴۴۶	
		۴۴۷	
		۴۴۸	
		۴۴۹	
		۴۵۰	
		۴۵۱	
		۴۵۲	
		۴۵۳	
		۴۵۴	
		۴۵۵	
		۴۵۶	
		۴۵۷	
		۴۵۸	
		۴۵۹	
		۴۶۰	
		۴۶۱	
		۴۶۲	
		۴۶۳	
		۴۶۴	
		۴۶۵	
		۴۶۶	
		۴۶۷	
		۴۶۸	
		۴۶۹	
		۴۷۰	
		۴۷۱	
		۴۷۲	
		۴۷۳	
		۴۷۴	
		۴۷۵	
		۴۷۶	
		۴۷۷	
		۴۷۸	
		۴۷۹	
		۴۸۰	
		۴۸۱	
		۴۸۲	
		۴۸۳	
		۴۸۴	
		۴۸۵	
		۴۸۶	
		۴۸۷	
		۴۸۸	
		۴۸۹	
		۴۹۰	
		۴۹۱	
		۴۹۲	
		۴۹۳	
		۴۹۴	
		۴۹۵	
		۴۹۶	
		۴۹۷	
		۴۹۸	
		۴۹۹	
		۵۰۰	
		۵۰۱	
		۵۰۲	
		۵۰۳	
		۵۰۴	
		۵۰۵	
		۵۰۶	
		۵۰۷	
		۵۰۸	
		۵۰۹	
		۵۱۰	
		۵۱۱	
		۵۱۲	
		۵۱۳	
		۵۱۴	
		۵۱۵	
		۵۱۶	
		۵۱۷	
		۵۱۸	
		۵۱۹	
		۵۲۰	
		۵۲۱	
		۵۲۲	
		۵۲۳	
		۵۲۴	
		۵۲۵	
		۵۲۶	
		۵۲۷	
		۵۲۸	
		۵۲۹	
		۵۳۰	
		۵۳۱	
		۵۳۲	
		۵۳۳	
		۵۳۴	
		۵۳۵	
		۵۳۶	
		۵۳۷	
		۵۳۸	
		۵۳۹	
		۵۴۰	
		۵۴۱	
		۵۴۲	
		۵۴۳	
		۵۴۴	
		۵۴۵	
		۵۴۶	
		۵۴۷	
		۵۴۸	
		۵۴۹	
		۵۵۰	
		۵۵۱	
		۵۵۲	
		۵۵۳	
		۵۵۴	
		۵۵۵	
		۵۵۶	
		۵۵۷	
		۵۵۸	
		۵۵۹	
		۵۶۰	
		۵۶۱	
		۵۶۲	
		۵۶۳	
		۵۶۴	
		۵۶۵	
		۵۶۶	
		۵۶۷	
		۵۶۸	
		۵۶۹	
		۵۷۰	
		۵۷۱	
		۵۷۲	
		۵۷۳	
		۵۷۴	
		۵۷۵	
		۵۷۶	
		۵۷۷	
		۵۷۸	
		۵۷۹	
		۵۸۰	
		۵۸۱	
	</		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۰۰	کسی کی عقل و فکر کو سلب کر کے اس سے کوئی بات منوانا جبر ہے۔ خدا ایسا نہیں چاہتا۔	۲۰۱	۶۔ کسی کی عقل و فکر کو سلب کر کے اس سے کوئی بات منوانا جبر ہے۔ خدا ایسا نہیں چاہتا۔
۲۰۱	اسی لئے رسول اللہ کو معجزات نہیں دیئے گئے۔	۲۰۲	۷۔ جبر سے ایمان لانے والا مومن نہیں کہلا سکتا۔
۲۰۲	جبر سے ایمان لانے والا مومن نہیں کہلا سکتا۔	۲۰۳	۸۔ خدا نے قتل و غارت گری کو جبر کیوں نہ روک دیا۔
۲۰۳	خدا نے قتل و غارت گری کو جبر کیوں نہ روک دیا۔	۲۰۴	۹۔ مَا شَاءَ اللہ کا مفہوم۔
۲۰۴	مَا شَاءَ اللہ کا مفہوم۔	۲۰۵	۱۰۔ قرآنی مثالیں۔
۲۰۵	قرآنی مثالیں۔	۲۰۶	۱۱۔ نفع اور نقصان۔ قانونِ مہلت۔
۲۰۶	نفع اور نقصان۔ قانونِ مہلت۔	۲۰۷	۱۲۔ اَللّٰهُ مَا شَاءَ اللہ کا مفہوم۔ اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا۔
۲۰۷	اَللّٰهُ مَا شَاءَ اللہ کا مفہوم۔ اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا۔	۲۰۸	۱۳۔ انسانی دنیا میں خود انسان کی "مشیت" کا فرما ہوتی ہے۔
۲۰۸	انسانی دنیا میں خود انسان کی "مشیت" کا فرما ہوتی ہے۔	۲۰۹	۱۴۔ یعنی اس کا اختیار و ارادہ۔
۲۰۹	یعنی اس کا اختیار و ارادہ۔	۲۱۰	۱۵۔ اِنْ شَاءَ اللہ کا مفہوم۔
۲۱۰	اِنْ شَاءَ اللہ کا مفہوم۔	۲۱۱	۱۶۔ پنی۔ آئی۔ اسے کے جہازوں کے حادثات
۲۱۱	پنی۔ آئی۔ اسے کے جہازوں کے حادثات	۲۱۲	۱۷۔ اس لئے کہ کپتان اِنْ شَاءَ اللہ نہیں کہتا تھا!
۲۱۲	اس لئے کہ کپتان اِنْ شَاءَ اللہ نہیں کہتا تھا!	۲۱۳	۱۸۔ حرفِ اِنْ کے معانی۔
۲۱۳	حرفِ اِنْ کے معانی۔	۲۱۴	۱۹۔
۲۱۴	۱۹۔	۲۱۵	۲۰۔
۲۱۵	۲۰۔	۲۱۶	۲۱۔
۲۱۶	۲۱۔	۲۱۷	۲۲۔
۲۱۷	۲۲۔	۲۱۸	۲۳۔
۲۱۸	۲۳۔	۲۱۹	۲۴۔
۲۱۹	۲۴۔	۲۲۰	۲۵۔
۲۲۰	۲۵۔	۲۲۱	۲۶۔
۲۲۱	۲۶۔	۲۲۲	۲۷۔
۲۲۲	۲۷۔	۲۲۳	۲۸۔
۲۲۳	۲۸۔	۲۲۴	۲۹۔
۲۲۴	۲۹۔	۲۲۵	۳۰۔
۲۲۵	۳۰۔	۲۲۶	۳۱۔
۲۲۶	۳۱۔	۲۲۷	۳۲۔
۲۲۷	۳۲۔	۲۲۸	۳۳۔
۲۲۸	۳۳۔	۲۲۹	۳۴۔
۲۲۹	۳۴۔	۲۳۰	۳۵۔
۲۳۰	۳۵۔	۲۳۱	۳۶۔
۲۳۱	۳۶۔	۲۳۲	۳۷۔
۲۳۲	۳۷۔	۲۳۳	۳۸۔
۲۳۳	۳۸۔	۲۳۴	۳۹۔
۲۳۴	۳۹۔	۲۳۵	۴۰۔
۲۳۵	۴۰۔	۲۳۶	۴۱۔
۲۳۶	۴۱۔	۲۳۷	۴۲۔
۲۳۷	۴۲۔	۲۳۸	۴۳۔
۲۳۸	۴۳۔	۲۳۹	۴۴۔
۲۳۹	۴۴۔	۲۴۰	۴۵۔
۲۴۰	۴۵۔	۲۴۱	۴۶۔
۲۴۱	۴۶۔	۲۴۲	۴۷۔
۲۴۲	۴۷۔	۲۴۳	۴۸۔
۲۴۳	۴۸۔	۲۴۴	۴۹۔
۲۴۴	۴۹۔	۲۴۵	۵۰۔
۲۴۵	۵۰۔	۲۴۶	۵۱۔
۲۴۶	۵۱۔	۲۴۷	۵۲۔
۲۴۷	۵۲۔	۲۴۸	۵۳۔
۲۴۸	۵۳۔	۲۴۹	۵۴۔
۲۴۹	۵۴۔	۲۵۰	۵۵۔
۲۵۰	۵۵۔	۲۵۱	۵۶۔
۲۵۱	۵۶۔	۲۵۲	۵۷۔
۲۵۲	۵۷۔	۲۵۳	۵۸۔
۲۵۳	۵۸۔	۲۵۴	۵۹۔
۲۵۴	۵۹۔	۲۵۵	۶۰۔
۲۵۵	۶۰۔	۲۵۶	۶۱۔
۲۵۶	۶۱۔	۲۵۷	۶۲۔
۲۵۷	۶۲۔	۲۵۸	۶۳۔
۲۵۸	۶۳۔	۲۵۹	۶۴۔
۲۵۹	۶۴۔	۲۶۰	۶۵۔
۲۶۰	۶۵۔	۲۶۱	۶۶۔
۲۶۱	۶۶۔	۲۶۲	۶۷۔
۲۶۲	۶۷۔	۲۶۳	۶۸۔
۲۶۳	۶۸۔	۲۶۴	۶۹۔
۲۶۴	۶۹۔	۲۶۵	۷۰۔
۲۶۵	۷۰۔	۲۶۶	۷۱۔
۲۶۶	۷۱۔	۲۶۷	۷۲۔
۲۶۷	۷۲۔	۲۶۸	۷۳۔
۲۶۸	۷۳۔	۲۶۹	۷۴۔
۲۶۹	۷۴۔	۲۷۰	۷۵۔
۲۷۰	۷۵۔	۲۷۱	۷۶۔
۲۷۱	۷۶۔	۲۷۲	۷۷۔
۲۷۲	۷۷۔	۲۷۳	۷۸۔
۲۷۳	۷۸۔	۲۷۴	۷۹۔
۲۷۴	۷۹۔	۲۷۵	۸۰۔
۲۷۵	۸۰۔	۲۷۶	۸۱۔
۲۷۶	۸۱۔	۲۷۷	۸۲۔
۲۷۷	۸۲۔	۲۷۸	۸۳۔
۲۷۸	۸۳۔	۲۷۹	۸۴۔
۲۷۹	۸۴۔	۲۸۰	۸۵۔
۲۸۰	۸۵۔	۲۸۱	۸۶۔
۲۸۱	۸۶۔	۲۸۲	۸۷۔
۲۸۲	۸۷۔	۲۸۳	۸۸۔
۲۸۳	۸۸۔	۲۸۴	۸۹۔
۲۸۴	۸۹۔	۲۸۵	۹۰۔
۲۸۵	۹۰۔	۲۸۶	۹۱۔
۲۸۶	۹۱۔	۲۸۷	۹۲۔
۲۸۷	۹۲۔	۲۸۸	۹۳۔
۲۸۸	۹۳۔	۲۸۹	۹۴۔
۲۸۹	۹۴۔	۲۹۰	۹۵۔
۲۹۰	۹۵۔	۲۹۱	۹۶۔
۲۹۱	۹۶۔	۲۹۲	۹۷۔
۲۹۲	۹۷۔	۲۹۳	۹۸۔
۲۹۳	۹۸۔	۲۹۴	۹۹۔
۲۹۴	۹۹۔	۲۹۵	۱۰۰۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۲۹	کی جگہ ملکیت کی آمریت نے لے لی۔ ۳۱۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کا مفہوم۔	۲۲۳	تیز نہیں۔ ۲۵۔ خدا کا ارادہ کس طرح بروئے کار آتا ہے داستان بنی اسرائیل سے اس کی وضاحت۔
۲۳۱	قَدَرِیْ مَٹائیں۔	۲۲۴	یہ ارادے انسانی سعی و عمل سے پورے ہوتے ہیں۔
۲۳۲	حضور کی آرزو کہ آپ کی جدِ مجید کے نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں۔	۲۲۴	۲۶۔ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کرتا۔ ۲۷۔ جنین کے معاملہ میں مَا يَشَاءُ کا مفہوم۔
۳۲	بعض اجرامِ فلکی میں آبادی کا اشارہ۔ ان آبادیوں کے آپس میں مل جانے کا امکان۔ انسان کا خلائی سفر۔	۲۲۵	۲۸۔ حضرت زکریا کے ہاں بچے کی پیدائش خدا نے جو وعدہ کئے ہیں، اگر (بفرضِ محال) وہ پورے نہ ہوں تو اس سے بھی پوچھا جاسکے گا کہ آیا کیوں نہیں ہوا!
۲۳۳	۳۳۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ میں استیاء ہی کیوں کہا ہے؟ ایک غور طلب نکتہ۔	۲۲۶	یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ ۲۹۔ لیکن ہمارے دورِ ملکیت میں یہ تصور بالکل بدل گیا۔ اس کی جگہ اس بادشاہ کے تصور نے لے لی جس کے ہاں کوئی قاعدہ قانون مقدر نہ ہو۔
گیارہواں باب — ہدایت و ضلالت		۲۲۷	۳۰۔ خدا کا تصور بدل جانے سے ہمارا اجتماعی نظام بدل گیا۔ اب قانون
۲۳۴	۱۔ جمعہ، عیدین، نکاح وغیرہ کے خطبات میں یہ الفاظ کہ جسے خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔	۲۲۸	
۲۳۷	۲۔ اس کے مروجہ مفہوم کی رُخسے سلسلہ رُشد و ہدایت بے معنی ہو جاتا ہے۔		
۲۳۸	۳۔ چشمہ ہدایت خدا ہی ہے۔		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۳۶	جو اندھی تقلید کرتے جائیں	۲۳۹	۴۔ یہ ہدایت رسولوں کی وساطت سے انسانوں تک پہنچائی جاتی تھی۔
۲۳۹	۱۳۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کا مفہوم۔	۲۴۰	۵۔ نبوت، خدا جسے چاہتا تھا دیتا تھا۔ اس میں انسان کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔
۲۵۰	کن لوگوں کے دلوں پر مہریں لگتی ہیں۔	۲۴۱	۶۔ نبی اس ہدایت کو دوسرے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔
۲۵۵	۱۳۔ ”خدا کی بات پوری ہو گئی“ کا مفہوم۔	..	یوں خدا کی ہدایت انسانوں تک پہنچتی تھی۔
۲۵۶	۱۴۔ انہیں جہنم کے لئے پیدا کیا ہے، کا مفہوم۔	..	۷۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جسے خدا کی ہدایت ملے وہی ہدایت پر ہوگا۔
۲۵۷	یہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے ہیں۔	..	۸۔ لیکن کتاب اللہ سے اخذ ہدایت انسانوں کے اپنے اختیار پر ہے۔
۲۵۷	۱۵۔ ان کے دل خود اپنے تالے اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں۔	۲۴۲	۹۔ ہدایت کون لوگ حاصل کر سکتے ہیں۔
..	اپنے اعمال ہی زنگ بن جاتے ہیں۔	۲۴۳	۱۰۔ هٰذِهِ لِّلْمُتَّقِينَ۔ اس پر اعتراض کہ جو لوگ پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔
۲۵۸	۱۶۔ جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے انکار کر دے	..	اس کا جواب
۲۶۱	۱۷۔ اس سلسلہ میں مَنْ يَشَاءْ کا صحیح مفہوم۔	۲۴۵	۱۱۔ کون لوگ ہدایت حاصل نہیں کر سکتے جو آنکھیں بند کر کے چلیں۔
۲۶۵	۱۸۔ نگہ باز گشت۔	۲۴۶	جو اپنے جذبات کو معبود بنالیں
۲۶۶	۱۹۔ خدا کا ایک نام اَلْمُضِلُّ لیا جاتا ہے۔		
..	ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ خدا الہادِی		
..	(ہدایت دینے والا) ہے۔ المضل		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۷۷	۹۔ رزق کی طلب و تلاش ضروری ہے۔	۲۷۶	۱۔ مگر وہ کرنے والا نہیں۔
۲۷۸	۱۰۔ یہ قوانین فطرت کے اتباع سے ہوتا ہے اور اس میں کافر و مؤمن کی کوئی تخصیص نہیں۔		۲۔ نہ ہی اسے المذل یا المضار کہنا چاہیئے۔
۲۷۹	۱۱۔ قوانین خداوندی سے اعراض برتنے کا نتیجہ رزق کی تنگی ہوتا ہے۔		بارہواں باب — رزق خدا ہاتھ میں ہے
۲۸۰	۱۲۔ بھوک خدا کا عذاب ہے۔	۲۷۷	۱۔ سب سے زیادہ تباہ کن عقیدہ کہ امیری اور غریبی سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔
۲۸۱	۱۳۔ مومنین کو عزت کی روٹی ملتی ہے۔		۲۔ غریبی اور مفلسی کی شان میں قصیدہ۔
	۱۴۔ دھائے ابراہیمی۔	۲۷۸	۳۔ سامان رزق خدا نے جہاں کر رکھا ہے۔
	۱۵۔ تقسیم رزق کا نظام۔ (معاشی نظام)		۴۔ اس اعتبار سے وہ رازق ہے۔ اسے حاصل اپنی سعی و کادوش سے کیا جائے گا۔
	۱۶۔ ایک شخص محنت کے باوجود محتاج رہتا ہے۔ دوسرا بلا محنت کے عیش اڑاتا ہے۔ یہ کیوں؟		۵۔ اس کے بعد رزق کی تقسیم کا سوال سامنے آتا ہے۔ یہیں سے ساری پیچیدگیاں شروع ہوتی ہیں۔
	۱۷۔ برہمن نے کہا کہ — یہ سابقہ جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے۔	۲۷۹	۶۔ وَاللّٰهُ يَزِدُّكُمْ كُمْ كَافٍ مَّفْهُوم
	۱۸۔ اور داعظ نے کہا کہ — یہ قسمت کا لکھا ہے۔	۲۸۰	۷۔ رزق کی پیدائش کا فطری نظام
	۱۹۔ قرآن نے کہا کہ یہ سب غلط ہے۔	۲۸۱	۸۔ رزق ملنے کی شرائط — قوانین فطرت کا اتباع۔
۲۸۲	۲۰۔ یہ تمہارے غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہے۔		۹۔ سکتہ کی ایجاد سے پیچیدگیاں۔
۲۸۳	۲۱۔ قرآن کے معاشی نظام کے اصول مبانی		۱۰۔ اب رزق کے مفہوم میں دولت بھی شامل ہو گئی۔
۲۸۴	۲۲۔ خدا خیر الرازقین ہے۔	۲۸۲	

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	اس کا مفہوم۔	۲۸۶	۱۸۔ یَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ
۲۹۔	زاید از ضرورت آمدنی، دوسروں کا		کا مفہوم۔
	حق ہے۔		۱۹۔ قرآنی معاشرہ کی بنیاد انفاق پر ہوتی ہے۔
۳۰۔	سوسائٹی میں معیارِ تکریم دولت نہیں،	۲۹۰	— انفاق کا قرآنی مفہوم۔
	سیرت و کردار ہوگا۔	۲۹۱	۲۰۔ ”رِزْقِ بَغَيْرِ حِسَابٍ“ کے متعلق ہمارا
۳۱۔	غلط معاشرہ میں غلط دلائل۔		اپنا تجربہ۔
			۲۱۔ صدرِ اول کے مومنین۔
۳۰۲	تیرھواں باب	۲۹۳	۲۲۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ
	تَعَزَّوْا مِنْ نَفْسَاءُ وَتُنَالُ مَنْ تَشَاءُ		فِي الرِّزْقِ کا مفہوم۔
۳۰۲	۱۔ لفظ عزت کے معنی غلبہ اور قوت ہوتے	۲۹۵	یہ انسان کی اپنی سعی و عمل کا نتیجہ
	ہیں۔ اور دولت کے معنی کمزوری اور ناتوانی		ہوتا ہے۔
۳۰۳	۲۔ حکومت و اقتدار حاصل ہونے کی شرائط۔	۲۹۶	۲۳۔ نَحْنُ قَسَمْنَا کا مفہوم۔
	۳۔ حکومت صالحین کو ملتی ہے۔	۲۹۷	۲۴۔ اکتسابِ رزق کے دو بنیادی عوامل۔
۳۰۴	صالحین سے کون لوگ مراد ہیں		(۱) جو کچھ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔
۳۰۵	۴۔ طبیعی اسباب و ذرائع اور انسانی صلاحیتیں		اور
	۵۔ داستانِ بنی اسرائیل (مثال کے طور پر)		(۲) انسانی سعی و کوشش۔
۳۰۶	۶۔ قصہ حضرت طاہوت۔ فوجی کمان کے		۲۵۔ افراد میں صلاحیتوں کا فرق۔
	لئے جسمانی قوت اور فنونِ حرب کا علم		اس کے وجہ و اسباب
	ضروری ہے۔	۲۹۸	۲۶۔ اس سے جو نقصان ہوتا ہے اس کا
	اسے مَنْ يَشَاءُ کہا گیا۔		ذمہ دار غلط معاشرہ ہے۔
۳۰۸	۷۔ اس طرح خدائی پروگرام کی تکمیل انسانوں		۲۷۔ قرآنی معاشرہ میں ایسا نہیں ہوتا۔
	کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔		۲۸۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ کی پوری آیت اور

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۲۰	چودھواں باب يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ	۳۰۸	۸۔ عزت و ذلت کے لئے قانونِ خداوندی
۳۲۱	۱۔ عذاب و مغفرت کے معنی	۳۰۹	۹۔ یہ ایک اجتماعی عمل ہے۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کے ساتھ رہنا ہوگا۔
۳۲۲	۲۔ عذاب، غلط اعمال کے نقصان رساں نتیجہ کا نام ہے۔	۳۱۰	۱۰۔ حسنا سے عزت، سیئات سے ذلت۔
۳۲۳	۳۔ مَن يَشَاءُ کا مطلب	۳۱۱	۱۱۔ عزت بمعنی تحریم کے لئے اصول۔
۳۲۴	۴۔ مغفرت کی دو شکلیں۔		سیرت و کردار کی بندی۔
	(۱) نقصان سے شروع ہی سے محفوظ رہنا۔	۳۱۲	۱۲۔ غلط معیارِ تحریم اور اس کا مال۔
	(۲) نقصان کے بعد اس کا ازالہ ہو جانا۔ اسے توبہ کہتے ہیں۔		عذابِ جہنم۔
۳۲۵	۵۔ توبہ کا مفہوم۔	۳۱۳	۱۳۔ عزت الاثم۔
۳۲۶	۶۔ حسنا سے سیئات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔	۳۱۴	۱۴۔ مدارج کا تعین اعمال کے مطابق۔
۳۲۷	۷۔ خدا کی کوئی چاہیبتی اولاد نہیں۔ اس کا قانونِ مکافات سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔	۳۱۵	۱۵۔ تائب و نصرتِ ایزدی۔
۳۲۸	۸۔ سزا اور جزا کے سلسلہ میں ایک بنیادی حقیقت۔		۱۶۔ نصرت کے معانی۔ قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کے نتائج۔
۳۲۹	۹۔ مجرم کے احوال و کوائف کی نسبت سے سزا۔	۳۱۶	۱۷۔ خدا اس کی مدد کرتا ہے جو خدا کی مدد کرتے ہیں۔
۳۳۰	۱۰۔ اجتماعی سزا۔ فرد معاشرہ کے ہاتھوں	۳۱۷	۱۸۔ خدا کی مدد نصرت اسے ثبات و استقامت حاصل ہوتی ہے۔
		۳۱۸	۱۹۔ نصرت کے لئے تلوار کی ضرورت۔
		۳۱۹	۲۰۔ میدانِ جنگ میں نصرت۔
			ملائکہ کے ذریعے مدد
		۳۲۰	۲۱۔ اس کے لئے مومن ہونا شرط ہے۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۵۹	سترھواں باب — دُعا		ارسطو کے نزدیک حقیر تر مخلوق۔ دیگر مفکرین مغرب کے نزدیک۔
	۱۔ جذبہ دُعا کی عالمگیریت اور ہمہ گیریت۔	۳۴۶	۵۔ قرآن مجید کا انقلاب آفسی اعلان۔
	۲۔ راستہ کی دشوار گزاری۔	۳۴۷	عورت اور مرد، ہمدش اور یکساں
۳۶۱	۳۔ دُعا کا عام مفہوم۔		حیثیت کے مالک ہیں۔
۳۶۲	۴۔ دُعا کا قرآنی مفہوم — اطاعت کرنا۔	۳۴۸	حقوق اور ذمہ داریوں میں یکساںیت
۳۶۴	۵۔ دُعا کا عام مفہوم — خدا سے کچھ مانگنا۔	۳۴۹	۶۔ ازدواجی زندگی کا مقصد — رفاقت،
۳۶۵	۶۔ اس مفہوم سے پیدا ہونے والے شکوک		سکون، مودت، رحمت۔
	اعتراضات۔		ایسا تعلق تو مساوات کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے
۳۶۶	۷۔ خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا		پھر کیا ہوا؟ قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا
	ہے۔ اس عقیدہ کا نتیجہ۔		اور غیر مذاہب کے عقائد و تصورات اسلام
	۸۔ یہ عقیدہ ہمارے دور ملکیت کا وضع کردہ		کا جزو بن گئے۔
	ہے۔		۸۔ وضعی روایات۔
۳۶۷	اَلْاِسْلَامُ ظِلُّ اللّٰهِ عَلٰی الْاَوَّامِضِ	۳۵۰	۹۔ اَلْبِرِّ جَالُ قُوَّةٍ اُمُوْنَ عَلٰی الْاِنْسَاءِ کی تفسیر
	کافطری نتیجہ۔	۳۵۱	۱۰۔ حضرت علیؑ کی طرف منسوب کردہ روایات۔
	دربار شاہی کا نقشہ۔ امراء و وزراء کا توسط۔	۳۵۲	۱۱۔ عورت کے متعلق عام خیالات۔
۳۶۸	۹۔ زندہ انسان، ہمارے جیسے۔ اور	۳۵۳	۱۲۔ ہمارے ”مہذب“ معاشرہ میں عورت
	مردگان بے خبر۔		کی حالت۔
۳۶۹	۱۰۔ دعائیں قبول کس کی ہوتی ہیں اور کس	۳۵۵	۱۳۔ نظام فطرت کی غلط مثال۔
	طرح ہوتی ہیں۔	۳۵۶	۱۴۔ لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش۔
۳۷۱	۱۱۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت۔		۱۵۔ عصر حاضر کی
۳۷۲	۱۲۔ لبِ دریا پیاسا۔ یعنی تدابیر اختیار نہ		ریسز کا مریخ۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۸۱	۲۰۔ اپنی آرزوؤں کو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھنا۔	۳۷۳	۱۳۔ مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں۔
۳۸۲	۲۱۔ اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھنے کا نام ذکرِ خداوندی ہے۔		مکہ کے ستم زدگان کی دعا پر مدینہ کی اسلامی مملکت سے کہا کہ تم ان کی مدد کے لئے اٹھو۔
	۲۲۔ اس سے بڑی تقویت بخش نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس سے فضا تو نہیں بدلتی انسان خود بدل جاتا ہے۔	۳۷۴	۱۴۔ مظلوموں کی دعائیں اسلامی نظامِ سنتا ہے۔
۳۸۴	۲۳۔ ایک دوسرے کے لئے دعائیں۔ موجب تسکین و طمانیت۔	۳۷۵	۱۵۔ دعائیں کرنے کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟ جب کوئی کام قاعدے قانون کے مطابق نہ ہو۔ ایسا غلط معاشرہ میں ہوتا ہے۔
۳۸۵	۲۴۔ حضراتِ انبیاء کرام کی انفرادی دعائیں	۳۷۶	۱۶۔ صحیح معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوتا اس لئے خدا سے اس قسم کی دعائیں نہیں مانگنی پڑتیں۔
۳۸۶	۲۵۔ کہایہ جاتا ہے کہ دُعا رحمت ہے اور رحمت سے یا اوسے کُفر ہے۔		۱۷۔ حضرت عمرؓ کا نہایت بلند ارشاد۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لئے کیا گیا ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک نہ پہنچنے دوں۔
۳۸۷	۲۶۔ رحمت سے کیا مراد ہے؟		۱۸۔ مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں۔
۳۹۰	۲۷۔ دُعا، زندگی کے دورِ اب سے پر قانونِ خداوندی کو آواز دینے کا نام ہے۔	۳۷۷	۱۹۔ دُعا سے ہوتا کیا ہے؟ انسان میں نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔
اٹھارواں اور آخری باب۔ نیک بزرگشت			
۳۹۱	۱۔ تخلیق کے مختلف منازل —	۳۷۸	۱۸۔ مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں۔
	جمادات، نباتات و حیوان۔ سب مجبور۔	۳۷۹	۱۹۔ دُعا سے ہوتا کیا ہے؟ انسان میں نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔
۳۹۲	۲۔ منزلِ انسانیت۔ صاحب اختیار و ارادہ۔ اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں۔		
۳۹۴	۴۔ کائنات مسخر کر دی گئی۔		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	۹۔ اس کشمکش سے نجات کا طریق — قرآن کریم کو اپنے عقائد کا معیار بنائیے۔	۳۹۵	یہ مقام آدم ہے۔ مقام مومن اس سے بہت بلند ہے۔
۴۰۲	۱۰۔ ایک اعتراض — اس طرح خدا کے قادر مطلق ہونے پر حروف آتا ہے۔	۳۹۶	۵۔ جماعت مومنین سے انتقام۔ تقدیر کا عقیدہ عام کر دیا گیا۔
۴۰۳	۱۱۔ حکم اور قانون میں فرق۔ مذہب میں حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ دین میں قوانین کی اطاعت۔ اسی کو "تقدیر" کہتے ہیں۔ انڈکس آیات۔	۳۹۷	۶۔ تصوف کی تباہ کاریاں۔ ۷۔ ہماری دو عملی — تقدیر کے ساتھ تدبیر بھی۔ یعنی جمع بین النقیضین۔
۴۰۴		۴۰۰	۸۔ اس کشمکش پیہم کا نتیجہ — مذہب بے یقینی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

دنیا سے مذہب ہو یا جہانِ فلسفہ، آپ کسی سے پوچھئے کہ ان کے ہاں سب سے مشکل، پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ کونسا ہے تو ان کا ایک ہی جواب ہوگا۔ مسئلہ تقدیر۔ دیکھئے تو اس مسئلہ پر اتنا لٹریچر ملے گا جس سے انبار کے انبار لگ جائیں اور اسے پڑھئے تو نہ صرف یہ کہ بات کچھ پتلے نہ پڑے، بلکہ آپ کا ذہن مزید شکوک و شبہات کی آماجگاہ اور آپ کا دل پہلے سے بھی زیادہ ہیچ و تاب کا گرداب بن جائے۔ جب میرے سلسلہ معارف القرآن کی آخری کڑی جہانِ فردا شائع ہو گئی، اور لغات القرآن اور مفہوم القرآن جیسی ضخیم اور بسیط تصانیف پہلے مکمل ہو چکی تھیں، تو میں نے سمجھا کہ فکرِ قرآنی کی نشو و اشاعت کا جو مقدس مشن میں نے اپنے سامنے رکھا تھا، بحمدِ ۴۱ اس کی اس حد تک تکمیل ہو گئی ہے، اور میری زندگی کا بقایا عرصہ تبویب القرآن کی ترتیب و تدوین کے لئے وقف رہے گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ قارئین کی طرف سے قرآنی نکات کی مزید وضاحت کے لئے جو استفسارات موصول ہو رہے ہیں، ان کا قریب نوے فی صد حصہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ، مسئلہ تقدیر سے متعلق ہے۔ یہ سوالات، بلکہ یوں کہئے کہ اعتراضات، بیشتر نوجوان طبقہ کی طرف سے موصول ہوئے۔ ان کا ملخص یہ تھا کہ جو مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہو کہ انسان کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے، نہ وہ مٹ سکتا ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کچھ ہو سکتا اس مذہب کو لے کر ہم مصافِ زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کیا کر سکتے ہیں؟ اور جس طبقہ نے قرآنِ کریم کا مطالعہ شروع کر دیا تھا ان کا اعتراض یہ تھا کہ ہمیں تو اس میں قدم قدم پر تضادات ملتے ہیں۔ کہیں وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے ہدایت حاصل کر لے، جس کا جی چاہے گمراہ ہو جائے اور کہیں کہتا ہے کہ ہدایت اور

گمراہی سب خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اس قسم کے سوالات اور اعتراضات کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اس مسئلہ کے متعلق میں نے مختلف مقامات پر جو کچھ جستہ جستہ لکھا ہے، وہ اس گنتی کو سلجھانے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک الگ مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اگر اس گنتی کو نہ سلجھایا گیا تو میں نے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرآن کی طرف لانے کی جو کوشش کی ہے وہ سب بیکار ہو جائے گی اور یہ دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ زیر نظر کتاب کی تسوید کا جذبہ محرکہ اسی احساس کی شدت تھی جس کا نتیجہ قارئین کے سامنے ہے۔

دیگر اہم مسائل حیات اور حقائق کائنات کی طرح، قرآن کریم نے اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی، اپنی معجزانہ سلاسل و بلاغت سے، واضح انداز میں اس طرح حل کر کے رکھ دیا ہے کہ اگر اسے صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس باب میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے لئے قرآن مجید میں گہرے غور و تدبر کی ضرورت ہے اور قرآن فہمی کے سلسلہ میں حسب ذیل امور کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) عام انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب بالعموم ایک موضوع پر مشتمل ہوتی ہے اور مختلف ابواب میں منقسم۔ ان میں سے ہر باب، کتاب کے موضوع کے کسی ایک نکتہ کو واضح کرتا ہے اور خود مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا باب، پھر تیسرا، حتیٰ کہ جب ہم آخری باب پر پہنچتے ہیں تو کتاب کا پورا موضوع مربوط شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔

قرآن کریم کا انداز اس سے مختلف ہے۔ وہ کسی ایک موضوع پر مشتمل کتاب نہیں بلکہ زندگی کے اہم ترین مسائل اور کائنات کے عمیق ترین حقائق کا مجموعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مختصر سی کتاب کو ایسے کثیر اور متنوع مسائل و حقائق کا محیمن بننا ہو، تو اس میں ان امور پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جہاں تک انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی کا تعلق ہے، اس میں، اسے تو بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، لیکن حقائق کائنات اور غوامض حیات کے متعلق اشارات سے کام لیا گیا ہے اور ان کی تفصیلات تک پہنچنا، انسانی علم و بصیرت اور فکر و تدبر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نیز، اس میں ایک مسئلہ سے متعلق، ایک ہی مقام پر پوری بحث نہیں کی جاتی۔ اس کا انداز یہ ہے کہ ایک بات بنیادی طور پر ایک جگہ مذکور ہے۔ اس کی مزید وضاحت کسی دوسری جگہ کی گئی ہے، اضافہ کہیں اور آیا ہے۔ استثناء کا ذکر کسی اور مقام پر ہے۔ اس انداز بیان کو قرآن ”تصریف آیات“ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانے سے، ایک بات کی وضاحت کرنا۔

ایک ایسی کتاب کے لئے جسے تمام نوری انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات قرار پانا تھا، یہی انداز بیان کس طرح نہایت مناسب اور بہترین تھا، اس کی وضاحت کا یہ موقعہ نہیں۔ اس وقت صرف اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآن فہمی کا طریقہ یہ ہے کہ جو مسئلہ آپ کے زیر نظر ہو، اس کے متعلق قرآن کریم نے جہاں جہاں، اور جو کچھ کہا ہے، وہ سب، بیک وقت آپ کے سامنے ہونا چاہیئے۔ اس طرح آپ اس مسئلہ کو قرآنی روشنی میں صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔ آیات کو الگ الگ پڑھنے سے قرآن کا مقصود و مطلوب کما حقہ سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ میں نے قرآن کریم کو اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ایک عمر کی محنت شاقہ کے بعد لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو اسی طریق سے مرتب کیا ہے۔ مسئلہ تقدیر کے متعلق بھی میں نے قرآن کریم سے جو کچھ سمجھا ہے اسی طریق سے سمجھا ہے اور زیر نظر کتاب میں، اسے اسی طریق سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) قرآن کریم کے مطالب تک پہنچنے کے راستے میں، دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ ہم اسے (بالعموم) تراجم کی رو سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دعوے آپ کو تعجب انگیز سا نظر آئے گا لیکن یہ ہے یہ مبنی بر حقیقت — قرآنی الفاظ کے مرادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے — میں نے اس حقیقت کو، مفہوم القرآن کے تعارف میں بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ جو اجاب اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہوں وہ اس کا مطالعہ کریں۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ مسلم اور غیر مسلم ارباب علم و بصیرت نے کس طرح اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کا ترجمہ ممکن نہیں۔ قرآنی الفاظ کا مفہوم سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے، ان کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہی وہ بنیادی حقیقت تھی جس کے پیش نظر میں نے مفہوم القرآن مرتب کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس کسی نے اسے پڑھا، بہ طیب خاطر اس امر کا اعتراف و اظہار کیا کہ اس سے قرآن کریم سمجھ میں آنے لگ گیا ہے۔

آئندہ صفحات میں آپ آیات قرآنی کے سلسلہ میں یہ بکھا پائیں گے کہ اس آیت کا مروجہ ترجمہ یہ ہے لیکن اس کا مفہوم یہ۔ اس سے میرا یہ مقصود نہیں کہ آیت کا وہ ”ترجمہ غلط ہے“ جب آیات قرآنی کا ترجمہ ممکن ہی نہیں تو اس کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۱۶/۹۳)۔ اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے — ”اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے جسے

چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ آپ قرآن مجید کے کسی نسخہ کو اٹھائیے اس میں آپ کو بھی ترجمہ ملے گا۔ حتیٰ کہ آپ عربی زبان کے لغت کی رو سے بھی دیکھیں گے تو ان الفاظ کا یہی ترجمہ کیا جائے گا۔ لیکن جب ہم اس ”تصریف آیات“ کی رو سے (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اس آیت کو دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ جو مفہوم اس ترجمہ کی رو سے متعین ہوتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ لہذا جب تک ہم قرآن مجید کے مختلف مقامات کی روشنی میں (مَنْ يَشَاءُ) کا مفہوم متعین نہیں کریں گے، اس آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں نے لغات القرآن میں قرآنی الفاظ کا مفہوم عربی زبان کی مستند کتب لغت اور قرآنی آیات کی روشنی میں اسی طرح مرتب کیا ہے اور پھر اسی انداز سے پورے قرآن مجید کا مفہوم متعین کر کے اسے مفہوم القرآن میں شائع کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں آیات کے تراجم اور ان کے مفہوم کا فرق اسی منہج سے سامنے لایا گیا ہے۔

(۳) قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید نے اپنے من جانب اللہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی دیا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہیں تضاد نہیں (۴/۸۲)۔ اس دعوے کی روشنی میں قرآن کریم کی کسی آیت کا ایسا مفہوم صحیح نہیں قرار پاسکے گا جو اس کی کسی دوسری آیت کے خلاف ہو۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ جب قرآن کریم کی کوئی ایک آیت آپ کے سامنے آئے تو آپ دیکھیں کہ اس کا جو مفہوم آپ لے رہے ہیں وہ قرآن مجید کے کسی دوسرے مقام سے متضاد تو نہیں میں نے قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرنے میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اس طرح بتایا ہے کہ قرآن مجید میں کہیں کسی جگہ کوئی اختلاف نہیں کوئی تضاد نہیں جہاں ہیں کوئی اختلاف نظر آتا ہے وہ ہماری کوتاہی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ مزید غور و فکر اور تفحص و تجسس سے وہ اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔

(۴) قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ آپ پہلے سے قائم شدہ اعتقادات اور تصورات کو اپنے قلب و دماغ سے الگ کر کے قرآن کریم کی طرف آئیں۔ اگر آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی عقیدہ یا نظریہ راسخ ہو گا تو آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن سے اس عقیدہ یا نظریہ کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح قرآن کریم کے صحیح مطالب آپ کی سمجھ میں نہیں آسکیں گے۔ اُس نے اَللّٰہ سے پہلے جو اَللّٰہ کی شرط عائد کی ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ ”خدا تک پہنچنے“ کی شرط اولیں یہ ہے

کہ آپ اپنے قلب و دماغ کو ہر غیر خداوندی تصور سے پاک اور صاف کر لیں۔ جب تک حرم کعبہ سے انسانوں کے خود تراشیدہ معبودوں کو نکالا نہیں جاتا، اس میں خدا کو نہیں بسایا جاسکتا۔ یہ منزل ہوتی ہے بڑی کٹھن، لیکن قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔

آئندہ صفحات میں آپ یہ بھی لکھا دیکھیں گے کہ ”دین“ جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو.....“ دین اور مذہب کی اس تفریق کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ جو نظام حیات، خدا کی طرف سے، بذریعہ وحی، حضرت انبیاء کرام کو ملتا تھا، اسے اللہ تعالیٰ کہا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب اس دین میں انسانی تحریفات راہ پائیں تو وہ دین نہیں رہتا، مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب ہوتا تو ہے انسانوں کا خود ساختہ لیکن اسے منسوب کیا جاتا ہے خدا کی طرف۔ مذہبی پیشوائیت اس طرح عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی، اور خدا کے نام پر ان کے دل و دماغ پر اپنا تسلط قائم رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص مذہب کے کسی عقیدہ یا مسلک کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو مذہبی پیشوا یہ کہہ کر عوام کو مشتعل کر دیتے ہیں کہ یہ تمہارے دین کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتا ہے، وہ تمہارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔ اس طرح اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے عائد کر کے لوگوں کو اس کی طرف سے برگشتہ کر دیتے ہیں تاکہ کوئی اس کی آواز پر کان نہ دھرے۔ یوں بھی معتقدات (خواہ وہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں) انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں جنہیں وہ آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔

اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جو دین، خدا نے بوساطت نبی اکرمؐ، عطا کیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد اس میں انسانی خیالات کی آمیزش شروع ہو گئی اور اس طرح وہ رفتہ رفتہ مذہب کی سطح پر آ گیا۔ اب وہی مذہب ہم میں مروج ہے لیکن ہم میں اور دیگر اہل مذاہب میں ایک بنیادی فرق ہے اور یہی فرق ہے جس سے ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ اس مذہب کو پھر سے دین خداوندی میں تبدیل کر لیا جائے۔ وہ فرق یہ ہے کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب — جس میں دین اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے، بلا تحریف موجود ہے۔ یہ خصوصیت دنیائے کسی اور مذہب کو حاصل نہیں۔ اس وقت آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں، قرآن کے سوا کوئی نہیں۔ لہذا، اگر ہم چاہیں کہ اپنے مروجہ مذہب کو پھر سے دین خداوندی میں بدل لیں، تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہو گا کہ اپنے مروجہ عقائد و مسالک کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھیں۔ جو اس کے

مطابق ہوں انہیں باقی رکھا جائے۔ جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر کے ان کی جگہ صحیح قرآنی عقائد اختیار کر لئے جائیں۔ میری کوششوں کا منہ ہی یہی ہے کہ خدا کا عطا کردہ دین، پھر سے قوم کے سامنے لایا جائے۔ زیر نظر تصنیف بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اور میرے نزدیک بڑی اہم کڑی کیونکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہماری تباہیوں کے اسباب میں ایک بنیادی سبب تقدیر کا غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ اس غارت گرد دین و دانش عقیدہ نے اس سراپا اعلیٰ و حرکت قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ قارئین سے میری گزارش ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے اپنی گہری توجہ کا مرکز بنائیں اس لئے کہ تقدیر کا مروجہ عقیدہ ہمارے ہاں صدیوں سے متواتر چلا آ رہا ہے اور ہمارا اجزوا ایمان بن چکا ہے۔ اسے قرآنی تصور سے بدلنے کے لئے بڑے گہرے غور و تدبیر ہی کی نہیں بلکہ گہرا صبر و سکون اور کوہ تمثال ثبات و استقامت کی بھی ضرورت ہوگی۔

میں نے اس کتاب کو ان حضرات کے لئے لکھا ہے جو مسئلہ تقدیر کو قرآن کریم سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس میں نہ فلسفیانہ مباحث کو چھیڑا ہے نہ متکلمین کی موشگافیوں سے بحث کی ہے اس پیچیدہ ترین مسئلہ کو قرآن مجید کی روشنی میں، سیدھے سادے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نیز میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ اس کا اسلوب تحریر بھی زیادہ سے زیادہ عام فہم رہے۔ اگرچہ ایک اہل قلم کے لئے اپنا اسلوب نگارش بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے، بالخصوص عمر کے آخری حصہ میں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کر سکیں گے۔

آیات کے حوالوں کے لئے، اوپر سورۃ کا نمبر اور نیچے آیت کا نمبر دیا گیا ہے۔ مثلاً (۳/۱۵) سے مراد ہے سورۃ آل عمران کی پندرھویں آیت۔ جہاں آیت درج نہیں کی گئی بلکہ اس کا صرف حوالہ دیا گیا ہے، آپ قرآن مجید کے کسی نسخے سے آیت خود نکال کر دیکھ لیں۔ چونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں ایک آدھ کا فرق ہوتا ہے اس لئے آپ حوالے کے لئے ایک دو آیات پیچھے یا آگے دیکھ لیں گے تو مطلوبہ آیت مل جائے گی۔

آخر میں اس امر کا اعتراف و اظہار ضروری سمجھتا ہوں (جیسا کہ میں اپنی ہر تصنیف میں ضروری سمجھا کرتا ہوں) کہ جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ فہم قرآن کی ایک انسانی کوشش ہے جس میں بہود خطا کا بہر حال امکان ہے۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ صحیح سمجھا ہے اسے بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہو المراد اور اگر آپ کو اس سے اختلاف ہو تو آپ قرآن کریم پر از خود غور فرمائیے۔ بحث و تہیص سے میں ہمیشہ مجتنب رہا کرتا ہوں۔ اگر میری اس کوشش سے کسی ایک فرد کے دل میں بھی قرآن مجید کی صحیح بات اتر گئی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

دالست
پرویز

۲۵/ بی۔ گل برگ۔ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتاب التقدير

پہلا باب

پس منظر

انسان نے جب کرۂ ارض پر آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو سخت نامساعد ماحول میں گھرے ہوئے پایا۔ چاروں طرف مہیب جنگلات جن میں نہایت خوفناک وحشی اور خونخوار درندے اور دیگر مہیب عظیم الجثہ حیوانات ارد گرد سر بفلک پہاڑ اور ان کی بھیانک چٹانیں، سامنے ناپید کنارہ سمندر اور اس کی دہشت انگیز تلاطم خیزیاں۔ دوسری طرف پُر شور دریا، ندی، نالے اور ان کی تباہ کن طوفان انگیزیاں۔ مسلسل بارشیں، اولے، برفباری اور ان کے ساتھ لرزہ انگیز گرج، چمک اور کڑک۔ ادھر ادھر بیہیت ناک کوہِ آتش فشاں اور ان سے اُبلنے والا آتشیں سیلاب، زیرِ زمین زلزلوں کے عفریت اور بالائے سر بھلیوں کی ناگنیں۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، تباہیوں اور بربادیوں کے یہ بے پناہ سامان اور ان میں گھرا ہوا بے کس، بے بس، ہنستا، کمزور ناتواں، بے سروسامان انسان! اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کچھ کیوں ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے اور اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے قانون سے نا آشنا، اور فطرت کی قوتوں کے مستحضر ہو جانے کے امکان سے ناواقف تھا۔ بنا بریں وہ ہر تباہ کن واقعہ کو ایک حادثہ (ACCIDENT) تصور کرتا اور اس حادثہ کو محض اتفاق (CHANCE)

کا نتیجہ قرار دیتا۔ اس سے آگے اس کا ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جو انسان، حادثات اور اتفاقات کے ایسے خطرناک ہجوم میں گھرا ہوا ہو، اور ان کی مدافعت کا آل کے پاس کوئی سامان اور ذریعہ نہ ہو، تو وہ اپنے آپ کو لامحالہ مجبور تصور کرے گا۔ چنانچہ یہ پہلا تصور تھا جو انسان کا پہلا تصور | اپنے متعلق انسان نے قائم کیا۔ یعنی یہ کہ انسان اس دنیا میں مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے اختیار میں کچھ نہیں۔

مکرور و ناتواں بے کس اور بے بس، بے سہارا اور بے ذریعہ، مجبور و مقهور انسان کے نزدیک، کسی مہیب اور خطرناک قوت سے مدافعت کا طریقہ ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اس قوت کے سامنے جھک جائے، روئے، گڑگڑائے اور اس طرح اس سے رحم کی درخواست کرے۔ اس ابتدائی دور کے انسان نے ان مہیب قوتوں کی تباہی سے بچنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا۔ علی الصبح، افق مشرق سے آتشیں گولہ نمودار ہوا تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آسمان سے بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور رعد کی لڑک، روح فرسا ہوئی تو یہ ان کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ دریا کی کف آلود طغیاں اور دہشت افزا ہویں تو اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ اس نے کبھی شیر کو دیوتا بنایا کبھی سانپ کو۔ کہیں گئی (آگ) دیوی کی پوجا کرنے لگ گیا؛ کہیں اندر (بارش) دیوتا کی پرستش۔ اس طرح زندگی کے متعلق اس نے ایک اور تصور قائم کیا اور وہ یہ کہ خطرات سے حفاظت کے لئے، کسی صاحب قوت ہستی سے رحم کی درخواست کرنا اور اس طرح اس سے مدد کا طالب ہونا چاہیئے۔ ماہرین علم الانسان (ANTHROPOLOGIST) تاریخ انسانیت کے اس دور کو عہد پرستش (GIST - AGE OF WORSHIP) سے تعبیر کرتے ہیں۔

پرستش کا تصور

لیکن ظاہر ہے کہ ذہن انسانی کے اس تصور کا، کائناتی حوادث پر تو کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ انہیں اپنے قاعدے کے مطابق رونما ہونا تھا۔ اور وہ اس طرح رونما ہوتے رہتے تھے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا کہ کسی دیوی دیوتا کی پوجا کے بعد کوئی واقعہ ان پرستاروں کے حسب منشا ظہور پذیر ہو گیا تو وہ ان کے اس عقیدہ کی پختگی کا موجب بن جاتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ مجبور تو اپنے آپ کو سمجھتے ہی تھے، صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے۔

ان میں سے کچھ زیرک لوگوں نے، ان کی اس بے بسی سے فائدہ اٹھایا اور ان سے کہا کہ جس طرح ہم کہتے

ہیں، اس طرح کرو تو دیکھو، یہ دیوی دیوتا کس طرح تمہاری مرادیں پوری نہیں کرتے؟ اس طرح جادو، گنڈے، ٹوٹے، ٹوٹکوں کا وجود عمل میں آیا۔ اس دور کو تاریخ انسانیت میں 'عہدِ سحر' (AGE OF MAGIC)

عہدِ سحر | کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے انسان میں اپنی قوت کے احساس کی کچھ کچھ نمود ہوئی۔ یعنی یہ کہ انسان، فوق الفطرت قوتوں سے اپنی مرضی کے مطابق بھی کچھ کرا سکتا ہے لیکن اس سے بھی ان (متذکرہ بالا) تصورات میں کچھ فرق نہ آیا۔ یعنی یہ کہ انسان دنیا میں مجبور ہے اور خطرات سے حفاظت کے لئے اسے فوق الفطرت قوتوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے جسے یا تو پرستش کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے اور یا جادو کے زور سے۔ یہ اُس انسان کا ذکر ہے جو وحی کی راہ نمائی سے محروم تھا اور کائنات اور خود اپنی ذات کے متعلق، اپنے ذہن سے تصورات قائم کرتا تھا۔ اس قسم کے تصورات کو بعد میں مذہب (RELIGION) کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ یہ تصورات آپ کو دنیا کے ہر مذہب میں ملیں گے، خواہ وہ مذہب قدیم قبل میں مروج ہو اور خواہ مذہب اقوام میں، مذہب کی اصل و اساس ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے۔

وحی کی رو سے عطا شدہ تصورات | اس کے برعکس، فوق الفطرت قوت، کائنات اور انسان کے متعلق کچھ تصورات، وحی کی رو سے عطا

ہوئے۔ ان تصورات کی رو سے:

(۱) یہ کارگہ کائنات نہ یونہی اتفاقی طور پر وجود میں آگیا ہے اور نہ ہی یہ حادثات اور اتفاقات کا ہنگامی مجموعہ ہے۔ اسے ایک حکیم و علیم ہستی نے، ایک متعین پروگرام کے مطابق پیدا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایسے محکم قوانین متعین کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کی ہر شے سرگرم عمل ہے اس خالق کائنات اور واضح قوانین کو اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ قوانین، خارجی کائنات کو بھی محیط ہیں، انسان کی تمدنی زندگی کو بھی اور خود ایک فرد کی اپنی ذات کو بھی۔ یعنی تخلیق خداوندی کا کوئی گوشہ ان قوانین کے دائرے سے باہر نہیں۔

(۲) انسان کے علاوہ، کائنات کی ہر شے، ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کو، ان کی "فطرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے بدلنے کا انھیں اختیار نہیں۔ لہذا، کائنات میں جو واقعہ رونما ہوتا ہے وہ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں اسے

قانونِ علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) کہا جاتا ہے، اور انسانی دنیا میں قانونِ مکافاتِ عمل، جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل (حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا ایک متعین نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اس کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔

(۳) انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ، اشیائے کائنات سے متعلق قوانین کا علم حاصل کر سکے۔ جب وہ ان قوانین کا علم حاصل کر لے گا جن کے مطابق فطرت کی قوتیں سرگرم عمل ہیں، تو وہ ان قوتوں کو مسخر کر سکے گا، اس بنا پر، کائنات میں، انسان مجبور و مجہول نہیں، اشیائے کائنات مجبور ہیں۔ اسے اشیائے کائنات سے ڈسنے کی ضرورت نہیں، اشیائے کائنات کو اس سے ”خوف کھانے“ کی ضرورت ہے۔ اشیائے کائنات اس کی خادم اور ساجد ہیں، اور یہ اشیائے کائنات کا مخدوم و مسجود۔

انسان قوانینِ فطرت کا علم، مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں، علومِ سائنس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کی اپنی زندگی سے متعلق قوانین کا علم (یعنی اس کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے متعلق قوانین نہیں بلکہ اس کی انسانی زندگی سے متعلق قوانین کا علم) اسے بذریعہ وحی عطا کیا گیا ہے، جوابِ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ یہ قوانین بھی فطرت کی طرح غیر متبدل اور محکم ہیں۔

(۴) انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق یہ ہے کہ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں جو ان سے متعلق ہیں لیکن انسان اس باب میں مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اپنی زندگی ان قوانین کے مطابق بسر کرے اور جی چاہے اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لے۔

اس حد تک تو انسان صاحب اختیار ہے (کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے یا ان کے خلاف

چلے) لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنی روش کا نتیجہ بھی اپنی مرضی کے مطابق برآمد کر لے۔ اس کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوگا۔ بالفاظِ دیگر،

اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو سنکھیا کی ڈلی نکل جائے اور چاہے مصری کی، لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ نکل تو جائے سنکھیا کی ڈلی اور اس کے نتائج پیدا کر لے مصری کی ڈلی کے سے۔ نتیجہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوگا جسے بدلنے کا انسان کو اختیار نہیں۔ اس قانون کا حیطہ اقتدار، انسان کے موجودہ اور اس کے مرنے کے بعد کی زندگی پر یکساں حاوی ہے۔

خدا وہ قادرِ مطلق ہستی ہے جس نے اپنے پروگرام کے مطابق، ان قوانین کو مقرر کیا اور اب ان پر اسکا ایسا کنٹرول ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ ان کے مطابق مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ قانون تو محض ایک فارمولے کا نام ہوتا ہے۔ — یعنی اگر ایسا کرو گے! تو ایسا ہوگا۔ اس فارمولے کے اندر از خود کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جس سے نتیجہ اس کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ یہ قوت، اس فارمولے یا قانون کے خالق کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کسی قانون کے زندہ حقیقت بننے اور رہنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پس پشت جو قوت کار فرما ہے وہ ہمیشہ زندہ اور پایندہ رہے۔ یعنی وہ جی و قیوم ہو۔

یہ تصورات جس نظامِ حیات کی اصل و اساس قرار پاتے ہیں، اسے **الٹین** کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ دین، مذہب کی ضد ہے اور اس کے خلاف **دین اور مذہب کا فرق** چیلنج۔ قرآنِ کریم نے ان تصورات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گی۔ انہی تفصیل سے وہ مسئلہ تقدیر سلجھ اور نکھر کر سامنے آجائے گا جسے مذہب کی دنیا نے اس قدر پیچیدہ اور لائیکل بنا رکھا ہے۔

خدا کا تصور

خُدا، اس وقت بھی خدا تھا جب یہ کائنات ظہور میں آئی تھی اور اُس وقت بھی خدا رہے گا جب یہ سلسلہ باقی نہیں رہے گا۔ لہذا، ”خدا کی دنیا“ اس کی تخلیق کردہ کائنات ہی نہیں، اس سے ماورا اور بھی ہے۔ قرآن کریم نے اسی جہت سے ”خدا کی دو دنیاؤں“ کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام ہے عالمِ امر، جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماورا ہے، اور دوسرا ہے عالمِ خلق، جو خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (۷۵/۷۷)۔ آگاہ رہو کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر دونوں خدا کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق عالمِ خلق سے ہوگا، عالمِ امر سے نہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں نہ کوئی معلول (EFFECT) بغیر علت (CAUSE) کے وجود میں آسکتا ہے اور نہ کوئی شے، کسی پہلے سے موجود مسالہ (MATERIAL) کے بغیر وجود پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے لیکن اس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے، عالمِ امر سے نہیں۔ خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ یعنی اس نے اسے، کسی پہلے سے موجود مسالہ کے بغیر پیدا کر دیا۔ اس کا یہ فیصلہ کہ ایسی کائنات ظہور میں آئی چاہیئے اور پھر اس کا یہ عمل، جس سے اس نے اسے پیدا کر دیا، قانونِ علت و معلول اور (دنیا میں) نظامِ تخلیق و تولید کے یکسر خلاف ہے۔ ان امور کا تعلق عَالَمِ اَمْرِ سے ہے جس میں کوئی قانون نہیں، بلکہ خدا کا ارادہ کار فرما ہوتا ہے۔ یہی خدا کی وہ دنیا“ ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُوَيِّدُ (۱۳/۲۲) وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ (۱۱/۱۰۷)۔ یقیناً تیرا رب اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ

يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (۵/۱)۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۲۲/۱۸)۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُوَ يُسْأَلُ (۲۱/۲۳) اس سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اور سب سے پوچھا جاسکتا ہے۔

تخلیق کے اس ادلیں مرحلہ کے متعلق (جس میں کائنات کو کسی سابقہ مسالہ کے بغیر، عدم سے وجود میں لایا گیا) کہا کہ

بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۲۱/۱۰)

اس نے کائنات (ارض و سما) کو پہلی بار پیدا کیا۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لئے فقط اتنا کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ (اس طرح وہ کائنات کو عدم سے وجود میں

لیا ہے۔)

یہاں خدا کو بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے فَاطِرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کہا کرپکارا گیا ہے۔ (۶/۱۴) کہیں کہا گیا ہے کہ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۝ (۳۰/۱۱)۔ خدا اشیائے کائنات کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور انھیں گردشیں دے کر مزید تخلیقی مراحل طے کرتا ہے۔

واضح رہے کہ خَلْقُ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو ماپنا، اس کا اندازہ کرنا۔ کسی شے کا توازن و تناسب درست کرنا۔ اس اعتبار سے خَلْقُ کے معنی ہوں

گے مختلف عناصر میں تناسب و توازن پیدا کر کے، ایک خاص انداز سے اور پیمانے کے مطابق کسی چیز کو بنانا۔ جہاں تک اشیائے کائنات کو پہلی بار (بغیر کسی سابقہ مسالہ کے) بنانے کا تعلق ہے، وہ خدا کے عالمِ امر سے متعلق ہے اور اس میں خدا کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن اس طرح پیدا شدہ اشیاء کے باہمی امتزاج سے نئی نئی چیزوں کی تخلیق، انسان بھی کر سکتا ہے، اور کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے خدا کو أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کہا ہے۔ (۲۳/۱۴ : ۲۴/۱۲۵)۔ یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حُسْن و رعنائی اور صحیح ترین توازن و تناسب کے ساتھ پیدا کرنے والا۔ ایک مقام پر کہا ہے کہ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۳۵/۱)۔ وہ اپنی مخلوق میں، اپنی مشیت کے مطابق، اضافے بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ اضافے بطریق ابداع بھی ہو سکتے ہیں

یعنی پہلی بار نئی نئی اشیائے کائنات کی تخلیق۔ اور مختلف اشیاء کی ترتیب نو و ترکیب جدید سے نئی اشیاء کی تخلیق بھی۔ غالب کے الفاظ ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
بیشِ نظر ہے آئینہ دامنِ نقاب میں

یا قبال کے الفاظ میں:

گماں مبرکہ بپایاں رسید کارِ مفاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

عالمِ امر کی خصوصیات

تخلیق کا یہ پہلا مرحلہ (جس میں اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا جاتا اور انہیں مختلف خصوصیات کا حامل بنایا جاتا ہے) خدا کے عالمِ امر سے متعلق ہے۔ اس کے متعلق نہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا اور کیسے ہوتا ہے، نہ ہی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ فلاں چیز کو فلاں خصوصیت کا حامل کیوں بنایا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا کہ آگ حرارت پہنچائے اور پانی (عام حالات میں) نشیب کی طرف بہے۔ سنکھیا کو ہلاکت آفریں اور پانی کو ممد حیات کیوں بنایا گیا۔ شہد کو شیرینی اور مذک کو نمکین کیوں عطا کی گئی۔ کائنات کو ایسا کیوں بنایا گیا، ویسا کیوں نہیں بنایا گیا۔ یہ سب کچھ فاطرِ کائنات نے اپنے اختیارِ مطلق اور ارادۂ کامل کے مطابق کیا۔ اس کے لئے وہ نہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند تھا اور نہ کسی کے صلاح مشورے کا محتاج۔ یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق صرف اس نے اتنا بتایا کہ **يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ** (۲۴/۲۵)۔ (و دیگر متعدد مقامات) وہ جیسے چاہتا ہے، تخلیق کرتا ہے۔ لفظ **يَشَاءُ** کی نسبت سے اُسے "مشیتِ خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کی اس مشیت کو نہ ہم سمجھ سکتے ہیں، نہ اس کے متعلق کوئی سوال کر سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں؟

یہ ہے خدا کا عالمِ امر — **يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ** — اور **يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ** کا عالم۔

اس کے متعلق اس نے ہمیں یہی بتایا ہے کہ سلسلہ کائنات کو اس نے بالحق پیدا کیا ہے (۱۶/۳) باطل نہیں بنایا (۱۹/۱۳)۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم مختلف علوم کائنات کی رو سے تحقیق و تفتیش کریں اور یہ دیکھیں کہ یہ کس طرح بالحق ہے، باطل نہیں — لیکن یہ جداگانہ موضوع ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا کے عالمِ امر کی کنہ و حقیقت ہمارے حیطہ ادراک سے باہر ہے کیونکہ وہ ہمارے تصور کے سلسلہ قوانین

(علت و معلول) سے ماوراء ہے۔

اب ایک قدم آگے چلئے۔

خدا نے اپنی مشیت کے مطابق کائنات کی تخلیق کردی اور اس منزل میں پہنچ کر اس نے اپنے پردگرم میں ایک عظیم تبدیلی پیدا کردی۔ یہاں خدا نے اپنے امر کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کی چار دیواری میں محدود کر دیا۔ یہ مقام بڑے گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔

تَقْدِير

قرآن کریم میں ”قانون“ کا لفظ نہیں آیا۔ اُس زمانے کے عربی لٹریچر میں بھی یہ لفظ، ان معانی میں، بہت کم نظر آتا ہے۔ اس کے بجائے قرآن میں ایک اور مادہ (ROOT) استعمال ہوا ہے جو اپنی معنیت کے اعتبار سے، قانون سے بھی زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ مادہ ہے (ق۔ د۔ ر) قَدَر۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں، اندازہ یا پیمانہ۔ قَدَرْتُ الشَّيْءَ کے معنی ہیں، میں نے اس چیز کو پایا۔ اس کا اندازہ کیا اور قَدَرْتُ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ کے معنی ہیں، اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر پایا اور اس طرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں، یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے۔ قَدَرْتُ عَلَيْهِ التَّوْبَةَ کے معنی ہیں میں نے اس شخص کے باپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ لہذا، تقدیر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا پیمانے یا اندازے کے مطابق فٹ ہو جانا۔ اور مَقْدَرٌ، اس پیمانے یا ماڈل یا (PATTERN) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔ جَاءَ عَلِيٌّ قَدْرًا کے معنی ہیں وہ اندازے یا پیمانے پر پورا اُترا۔ قَدَرْتُ اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معقول قد کا ہو۔ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ اَلْمُقَدَّرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو اندازہ کر کے بتائے کہ کھیت سے غلے کی کتنی مقدار پیدا ہونے کی امید ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قَدَرْتُ یا تَقْدِيرُ کے معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ۔ یا کسی چیز کا اندازے اور پیمانے پر پورا اُترنا۔

چونکہ کسی چیز کو ایک خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو، اس لئے قَدْ مَاتُ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنے پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عالمِ اتر میں ہر فیصلہ یا ہر کام، خدا کے اختیارِ مطلق اور ارادہِ کامل کے ماتحت سرانجام پاتا ہے۔ وہاں کوئی لگا بندھاقانون خدا کا امر قوانین کا پابند ہو گیا۔

میں خدا کا امر قاعدے اور قانون کی چار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے۔ وَ كَانِ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُودًا (۳۲/۳۸)۔ خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ اور اس طرح قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ خدا نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔

”ہر شے کے لئے پیمانہ مقرر کر دیا۔“ کا مطلب کیا ہے، اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ پانی درجہ انجماد پر سیال سے ٹھوس ہو جاتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر وہ پھر ٹھوس سے سیال ہو جاتا ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جس برتن میں ڈالو اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زیادہ حرارت پہنچائی جائے تو وہ بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بخارات ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں اس لئے وہ فضا میں بلند ہو جاتے ہیں انھیں بادل کہا جاتا ہے۔ ایک خاص درجے کی ٹھنڈک پہنچنے پر وہ بخارات پھر پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پانی چونکہ ہوا سے بھاری ہوتا ہے اس لئے وہ (بارش کی شکل میں) زمین پر برس جاتے ہیں۔ انھیں ”پانی کے پیمانے“ کہا جائے گا۔ یا یہ کہ ایک خاص مقدار تک پانی پیاس بجھاتا ہے اور مہجیات ہے لیکن اسی کی افراط انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہے (جیسے ڈوب کر مر جانا)۔ یہ بھی پانی کے پیمانے ہیں۔ یا مثلاً کھجور کا درخت برسوں کے بعد جا کر پھل دیتا ہے اور کیلا چھ مہینے میں بار آور ہو جاتا ہے۔ یہ ان کے پیمانے ہیں۔ بیول کے بیج سے بے ثمر کانٹے دار درخت اگتا ہے اور آم کے بیج سے ”ثمر بہشت“ — انجلیں کے بھرے ہوئے گلاس —

بادنی تدبیر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس چیز کو قرآن نے قَدْ کہا کہ پکارا ہے اسے ہماری اصطلاح میں قانونِ فطرت (LAW OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ لہذا، قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ

قوانین فطرت

شئى ۛ قَدْ رَأَىٰ (۶۵/۳)۔ کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اشیا۔ ئے

کائنات کے لئے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق وہ وجود میں آئیں،

بڑھتی، پھولتی، پھلتیں اور اس کے بعد معدوم ہو جاتیں (یا کوئی دوسری ہیئت اختیار کر لیتی ہیں)۔ دیکھئے قرآن کریم کی مختلف آیات سے یہ حقیقت کس طرح نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے۔

(۱) انسانی بچہ کی پیدائش کے سلسلہ میں کہا کہ اس کا آغاز نطفہ سے ہوتا ہے جو ایک محفوظ مقام (عورت

کے بیضہ) میں قسار گیر ہو جاتا ہے۔ اِلٰی قَدْ رَا مَعْلُوْمٌ (۲۱-۲۲/۴۴)۔ وہ ایک معلوم

انداز سے پیمانے تک وہاں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ مدت ہے جس تک جنین رحم مادر

میں رہتا ہے اور اس کے لئے فطرت کا قانون مقرر ہے۔ اس کے بعد ہے۔ فَقَدْ رَا فَنِعْمَ

النَّصِيْحَةُ (۲۳/۴۴)۔ یہ پیمانے (قوانین) ہم نے مقرر کئے ہیں۔ ہم بہترین پیمانے مقرر کر نیوالے

ہیں۔ (ضمنیہاں سے ”قَادِرٌ“ کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ ”پیمانے مقرر کرنے والا“۔ دوسری جگہ

(۲۵/۵۴) میں ”قَادِرٌ“ کی بجائے قَدِيْرٌ آیا ہے)۔

جنین کے لئے ان پیمانوں کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ بعض اوقات رحم مادر میں بچہ تا تمام رہ جاتا ہے

اور اکثر اوقات وہ مکمل ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہے وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ رَبِّعَزِزٍ

(۱۳/۸)۔ خدا کے ہاں ہر شے کے لئے پیمانے مقرر ہیں۔

(۲) بارش کے متعلق کہا کہ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ (۱۱/۲۳) اور

ہم بادلوں سے ایک مقدار کے مطابق بارش برساتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ بارش برستی ہے تو

فَسَالَتْ اَوْدِيَةً مُّبْقَدًا رَہَا (۱۴/۱۳)۔ ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قدر) پیمانوں کے

مطابق بہہ نکلتے ہیں۔

(۳) زمین کی پیداوار کے متعلق بھی کہا کہ يُنْزِلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ (۲۴/۲۲)۔ اس کی

پیداوار ایک انداز سے کے مطابق ہوتی ہے جسے خدا کی مشیت نے مقرر کیا ہے (مَا يَشَاءُ کا مفہوم آگے

چل کر بیان کیا جائے گا)۔ اسی سلسلہ میں ان چار موسموں کا بھی ذکر آیا ہے، جن میں مختلف فصلیں اُگتی ہیں۔

وَقَدْ مَرَّ فِيْهَا اَفْوَ اَتْهَآ فِیْ اَمْرٍ بَعَثَ اَيَّامٍ (۱۰/۴۱)۔ خدا نے زمین کے لئے چار فصلوں

کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔

(۴) اجمالی طور پر تمام اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ فَقَدْ سَأَلَ تَقْدِيرًا (۲۵/۲) اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کے لئے اندازہ اور پیمانہ مقرر کر دیا۔ بلکہ ہر شے کو پیدا ہی ایک خاص پیمانے کے مطابق کیا۔ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (۵۴/۴۹)۔ سورۃ الاعلیٰ کی وہ دو آیتیں بڑی غور طلب ہیں جن میں کہا ہے کہ الَّذِي خَلَقَ فَسُوِّيْهُ ۚ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى ۚ (۸۴/۳-۲)۔ خدا نے ہر شے کی تخلیق کا آغاز کیا۔ پھر اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے، اس کا تناسب قائم کیا۔ پھر اس کے لئے ضروری پیمانے مقرر کئے اور اس کے اندر اس امر کی راہ نمائی رکھ دی کہ وہ ان پیمانوں کے مطابق اپنی نشو و نما کس طرح کرے۔

(۵) اب آپ اس گوشے کی طرف آئیے جس میں اس لفظ (تکسیر) کا مفہوم عصرِ حاضر کی اصطلاح میں (قانونِ فطرت) کے مطابق زیادہ وضاحت سے سامنے آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں (اب) ابتدائی جماعتوں کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ دن اور رات، ایک دوسرے کے بعد کس طرح آتے ہیں۔ یہ زمین کی گردش کا نتیجہ ہیں اور اس کی گردش ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہو رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دن اور رات (طلوع اور غروبِ آفتاب) کے اوقات اس حتم و یقین کے ساتھ متعین کر لئے جاتے ہیں کہ ان میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔ اس کے متعلق کہا کہ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۲۰/۴)۔ اللہ نے دن اور رات کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اسی طرح چاند کے متعلق کہا وَقَدَّرَ لَهُ مَنَازِلَ (۱۰/۵)۔ خدا نے اس کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد دیکھئے کہ لفظ تقدیر کے معنی کس قدر واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ کہا کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ اِمْسَاتٍ يُّٰمَسَّتْ لَهَا — سورج (نظامِ شمسی) بھی اپنے مستقر کی طرف دوایں دوایں چلا جا رہا ہے۔ ذَالِكِ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳۶/۳۸)۔ یہ اس خدا کا مقتدر کردہ قانون (تقدیر) ہے جو ہر بات کا علم بھی رکھتا ہے اور بڑے غلبہ کا مالک بھی ہے۔ دوسرے مقام پر مختلف اجرامِ فلکی کے بالعموم اور ستاروں کے بالخصوص تذکرہ کے بعد کہا۔ ذَالِكِ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۴۱/۱۲)۔ (یہ خدا ہے عزیز و علیم کے مقرر کردہ پیمانے، قوانین، ہیں) ان تصریحات سے واضح ہے کہ تقدیر کے معنی قانونِ فطرت کے ہیں، نہ کہ ”انسان کی قسمت“ کے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ ان آیات میں ذَالِكِ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

کہا گیا ہے۔ یہ خدائے عزیز و عظیم کی تقدیر ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے تقدیر کے معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ عطا کرنا، مقرر کرنا۔ ”خدا کی تقدیر“ کے معنی ہوں گے خدا کی طرف سے مقرر کردہ پیمانے

تقدیر خدا کی ہے، انسان کی نہیں | یا قوانین خداوندی۔ اس سے آپ اندازہ لگالیں

لفظ کن معانی میں استعمال ہوتا ہے! یعنی قرآن کریم کی رو سے ’تقدیر‘ خدا کی ہے۔ ”انسان کی تقدیر“ کہنا ہی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل حیات کے متعلق بہت سی الجھنوں، پیچیدگیوں اور کشمکشوں کی وجہ الفاظ کا غلط استعمال یا ان کا غلط مفہوم ہے اور قرآن کریم کے سمجھنے کا صحیح طریق یہی ہے کہ اس کے الفاظ، اصطلاحات یا تصورات (CONCEPTS) کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے۔

خدا کی یہ تقادیر (قوانین فطرت) پہلے سے مقرر ہیں۔ (انہیں عالمِ امر میں متعین کیا گیا تھا)۔ اور ”کتاب فطرت“ یا صحیفہ کائنات میں مرقوم۔ اسی کو خدا نے ”کتابِ مبین“ کہا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے — خدا جانتا ہے کہ بحر و بر میں کیا ہے اور کوئی پتہ کسی درخت سے نہیں گرتا کہ اس کا اُسے علم نہ ہو۔ اور نہ ہی زمین کی تاریکیوں میں پنہاں کوئی دانہ ایسا ہوتا ہے جو اس کے حیطہ علم سے باہر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ لَا رُطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ (۶/۵۹) کوئی رطب و یا بس (اشیائے کائنات کی جزئیات تک) ایسی نہیں جو ”کتابِ مبین“ میں نہ ہوں۔ یعنی خدا کی طرف سے مقرر کردہ قوانین فطرت، کائنات کے پتے پتے پر تحریر اور ذرے ذرے پر منقوش ہیں (۵۸/۱) جس کا جی چاہے انہیں پڑھ لے۔ اسی کو علم الطبیعیات — سائنس — کہا جاتا ہے۔ اسی جہت سے ان قوانین کو بِحَقِّدٍ مَّعْلُومٍ کہا گیا ہے۔ (۱۵/۲۱)۔ یعنی وہ قوانین جن کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (نیز ۱۵/۴)۔ آدم کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ اسے ”علم الاسماء“ دیا گیا ہے، تو اس سے مراد، علمِ اشیائے کائنات ہی ہے۔

لے میں نے لغات القرآن میں، قرآنی الفاظ، اصطلاحات اور تصورات کا مفہوم اسی طریق سے متعین کیا ہے اور اپنی مفہیم کے مطابق پھر مفہوم القرآن (مکمل) مرتب کیا ہے۔

قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں

قانون (Law) کی تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ

IF _____ THEN _____ ALWAYS

حکم اور قانون میں فرق | اگر ایسا کر دو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہمیشہ ہوگا۔ یہ آخری شرط، قانون کی اساس اور بنیاد ہے۔ محکم کے معنی فیصلہ کے ہیں۔ ایک آقا اپنے ملازمین کو وقتاً فوقتاً حکم دیتا رہتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی اس نے ایک حکم دیا ہو اور اس کے بعد دوسرا حکم، جو پہلے حکم سے مختلف ہو۔ لہذا، احکام ان فیصلوں کو کہا جائے گا جو بدلتے رہیں یا جن میں تبدیلی کا امکان ہو۔

لیکن جب کوئی حکم (فیصلہ) ایسی شکل اختیار کر لے کہ اس میں تبدیلی کا امکان نہ رہے تو اسے قانون کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر، قانون غیر متبدل فیصلے کو کہا جائے گا۔ خدا نے، اشیائے کائنات کے متعلق جو فیصلے کئے ہیں — یعنی ان کے پہلے مقصد رکھے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں۔ قوانینِ فطرت کا یہی غیر متبدل ہونا ہے جس پر سائنس کی رفیع و عظیم عمارت استوار ہے اور جس پر اعتمادِ کلی کے سہارے (جسے قرآن کی اصطلاح میں توکل کہا جاتا ہے) زمینی انسان، چاند کی سیر کر کے شاداں و فرجاں واپس آجاتا ہے۔ نہیں! بلکہ یہ کہیے کہ قوانینِ فطرت کا یہی غیر متبدل ہونا ہے، جس کی بنیاد پر خود کائنات کی حیرت فروش عمارت اس ثبات و استحکام کے ساتھ قائم ہے اور اس کی محیر العقول شینری اس حسن و خوبی اور نظم و نسق سے مصروفِ حرکت و عمل۔

کَلِمَةُ اللَّهِ أَوْ سُنَّتُ اللَّهِ | قانونِ خداوندی کے لئے قرآن میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک کلمۃ اللہ اور دوسرے سنت اللہ۔ قرآن پر تدبیر

سے ان دونوں میں یہ فرق سامنے آجاتا ہے کہ کلمۃ اللہ، قانون کی نظری حیثیت ہے۔ جسے فارمولا کہا جاسکتا ہے اور سنت اللہ اس فارمولا کی عملی شکل۔ یعنی جب وہ نظری قانون، عملی پیکر اختیار کرے تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ یعنی وہ روش جس پر خدا چل رہا ہے، یا جس پر وہ کائنات کو چلا رہا ہے۔ یہ دونوں غیر متبدل ہیں۔ سورۃ النعام میں ہے۔ لَا مُبَدِّلَ يَكَلِّمُ اللَّهُ (۶/۳۳)۔ کلمات اللہ (قوانینِ خداوندی)

کو کوئی بدل نہیں سکتا (نیز ۱۱۶/۶)؛ (۱۸/۲۷۱)۔ دوسری جگہ ہے لَذ تَبْدِلُ إِلَیْكَ کَلِمَاتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)۔ کلمات اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

سُنَّتِ اللّٰہ کے سلسلہ میں سورۃ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۝ (۲۳/۶۲)۔ خدا کی یہی سنت (روشش) اقوام سابقہ کے سلسلہ میں بھی رہی ہے (اور یہی قوم مخاطب کی صورت میں بھی رہے گی)۔ تو سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ (نیز ۸۵/۴۰)؛ (۲۸/۲۳)۔ دوسرے مقامات پر تبدیل کی جگہ تحویل کا لفظ آیا ہے۔ یعنی روش خداوندی اپنا رخ تک نہیں بدلتی۔ (۱۷/۷۷)؛ (۳۵/۲۳)۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عالم خلق میں آکر خدا کا امر ”قدر مقدور“ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ مقرر کردہ پیمانوں کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی کو قرآن میں سُنَّتِ اللّٰہ کہا گیا ہے۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَ كَانُ اللّٰهُ قَدَرًا مَّقْدُورًا (۳۳/۳۸)۔ خدا کی روش اقوام سابقہ کے بارے میں بھی یہی رہی ہے۔ یہ اس لئے کہ (عالم خلق میں) خدا کا امر پیمانوں کے ظروف میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ غیر متبدل قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ حق، ان تعبیری نتائج کو کہتے ہیں جو منفعت بخش ہوں اور ٹھوس شکل

میں سامنے آجائیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کا یہ دعوے کہ کارگہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ اس سے انسان کے لئے نفع رساں نتائج محسوس شکل میں ظہور میں آئیں، ایک حقیقت ثابتہ بن کر کس طرح سامنے آ سکتا ہے۔ اس کے لئے کہا کہ وَ یُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِکَلِمَاتِهِ (۱۰/۸۲)۔ خدا اپنے قوانین کے ذریعے حق کو حق ثابت کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ یَمْنَحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ یُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمَاتِهِ (۴۲/۲۴)۔ خدا اپنے قوانین کے ذریعے باطل کو مٹا دیتا ہے

اور حق کو ثابت کر دیتا ہے۔ یہ چیز ”ان تغیرات کی رو سے جو کائنات میں قوانین فطرت کے مطابق ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں“ سامنے آجاتی ہے لیکن اس کے لئے بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

خدا کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان کے دست و بازو، کائناتی کی فوٹوں کے رفیق بن جائیں، تو وہی نتائج

دنوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ یعنی، خارجی کائنات میں، سائنس کے انکشافات اور ایجادات کی رُو سے، اور انسانوں کی دنیا میں، قوانین خداوندی کے مطابق نظامِ مملکت قائم کرنے سے۔ لیکن یہ موضوع دوسرا ہے، اس لئے یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس طرح احقاقِ حق سے، خدا کا امر پورا ہوتا چلا جاتا ہے۔ سورۃ الطلاق میں ہے۔ **إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرِهِ ط قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْراً ۝ ۱ (۶۵/۳)**۔ یقیناً اللہ اپنے امر کو (یعنی اس پر دگرام کو جسے اس نے عالمِ آخر میں متعین کیا تھا)، تکمیل تک پہنچا کر رہتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر دیئے تھے۔

اشیائے فطرت مجبور ہیں

یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قوانین خداوندی غیر متبدل ہیں۔ اب اسی سکتہ کے دوسرے رخ کی طرف آئیے جہاں سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اشیائے فطرت، ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہیں جو ان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اس مضمون کی آیاتِ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر ملیں گی کہ **وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ ذَٰبِقَةٍ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ (۱۶/۴۹)**۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموات) میں جو کچھ ہے، وہ خدا کے حضور (قوانین خداوندی کے سامنے) سجدہ ریز ہے۔ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، سب اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور کسی کو اس سے مجالِ سربازی اور مارے سرکشی نہیں۔ **كُلٌّ لَّهُ قٰنِنٌ ۙ (۲/۱۱۶)**۔ سب اس کے تابعِ فرمان ہیں۔ کہیں ہے۔ **سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۵۷/۱)**۔ کائنات کی ہر شے اس پر دگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے جو اس کے لئے خدا نے مقرر کیا ہے۔

لے تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ”اسلام کیا ہے؟“ یا انگریزی تصنیف

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، اسے سمٹا کر بیان کیا جائے تو حسب ذیل نتائج سامنے آئیں گے:-
 (۱) اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ ذٰلِیْمٌ۔ خدا نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انہی قوانین کی رو سے وہ ان پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے۔
 (۲) اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں۔

(۳) یہ قوانین ”قَدَرٌ مَّعْلُوْمٌ“ ہیں۔ یعنی ان کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) قصہ آدم میں جو کہا گیا ہے کہ ”وَعَلَّمَ آدَمَ اَسْمَاءَ الْاَشْيَاءِ كُلَّهَا“ (۲/۳۱)۔ ”ہم نے آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا۔“ تو اس سے مراد علم اشیائے کائنات یعنی قوانین فطرت اور اشیائے کائنات کی خصوصیات و تاثیرات کا علم ہے۔ جب انسان، ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے تو فطرت کی قوتیں اس کے کنٹرول میں آجاتی ہیں۔ قصہ آدم میں اسے ”ملائکہ کے سجدہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲/۳۴)۔

قرآن کریم نے ان تمام تصریحات کو چند جامع الفاظ میں سمٹا دیا ہے، جہاں کہا ہے کہ ”وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ“۔ (۲۵/۱۳)۔ خدا نے تمام اشیائے کائنات کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان سے فائدے حاصل کر سکو۔ انہیں اپنے کام میں لاسکو۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۵/۱۳)۔ جو قوم بھی اس حقیقت پر غور و فکر کرے گی وہ اس میں، کائنات میں انسان کا مقام متعین کرنے کے لئے، بڑی واضح نشانیاں پائے گی۔

ہم نے دیکھ لیا کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی اس نئی منزل میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور وہ یہ کہ خدا کا امر (جو کسی قاعدے، اور ضابطے کا پابند نہیں تھا) ”امر مقدور“ ہو گیا۔ یعنی وہ مطلق اختیار کے بجائے قانون بن گیا اور قانون بھی ایسا جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں

بالفاظ دیگر، اس مرحلہ میں خدا نے اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کر لیں۔ خدا کے لئے ”پابندی“ کے تصور سے احساس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے لیکن جب اس نے خود ہی ایسا کیا اور کہا ہے، تو ہمارے لئے ایسا

تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔ اور ”باک“ کے کیا معنی؟ جب یہ ایک حقیقت ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں (کہ قوانین خداوندی غیر تبدیل ہیں) تو اسے تسلیم کرنا ہی صداقت شعاری ہے۔ سورۃ انعام میں ہے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَۃَ (۵۴-۶/۱۲)۔ اس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ قرآن کریم میں کَتَبَ کا لفظ ان مقامات پر آیا ہے، جہاں کسی بات کو کسی پر فرض (یعنی لازم) قرار دیا گیا ہو۔ جیسے کَتَبَ عَلَیْکُمْ الصِّیَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ یعنی یہ فریضہ خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد کیا گیا ہے۔ لہذا، کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَۃَ کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اپنے آپ پر خود یہ پابندی عائد کی ہوئی ہے۔ دوسری جگہ ہے حَقًّا عَلَیْنَا نُفِجَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰/۱۰۳)۔ مومنین کو مصائب و آلام سے محفوظ رکھنا، خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہاں حَقًّا عَلَیْنَا کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَضْرُاَ لِمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۳۰/۴۷)۔ مومنین کی مدد کرنا ہمارے اوپر واجب ہے۔ کَتَبَ اللّٰهُ لَآ غَلِبَنَا اَنَا وَرُسُلِیْ (۵۸/۲۱)۔ خدا نے یہ لکھ رکھا ہے (فیصلہ کر رکھا ہے) کہ ہم اور ہمارے رسول ضرور غالب رہیں گے۔

خدا کی یہ رحمت، مومنین کی نجات، فتح و نصرت، غلبہ و تملک، جنہیں خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے، کن شرائط سے مشروط ہے، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خدا نے خود اپنے اوپر بھی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ان پابندیوں کو ”خدا کا وعدہ“ بھی کہا گیا ہے۔ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا (۱۶/۳۸)۔ یہ خدا کا وعدہ ہے، جس کا ایفا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ (نیز ۳۱/۹؛ ۳۵/۵؛ ۴۰/۵۵؛ ۴۰/۷۷)۔ ان وعدوں کے متعلق اس نے بالتصریح کہہ دیا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوگی۔ وَعْدَ اللّٰهِ - لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدًا ۙ (۳۰/۶)۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ اور یاد رکھو کہ خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ (نیز ۳/۱۹۳)۔

خدا کے یہ ”وعدے“ درحقیقت اس کے مقرر کردہ قوانین ہیں اور انکی خلاف ورزی نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں

خدا کے وعدے

ہوگی۔ یہ ہے مراد اس پابندی سے جو خدا نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ اس پابندی کی ایک نمائندگی مثال خود قرآن میں دی گئی ہے۔ یہ واضح ہے کہ خدا اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے لیکن اس کے بعد اس نے اشیائے کائنات کے لئے غیر متبدل قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ انہی قوانین میں سے ایک قانون تولید ہے جس کی رو سے حیوانات اور انسانی بچے کی پیدائش، زردارہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ابن اللہ (خدا کے بیٹے) تھے۔ خدا نے اس عقیدے کی تردید کی ہے اور جس دلیل کے ساتھ اس کی تردید کی ہے وہ بصیرت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ **بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالدُّنْيَا**۔ خدا، اس تمام سلسلہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی پروگرام کے لئے علت و معلول کے قانون کا پابند نہیں تھا۔ لیکن تخلیق کائنات کے بعد جب اس نے علت و معلول کا قانون نافذ کر دیا، تو اب اس کے خلاف وہ خود بھی کچھ نہیں کرتا۔ بیٹے کی پیدائش کے لئے اس کا قانون یہ ہے کہ زردارہ (میاں بیوی) کے اختلاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں، خدا کا بیٹا ہے۔ **اَنّٰی يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ يَكُنْ لَهٗ صَاحِبَةٌ** (۶/۱۰۳)۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اتنا نہیں سوچتے کہ خدا کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب اس کی بیوی ہی نہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ اس دلیل میں، خدا نے کتنی عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ یعنی یہ درست ہے کہ وہ **بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالدُّنْيَا** ہے۔ وہ بغیر کسی سابقہ (موجودہ) مسالہ کے، اور بلا پابندی قانون علت و معلول، کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے، لہذا، اس کے لئے یہ کیسا مشکل ہے کہ وہ اپنے ہاں ایک بیٹا بھی اس طرح پیدا کر لے، لیکن جب اس نے بچے کی پیدائش کے لئے ایک قانون بنا دیا، تو اس قانون کی خلاف ورزی وہ خود بھی نہیں کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن ایسا کرتا نہیں۔

اور اس میں (کہ وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن ایسا کرتا نہیں) ایک اعتراض کا جواب

بھی قوانین کا پابند تسلیم کر لیا جائے تو وہ قادر مطلق نہیں رہتا، مجبور ہو جاتا ہے اور یہ خدا کی شان کے خلاف ہے لیکن ایسا سمجھنا سطح بینی اور غلط نگہی کا نتیجہ ہے۔ مجبور وہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے کی طرف

سے عائد کردہ پابندی کا پابند ہو۔ لیکن جو خود اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کرے، اسے مجبور نہیں کہا جاتا۔ اگر آپ کو حکماً کہا جائے کہ آپ ہر روز صبح تین میل کا چکر لگائیں، تو آپ اس حکم کی تعمیل جبراً کریں گے۔ لیکن اگر آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ ہر روز صبح کے وقت، تین میل کی سیر کیا کریں گے اور پھر آپ التزاماً سیر کریں، تو اسے آپ پر جبر نہیں کہا جائے گا۔ اپنے وعدوں کا ہمیشہ ایفا کرنے والا، اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والا، بات کا پکا، قول اقرار کا پورا، مرد مجبور نہیں کہلاتا، اصول پرست اور قابل اعتماد کہلاتا ہے۔ اس لئے خدا نے اگر اپنی قدرتِ کاملہ اور اختیارِ مطلق کے باوجود اپنے اوپر خود کچھ پابندیاں عائد کر لی ہیں، تو اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے میں نقص واقع نہیں ہوتا۔ یہ تو بلکہ، اس کے صاحبِ عزم صہم ہونی کی دلیل ہے کہ وہ سب کچھ کر سکنے کے اختیارات اور قدرت رکھنے کے باوجود اپنے اصول کو نہیں توڑتا، اپنے وعدے سے نہیں پھرتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اور سچ پوچھئے تو خدا ہونا زیبا، ہی اسے دیتا، جو اس قدر لامحدود اختیارات اور لا انتہا قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود، اتنی شدت سے بات کا پکا اور وعدے کا سچا (اصولوں کا پابند) رہے۔ یہی وہ خدا ہے جس پر اعتمادِ کلی کیا جاسکتا ہے۔ یاد رکھئے، خدا ایسا کر سکتا تھا کہ کائنات کو پیدا کر دیتا لیکن اس کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہ کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کیا نہیں۔ اس نے اس کے لئے قوانین مقرر کر دیئے۔

پھر وہ ایسا بھی کر سکتا تھا کہ اپنے متعین کردہ قوانین کو جب جی چاہے بدل دے لیکن اس نے کہا کہ ہم، ایسا کر سکنے کے باوجود، ایسا کریں گے نہیں۔ یہ ہے خدا کا صحیح تصور۔

لیکن خدا کا یہ تصور دین کا عطا کردہ ہے، جسے مذہب کا خوگر انسان اپنا نہیں سکتا یا اپنا ناچاہتا نہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، مذہب انسان کے عہدِ طفولیت میں پیدا شدہ تصورات کا مجموعہ ہے جب

وہ (بچے کی طرح) ہنوز قانون کے تصور سے نا آشنا تھا۔ انسان اب بالغ ہو

مذہب کے تصور کا خدا چکا ہے اور عقل و فکر کی رو سے، خدا کے اس تصور کو (APPRECIATE) کر سکتا ہے جو دین نے عطا کیا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کا مفاد اسی میں ہے کہ ذہن انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں رہے، اس لئے وہ لوگوں کو اس طرف آنے نہیں دیتے۔ وہ انسانی ذہن میں اس قسم کے خدا کا تصور راسخ کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ درمیانی واسطہ بن کر، لوگوں کی "مرادیں پوری کرا دیں" اور یوں عوام سے اپنی خدائی منولتے رہیں۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت نے، ملکیت کا تصور عام کیا۔ یا یوں کہئے کہ ملکیت اور

مذہبی پیشوائیت نے گمٹھ جوڑ کر لیا۔ اور بادشاہ کے ذی اقتدار ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ وہ جو جی میں آئے کرے اور جیسا چاہے حکم دیدے۔ اس قسم کے نظامِ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے تابع زندگی بسر کرنے والا انسان، احکام کا پابندی کا تصور تو کر سکتا ہے، قانون کی اطاعت کا نہیں۔ مذہب کی گرفت کس قدر سخت اور ذہن انسانی پر اس کے اثرات کس قدر گہرے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جو لوگ، ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے، قانون کی حکمرانی کا نظام سیاست قائم کرنے کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں، وہ بھی جب پرستش گاہوں میں آتے ہیں تو خدا کو قانون کے مطابق حکومت کرنیوالے صاحب اقتدار کی بجائے، آمر مطلق کی شکل میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے مذہب کی سحر آفرینی، یعنی اپنی دنیا میں قانون کی حکمرانی اور خدا کی خدائی میں کامل لاقانونیت!! دین، اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ یعنی یہ کہنے کے لئے کہ انسانوں کی تمدنی زندگی کا نقشہ خارجی کائنات کا سا ہونا چاہیے جہاں قاعدے اور قانون کی حکمرانی ہے اور جس میں کوئی اپنی سن مانی نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی۔



باب سوم

انسان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی دوسری منزل میں، اس کے اترنے قانون کی شکل اختیار کر لی اور اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئیں اور خود خدا نے یہ عہد کر لیا کہ وہ ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔ یہ عالم تخلیق کا بہت بڑا انقلاب تھا لیکن اس سے بھی بڑا انقلاب ایک اور تھا۔ اور وہ تھا انسان کی تخلیق۔ قوانین تو انسان کے لئے بھی متعین کئے گئے لیکن انسان کو ان کی اطاعت کے لئے مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اسے اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ آپ غور کیجئے کہ یہ، خدا کے تخلیقی پروگرام میں، کتنا عظیم انقلاب تھا۔

(۱) خدائے جلیل، لامحدود اختیارات کا مالک، قادر مطلق لیکن اس نے اپنے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر اپنے اوپر آپ پابندی عائد کر لی۔

(۲) اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئیں۔ اور

(۳) انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا۔

انسان۔ صاحب اختیار و ارادہ | مجبور کے سامنے صرف ایک راستہ ہوتا ہے جس پر اسے طوعاً و کرہاً چلنا ہوتا ہے لیکن صاحب اختیار اسے

کہتے ہیں جس کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات (POSSIBILITIES) ہوں اور اسے اس کا اختیار ہو کہ وہ ان میں سے جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اسے حق انتخاب یا (CHOICE) کہا

جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے متعلق کہا کہ وَ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (۹۰/۱۰)۔ اور ہم نے اسے دو راستے دکھادیئے۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا ۙ اِمَّا كَفُورًا ۙ (۹۱/۳)۔ ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا۔ اب یہ اس کے اپنے فیصلے پر منحصر ہے کہ وہ اسے اختیار کر لے یا اس پر چلنے سے انکار کر دے۔ اسی کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قَدْ فَتَنَ شَاءَ قَلِيلُوْهُ مِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۝ (۹۹/۲) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سورۃ النجم میں ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ (۵۳/۳۹) انسان کو وہی کچھ حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ ”کوشش“ کا محرک جذبہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس لئے متعدد مقامات پر بتایا کہ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ”جو شخص دنیا کے مفاد عاجلہ حاصل کرنے کا ارادہ کرے اسے ہم وہی مفادات دے دیتے ہیں اور جو شخص مستقبل کی خوشگوار یوں کا ارادہ کرے اور پھر ان کے حصول کے لئے کوشش کرے تو ہم اسے اس کا مطلوب عطا کر دیتے ہیں۔ یہ جہان سعی و عمل ہے جو جس میدان میں کوشش کرتا ہے اس میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۙ (۱۸-۲۰/۱۱)۔ ہم نے اپنی بخشائشوں کے راستے میں بند نہیں لگا دیئے۔ وہ سب کے لئے کھلی ہیں۔ جس کا جی چاہے اپنی سعی و عمل سے انھیں حاصل کر لے۔ سورۃ نسا میں ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۙ (۴/۱۳۲)۔ جو قریبی مفادات حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے (تو اس سے کہہ دو کہ) خدا کے ہاں قریبی مفادات بھی ہیں اور مستقبل کی خوشگواریاں بھی۔ تم جو کچھ حاصل کرنے کا ارادہ کرو گے، وہی کچھ تمہیں مل جائے گا۔ (نیز ۶۲/۲۵)۔

جیسا کہ آئندہ باب (مکافاتِ عمل) میں تفصیلاً بتایا جائے گا، انسان کو اس کے تمام اعمال کا ذمہ دار

انسان کی ذمہ داری | ٹھہرایا گیا ہے اور اس کی یہی وہ ذمہ داری ہے جس کی وجہ سے اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آتے ہیں۔ اعمال کی جزا و سزا کا سارا نظام

اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کام کا ذمہ دار وہی قرار پاسکتا ہے جو اسے اپنے اختیار و ارادہ سے سرانجام دے۔ جس سے مجبوراً کوئی کام کرایا جائے اسے

اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہی نہیں جاسکتا۔ اس بنا پر قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ مجبور اور صاحب اختیار اختیار و ارادہ، دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (۱۶/۷۶ - ۷۵)۔ یہی وجہ ہے جو اس نے کہا ہے کہ اگر کسی سے کفر کا بھی کوئی کام جبراً کرایا جائے تو اس سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ مواخذہ اسی عمل کا ہوگا جو اپنے اختیار و ارادہ سے کیا جائے۔ (۱۶/۷۶)۔ دوسری جگہ ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَا لَكُمْ مَنَاصِدَتْ قُلُوبُكُمْ (۳۲/۵)۔ اگر تم سے بھول چوک سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ گرفت اس کی ہوگی جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔ یہی اصول اس نے، دنیاوی قانونِ عدل کے سلسلہ میں بھی متعین کیا ہے، جس کی رو سے اس نے قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں فرق کیا ہے، اور دونوں کی سزائیں الگ الگ تجویز کی ہیں۔ قتلِ عمد کی سزا سخت اور قتلِ خطا کی نرم۔ (۹۲ - ۴/۲)۔

قصہ آدم — جبر و اختیار
کی وضاحت

قرآن کریم نے ”جبر اور اختیار“ کے مسئلہ کو، قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں نہایت دل نشین طریق سے حل کر دیا ہے۔ خدا نے آدم کو بھی ایک حکم دیا اور ابلتیس کو بھی۔ آدم سے بھی اس حکم کی معصیت سرزد ہوئی (غلاف ورزی ہوئی) اور ابلتیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جھٹکی ہوئی نگاہوں سے کہا کہ

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (۷/۲۳)۔

اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے۔

ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نادم ہیں، شرمسار ہیں۔ یعنی آدم نے اس کا اعتراف کیا کہ اس معصیت کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ چونکہ اس نے اپنی ذمہ داری کا اعتراف کیا اور محسوس کر لیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے، اس کے لئے اصلاحِ خویش اور باز آفرینی کے امکانات روشن ہو گئے۔ اس سے کہا گیا کہ کوئی بات نہیں۔ فَإِنَّمَا يَتُوبُ عَلَيْكَ مَنِ اهْدَىٰ - فَمَنْ تَبِعَ هَذَا لَا يَخُوفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَخُوفُونَ ۝ (۲/۳۸)۔ ہم تمہاری طرف راہ نمائی بھیجتے رہیں گے۔ تم میں سے جو بھی اس کا اتباع کرے گا، وہ خوف و حزن سے مامون رہے گا۔ اسی کو فردوسِ کم گشتہ

کی بازیابی کا امکان کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اسے غلطی سے لغزش کے بعد توبہ سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۶/۱۱۹) اس کے برعکس جب ابلیس سے یہی سوال کیا گیا کہ (تم نے حکم خداوندی سے سرتابی کیوں برتی ہے) تو اس نے خدا سے کہا کہ میں نے سرتابی کیسے برتی ہے۔ اَعُوْیْتُنِیْ۔ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (۱۶/۱۶) (۱۵/۳۹) میں توبہ نہ مجبور ہوں۔ مجھے نہ اطاعت کا اختیار ہے نہ معصیت کا۔ یہاں سب کچھ تیرے حکم سے ہوتا ہے۔ تو نہ چاہتا تو میں سرکشی کس طرح اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ جب ابلیس نے اپنے عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ تجھ میں اصلاح خویش اور باز آفرینی کا امکان ہی نہیں۔ فَاَنْتَکَ تَرْجِیْمُ (۱۵/۳۴)۔ تو اپنی باز آفرینی کے امکانات سے بہت دُور چلا گیا۔ تو ”مذموم و مدحور“ ہے۔ (۷/۱۸)۔ دھتکارا ہوا، ذلیل و خوار۔ ابدی مایوسی تیرا ”مقدّر“ ہے۔ (ابلیس کے معنی ہی مایوس کے ہیں)۔ یعنی جو اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے، وہ اپنی حالت میں تبدیلی کیسے کر سکتا ہے۔ یہی اس کی ابدی مایوسی کی دلیل ہے۔

کفار و مشرکین کی روش | قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ابلیس نے جو کہا تھا کہ ”اگر تو نہ چاہتا تو“ میں معصیت شعار کیسے ہو جاتا۔ ”یہی روش دنیا میں کفار اور

مشرکین کی ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے اعمال کا ذمہ دار اپنے آپ کو قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کی مشیت میں ایسا نہ ہوتا، تو ہم کفر و شرک کی روش کیسے اختیار کر سکتے تھے؟ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ سورہ انعام میں ہے۔ سَيَقُولُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا نَحْنُ نَحْمِلُ اللّٰہُ مَا اَشْرَکْنَا وَ لَا اَبَاۡءُنَا (۶/۱۳۹)۔ جب تو ان مشرکین سے کہے گا کہ تم نے یہ کیا روش اختیار کر رکھی ہے، تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ خدا کی مشیت ہی ایسی تھی۔ اگر خدا ایسا نہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے آباء و اجداد۔ ان کے جواب میں خدا نے کہا کہ اِنَّ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنَّ اَمْتُمْ اِلَّا خَعْرٌ صَوْنٌ (۶/۱۳۹)۔ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کہتے ہو، تمہاری اپنی قیاس آرائیاں اور جہالت ہے۔ حقیقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ سورہ زخرف میں ہے کہ جب تم ان سے یہ سوال کرتے ہو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نَحْنُ نَحْمِلُ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَاهُمْ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم کبھی ان معبودان باطل کی عبادت نہ کرتے۔ ہم کیا کریں۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی انسان اُس کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتا ہے۔ لہذا ہم مجبور ہیں۔ کہا کہ مَا لَہُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ

إِنَّا هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ (۲۰۱/۲۳)۔ یہ یکسر جہالت ہے، حماقت ہے، کذب ہے، افتراء ہے۔ سورہ یسین میں ہے کہ جب ان سرمایہ داروں سے کہا جاتا ہے کہ اپنی دولت کو کھلا رکھو تاکہ ان غریبوں کو بھی روٹی مل سکے تو یہ کفار مومنین سے کہتے ہیں۔ اَنْطَعِمُ مَنْ تَوْيَسَاءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهُ۔ واہ! تم یہ عجیب بات کہتے ہو۔ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں ضرور رزق دے دیتا۔ ان کے بھوکے ننگے رہنے سے صاف ظاہر ہے کہ خدا یہ چاہتا ہی نہیں کہ انہیں روٹی کپڑے ملے۔ سو خدا تو یہ چاہتا ہے کہ یہ ننگے بھوکے رہیں اور تم ہم سے کہتے ہو کہ ہم ان کے روٹی کپڑے کا انتظام کریں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ خدا کی مشیت کے خلاف ہوگا۔ یہ اس کے خلاف اعلان جنگ ہوگا۔ ہم تو اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے اس کے جواب میں کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۳۶/۴۱) ان سے کہو کہ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تم بڑے ہی گمراہ ہو۔

یہاں ایک ثانیہ کے لئے رکئے اور سوچئے کہ ہم جو اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی یہی تھا۔ اس کی مرضی ہی ایسی تھی۔ یہی اس کی مشیت تھی۔ وہ چاہتا ہی یہ تھا۔ **خدا کی مرضی** اگر اس کی مرضی نہ ہوتی تو ایسا ہو کیسے سکتا تھا۔ لہذا، یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی منشا کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہاں کسی کے دم مارنے کی جا نہیں۔ ہم اٹھتے بیٹھتے یہ کچھ کہتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جو جتنا زیادہ کہتا ہے کہ ”مرضی بولا برہمہ اولیٰ“ اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ اور جو یہ تلقین کرتا ہے کہ

مرضی یار کے خلاف نہ ہو

لوگ میرے لئے دعا نہ کریں (حسرت مولانی)

وہ اتنا ہی خدا پرست تصور کیا جاتا ہے۔ تو آپ سوچئے کہ قرآن ایسا کہنے والوں کے متعلق کیا کہتا ہے؟ قرآن مجید کی آیات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیے۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ کفار اور مشرکین (ابلیس کے اتباع میں) یہ کہتے ہیں کہ انسانی دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے **انسانی دنیا میں انسان کی مشیت** ہے اور خدا انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ اَعْمَلُوا

مَا شِئْتُمْ (۴۱/۲۰)۔ تمہاری دنیا میں تمہاری ”مشیت“ کا فرما ہے۔ تم جس طرح جی چاہتے کرو۔ ہم نے تمہیں صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ہم یہ ہیں چاہتے کہ تمہارے معاملات میں دخیل ہو کر اور اپنی مشیت کو تم پر مسلط کر کے، تمہارے اختیار و ارادہ کو سلب کر لیں۔ اگر ہم نے اسے سلب کرنا ہوتا تو اسے عطا ہی کیوں کرتے۔ یہ تمہارا اپنی ذمہ داری سے فرار ہے جو تم صاحب اختیار ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مجبور کہتے ہو۔

لیکن اس نے اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ کے ساتھ ایک اور بات بھی کہی ہے جس سے انسان کے اس اختیار کے بعد جبر کا ایک گوشہ سامنے آ جاتا ہے۔ کہاکہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ اِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۴۱/۲۰)۔ تم جو کچھ چاہو کرو لیکن اتنا سمجھ لو کہ تمہارا ہر عمل ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ایک خاص نتیجہ مرتب کرے گا۔ تمہیں اس کا تو اختیار ہے کہ تم جو کام جی چاہتے کرو، لیکن جب تم سے ایک عمل سرزد ہو گیا تو اس کے بعد تمہیں اس پر اختیار نہیں رہے گا کہ تم اس کے نتیجہ کو روک لو یا اس میں تبدیلی پیدا کر دو۔ یہ چیز تمہارے حیطہ اختیار سے باہر ہوگی۔ دور استوں میں سے کسی ایک راستہ پر چلنے کا تمہیں اختیار ہے لیکن تمہیں اس کا اختیار نہیں کہ تم راستہ تو (الف) اختیار کرو اور چاہو کہ اس سے پہنچ جاؤ اس منزل پر جس کی طرف دوسرا راستہ (ب) لے جاتا ہے (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) تمہیں اس کا تو اختیار ہے کہ تم سنکھیا پھانک تو یا مصری کی ڈلی کھاؤ لیکن تمہیں اس پر اختیار نہیں کہ تم کھاؤ تو سنکھیا اور اس سے نتیجہ پیدا کر لو مصری کی ڈلی کا۔ ہم نے تمہارے ہر کام کا نتیجہ مرتب کرنے کے لئے قانون متعین کر رکھا ہے۔ جس قسم کا کام تم کرتے ہو اسی کے مطابق ہمارا قانون تم پر منطبق ہو جاتا ہے تاکہ اس کام کا متعین نتیجہ مرتب ہو جائے۔ پہل کرنا (INITIATIVE) جیسا انسان خود ہو جائے اس قسم کا

قانون اس پر منطبق ہوگا

قرآن کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر واضح کیا ہے۔ بنی اسرائیل کی بے راہ رویوں کا ذکر

کرتے ہوئے کہاکہ فَلَمَّا زَاغُوا - اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ (۹۱/۵)۔ جب انھوں نے ٹیڑھی راہیں اختیار کر لیں تو خدا (کے قانونِ مکافات) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔ ان سے کہا گیا کہ اب

خدا کا آخری رسول آگیا ہے۔ تم اس کا ساتھ دو گے تو تمہاری ذلت و خواری کی سزا کی مدت ختم ہو جائے گی لیکن
 اِنْ عُدْتُمْ — عُدْنَا (۱۷/۸)۔ اگر تم پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ گئے تو ہم بھی اپنی سابقہ
 روش کی طرف پلٹ جائیں گے اور تم اسی عذاب میں پھر مایوس ہو جاؤ گے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یَوْفُوكُمْ
 عَنْهُ مَنْ اُولٰٓئِكَ (۵۱/۱۹)۔ جو صحیح راستے سے اپنا رخ موڑ لیتا ہے، ہم اس کا رخ اسی طرف کر دیتے
 ہیں۔ سورہ توبہ میں ہے کہ ثُمَّ اَنْصَرَفُوْا — صَوَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۹/۱۲۷) پھر وہ جب
 صحیح راستے سے پھر گئے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ سورہ النسا میں ہے کہ جو لوگ رسول
 کا اتباع اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتے ہیں تو نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی (۲/۱۱۵)۔
 تو جن کی راہ وہ اختیار کر لیتے ہیں ہم بھی انہیں انہی کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، فَاذْكُرْ ذِکْرِيْ
 اَذْكُرْكُمْ (۲/۱۵۲)۔ جو ہمیں یاد رکھتا ہے ہم بھی اسے یاد رکھتے ہیں۔ جو ہمارے دین کے شرف و مجر کے
 لئے کوشش کرنا ہے ہم بھی اسے صاحب شرف و مجد بنا دیتے ہیں۔ اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۲/۲۵۴)
 جو ہماری مدد کرتا ہے ہم بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسان جو راستہ اپنے لئے تجویز کرتا ہے اس کے مطابق خدا
 کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کبریٰ کو نہایت حسین اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔
 جب التقدير کے متعلق بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ

تو اگر دیگر او دیگر است
 سنگ شو بر شیشہ انداز ترا
 قلمی! پائندگی تقدیر تست

حرفے باریکش بہ رمنے مضمراست
 خاک شو، نذر ہوا ساز ترا
 شبمنی؟ افتدگی تقدیر تست

قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جو قانون افراد پر منطبق ہوتا ہے،
 اسی کے مطابق قوموں کی "تقدیر" بھی بدلتی رہتی ہے۔ یعنی
قوموں کا تبدیلی احوال
 کوئی قوم جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرتی ہے اسی کے مطابق اس کی خارجی حالت میں تبدیلی واقع
 ہو جاتی ہے سورہ الرعد میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۱/۱۳۱) (۸/۵۳)

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ کسی قوم کے پاس ہو خدا اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ

قوم اپنی نفسیات میں خود تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔

یعنی افراد کی طرح اقوام کے عروج و زوال اور موت و حیات کے لئے بھی خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ کوئی قوم جس قسم کی روش اختیار کر لیتی ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے اور اس قوم کی روش کا نتیجہ مرتب کر دیتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی چھٹے باب میں ملے گی جس کا تعلق قوموں کے عروج و زوال سے ہے)۔

لفظ تقدیر کی مزید وضاحت | تصریحات بالا سے ”تقدیر“ کا مفہوم واضح ہو گیا ہوگا۔ لفظ ”تقدیر“ کے صحیح مفہوم کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا

گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ سورۃ انعام میں ہے۔ وَجَعَلَ الْكُلَّ سَكَنًا قَدْ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۶/۹۷)۔ خدا نے رات کو آرام کے لئے اور سورج اور چاند کو (وقت کے) حساب و شمار کا ذریعہ بنایا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی ”تقدیر“ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ ”یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔“ اسی طرح سورۃ یسین میں ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۳۶/۳۸)۔ اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی ”تقدیر“ ہے۔ تیسری جگہ ہے۔ وَذَيْتًا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ ۖ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۲۱/۱۲)۔ اور ہم نے تمہاری قمری فضا میں جگمگاتے چراغ (ستارے) روشن کر دیئے اور انہیں تمہاری حفاظت کا ذریعہ بھی بنایا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی تقدیر ہے۔ اجمالاً سورۃ فرقان میں ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ رَاهُ تَقْدِيرًا ۝ (۲۵/۲)۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر ان کے لئے ”تقدیر“ مقرر کر دی۔ یہاں بھی ”تقدیر“ سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ سورۃ الدھر میں جنت کے آنجوروں کے متعلق ہے۔ قَوَارِيرًا مِّنْ رِّضْوَانِهِ قَدْ رَأَوْهَا تَقْدِيرًا ۝ (۷۶/۷)۔ یہ آنجورے چمکدار چاندی کے ہوں گے اور انہیں خاص پیمانوں کے مطابق بنایا گیا ہوگا۔

قرآن کریم میں انہی مقامات پر تقدیر کا لفظ آیا ہے اور اس کے معنی بالکل واضح ہیں۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ پیمانے، یا قوانین خداوندی جن کے مطابق یہ کارگزار کائنات سرگرم عمل ہے۔ اس سے واضح

ہے کہ جن معنوں میں یہ لفظ (تقدير) ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے وہ اس کے قرآنی مفہوم کے بالکل خلاف ہے۔
 ”انسان کی تقدير“، ”اس کی تقدير“، ”میری تقدير“، یہ سب غلط ہے۔ تقدير تو صرف خدا کی ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی۔ لہذا انسانوں کی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ

تقدير خدا کا وہ قانون ہے جو انسان کی حالت کے مطابق اس پر
 وارد ہو جاتا ہے۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کر لے، اس قسم
 کی خدا کی تقدير (خدا کا قانون) اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔

جو شخص آگ میں انگلی ڈالتا ہے، خدا کی یہ تقدير اس پر وارد ہو جاتی ہے کہ وہ جلن اور سوزش کی
 تکلیف میں مبتلا ہو اور جب وہ اس پر مرہم لگا لیتا ہے تو خدا کی یہ تقدير اس پر منطبق ہو جاتی ہے
 کہ اُسے راحت اور سکون حاصل ہو جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبال نے ان بصیرت افروز
 الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

گزینک تقدیرِ خوئی گرد و جگر خواہ از حق حکم تقدیرِ درگ
 تو اگر تقدیرِ نو خواہی و است زانکہ تقدیرات حق لا انتہا

حضرت عمر فاروقؓ کی تصریح | اسی حقیقت کی وضاحت حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ کرتا ہے
 کہ جب ایک جگہ طاعون پھیلا تو آپؓ نے کہا کہ اس بستی

کو چھوڑ کر جنگل میں چلے جانا چاہیئے۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ افسرِ ارمنِ قدر اللہ۔
 کیا آپؓ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ آپؓ نے جواب دیا کہ نعم۔ ہاں! افسرِ ارمنِ قضاء
 اللہ الٰہی قضاء اللہ۔ میں خدا کی (ایک) تقدیر سے بھاگ کر (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔
 طاعون زدہ علاقہ میں رہ کر، اور اس طرح اس کی متعدی فضا سے متاثر ہو کر طاعون میں مبتلا ہو جانا، یہ بھی
 خدا کی تقدیر (قانونِ خداوندی) کے مطابق ہونا ہے اور اس جگہ کو چھوڑ کر صاف فضا میں چلے جانا اور یوں
 اس خطرہ سے محفوظ ہو جانا، یہ بھی خدا کی تقدیر (قانونِ خداوندی) کے مطابق ہوتا ہے۔ اب یہ چیز انسان
 کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ خدا کی کونسی تقدیر اپنے اوپر وارد کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو اقبالؒ نے
 کہا ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر پہلے خدا جس سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ جس شخص کا ارادہ مستحکم ہوتا ہے وہ اپنی روش کو اپنی مرضی کے مطابق بدلتا ہے۔ اور چونکہ جس قسم کی اس کی روش ہوگی اسی قسم کی خدا کی تقدیر اس پر وارد ہوگی، اس لئے مستحکم ارادوں کا مالک انسان اپنی مرضی کے مطابق خدا کی تقدیر اپنے اوپر وارد کرتا ہے۔ اس کے برعکس کمزور ارادے کے انسان کی روش خارجی اثرات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی کہ خدا کی کسی قسم کی تقدیر (کو نسا قانون خداوندی) اس پر وارد ہو۔ بالفاظ دیگر وہ نباتات و جمادات کی طرح مجبور ہوتا ہے۔ فلذا تقدیر کے تابع رہتا ہے اور صاحبِ عزم صمیم تقدیر کو اپنی مرضی کے تابع رکھتا ہے۔ ع

نو اگر دیگر شوی اد دیگر است

یہ ہے تقدیر کا قرآنی مفہوم۔ یہ مفہوم اُس مفہوم میں کیسے تبدیل ہو گیا جو اب ہمارے ہاں

یہ مفہوم کیسے بدل گیا؟ لیا جاتا ہے اسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ جہاں بتایا جائے گا کہ قرآن کا عطا کردہ دین، کس طرح مذہب میں

بدل گیا۔ یہ وہ بنیادی تبدیلی تھی جس سے خدا کائنات اور انسان کے متعلق دین کے تصورات، مذہب کے تصورات میں بدل گئے۔ اس سے خدا، قانون کے مطابق حکومت کرنے والے صاحبِ اقتدار کے بجائے، ایک مطلق العنان و کثیر کی شکل اختیار کر گیا اور انسان صاحب اختیار و ارادہ مخلوق کے بجائے تقدیر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی بنا دیا گیا اور مذہبی پیشوا، اس جیل خانے کے داروغہ بن کر بیٹھ گئے۔ یہ داستان بے بڑی اہم انگیز اور یہ حدیث ہے بڑی دلگداز۔ لیکن اس کے بیان کرنے کا موقع آگے چل آئے گا۔

دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے سے انسان کو مجبور تصور کرنے والے (یعنی عقیدہ جبر کے مؤید) قرآن کریم کی بعض آیات سے بھی اپنے عقیدہ کی تائید میں دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان آیات کے متعلق آئندہ

عقیدہ جبر کے سلسلہ میں ایک

اصولی بحث

ابواب میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ لیکن اس سلسلہ میں جو اصولی بحث چھیڑی جاتی ہے، مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ اسے اس مقام پر سامنے لائے آیا جائے تاکہ اصولی حیثیت سے بات نہیں واضح ہو جائے۔ کہا ہے جانا ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ

(۱) وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا (۳۱/۲۳)۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ (۱۸/۲۳)

(۲) اور خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲/۲۵۵) یعنی خدا لوگوں کے حال سے بھی باخبر ہوتا ہے اور مستقبل سے بھی پہلی آیت سے بھی یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جب انسان سب کچھ اپنے ارادے کے مطابق کرتا ہے تو اس کے لئے یہ متعین کرنا کیا مشکل ہے کہ وہ کل کیا کرے گا۔ یہ صورت تو اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان مجبوء ہو اس لئے وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ میں کیا جانوں کہ میں کل کیا کروں گا۔ جو کچھ مجھ سے کرایا جائے گا وہی کچھ میں کروں گا۔

یہ دلیل بنیادی طور پر غلط ہے۔ انسان بے شک صاحب اختیار و ارادہ ہے، لیکن اس کا اختیار لامحدود نہیں۔ وہ بہت سے ایسے حالات سے مشروط ہوتا ہے جس کے متعلق وہ قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا اور بہت سے ایسے مؤثرات سے اثر پذیر ہوتا ہے

مستقبل کا علم

جس پر اسے انفرادی طور پر اختیار نہیں ہوتا۔ اگر انسان کسی ایسی دنیا میں رہتا جہاں نہ بیرونی حوادث اور واقعات اس کی زندگی کو متاثر کر سکتے اور نہ ہی دوسرے انسانوں کے اعمال حیات واقعات کا رخ موڑ سکتے، تو وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ میں مستقبل میں کیا کروں گا۔ لیکن انسان ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جہاں وہ قدم قدم پر خارجی حوادث اور معاشرتی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر سوال صرف خارجی کائنات کے حوادث کا ہوتا، تو بھی ہم کہہ سکتے تھے کہ کارگہ کائنات کے اسرار و غوامض کے متعلق جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جائے گا، وہ مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث کا علم قبل از وقت حاصل کر سکنے کے قابل ہو جائے گا۔ مثلاً جس طرح وہ آج یقین سے کہہ سکتا ہے کہ چاند یا سورج کہیں کب لگے گا، اسی طرح وہ زلزلہ کا وقت اور مقام بھی قبل از وقت متعین کر سکے گا لیکن انسان کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایسے (دیگر) انسانوں کے انہوہ میں گھرا ہوا ہے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے ارادے کا مالک ہے اور ان کے فیصلوں کا اثر دیگر افراد پر بھی پڑتا ہے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ امریکہ کی برسرِ اقتدار

آنے والی پارٹی یا وہاں کے صدر کا انتخاب اقوام عالم کی بساط سیاست کو ہلکرا اور دنیا کی منڈیوں کو کھپکا کر رکھ دیتا ہے۔ ایسی دنیا میں بسنے والا انسان، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ چاند کہہ سکتا ہے کہ میں کس وقت اور کہاں سے طلوع ہوں گا۔ سورج کہہ سکتا ہے کہ میں کس وقت اور کس نقطہ پر غروب ہوں گا۔ انسان بالیقین نہیں کہہ سکتا کہ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہوگی۔ اس سے انسان کے مجبور ہونے پر دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ اس سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ متمتد دنیا میں ایک فرد کا فیصلہ بہت سے ایسے عناصر سے مشروط اور ایسے عوامل سے محصور ہوتا ہے جن پر اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا اس لئے وہ مستقبل کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن کریم نے جو غور و فکر اور عقل شعور سے کام لینے کی اس قدر تاکید کی ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے، تاجحد امکان، احوال و ظروف کا اندازہ کرے اور مختلف عناصر و عوامل کا جائزہ لے لے۔ لیکن وہ ایسا تاجحد امکان ہی کر سکتا ہے، حتم و یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اب آئیے دوسری دلیل کی طرف کہ خدا لوگوں کے حال سے بھی باخبر ہوتا ہے اور مستقبل سے بھی۔
— کہا یہ جاتا ہے کہ مستقبل کے متعلق علم اسی شے کا ہو سکتا ہے جو مجبور ہو جس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ جس وقت جی چاہے اپنا ارادہ بدل دے، اس کے مستقبل کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے۔
علم خداوندی مثال کے طور پر، ایک ماہر علم الافلاک سوسال پہلے یہ (PREDICT) کر سکتا ہے کہ چاند کو گھن کب لگے گا، لیکن دس سائنٹسٹ بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکھی جو اس وقت یہاں بیٹھی ہے، اُڑنے کے بعد کہاں جا بیٹھے گی۔ لہذا، جب خدا جانتا ہے کہ انسان کل کیا کرے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ انسان صاحب اختیار نہیں، مجبور ہے۔

یہ دلیل ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ علم الہی کے مسئلہ کا تعلق، زمان (TIME) کے مسئلہ سے ہے اور فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے مسئلہ زمان، از حد پیچیدہ اور مشکل ہے جیسا کہ پیش لفظ میں کہا جا چکا ہے امیری کوشش یہ ہے کہ اس کتاب میں منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے اور ہر بات کو نہایت آسان اور سہل انداز میں پیش کیا جائے۔ بنابرین، ہم مسئلہ زمان کی پیچیدگیوں میں الجھے بغیر اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ انسانی علم اور علم خداوندی میں بنیادی فرق ہے۔ قرآن کریم نے، اختلاف لیل و نہار (رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے لئے)

کو عظیم نشانیاں (آیات) قرار دیا ہے اور گردشِ شمس و قمر کو حساب و شمار کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہی وہ ”حساب و شمار“ ہے، جس سے ہم وقت (TIME) کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ورنہ ”در حقیقت“ ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی وجود نہیں۔ نیند میں جب ہم اس گردشِ میل و نہار سے بے خبر ہو جاتے ہیں، تو وقت کا احساس ہی باقی نہیں رہتا۔ برگسان کے الفاظ میں، ماضی، حال اور مستقبل، وہ گڑھوں کے نشان ہیں جنہیں ہم نے محض بغیرِ سہولت، وقت کے گزر پر لگا رکھا ہے۔ خدا ان تعینات سے بلند ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک وقت کی یہ تقسیم اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اس کے سامنے (اقبال کے الفاظ میں) وقت ایک ”ابدی حال“ (ETERNAL NOW) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو مثال کے ذریعے بھی سمجھا نہیں سکتے کیونکہ ہم اپنے ہوش و خرد میں ہوتے ہوئے، وقت کے احساس سے بلند نہیں ہو سکتے۔ البتہ، مکان (SPACE) کے ضمن میں، ایک مثال سے بات (تھوڑی بہت) واضح کی جاسکتی ہے۔ ہم گھر کے صحن میں بیٹھے ہوں تو دیوار کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہو، وہ ہمارے لئے غیب ہو گا۔ یعنی ہماری نگاہوں سے اوجھل۔ لیکن جو شخص چھت پر بیٹھا ہو اس کے لئے پسِ دیوار واقعات، غیب نہیں بلکہ ”شہادت“ ہوں گے۔ یعنی آنکھوں کے سامنے واقع ہونے والی بات۔ خدا نے جب کہا ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی بلندیوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہے جہاں کوئی شے اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ جسے تم غیب کہتے ہو، اس کے نزدیک وہ بھی ”شہادۃ“ ہوتا ہے۔

جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، جب تک ہمارے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں، جب تک ہم عقل و شعور سے کام لیتے ہیں، ہم ماضی، حال اور مستقبل کے امتیاز سے بالا نہیں ہو سکتے۔ ہم اس امتیاز سے بلند اس وقت ہوتے ہیں جب ہمارے ہوش و حواس معطل اور عقل و شعور مفقود ہوں۔ اگر کوئی شخص بین دن تک مسلسل سویا رہے، تو جاگنے کے بعد وہ کبھی نہیں بتا سکے گا کہ اس دن کون سی تاریخ ہے۔ اور چھ مہینے یا سال بھر تک بے ہوش رہنے والا، مہینے اور سال تک کا تعین نہیں کر سکے گا۔ غالب نے اس حقیقت کو بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پر قیامت گذر گئی

مختصراً ہم عقل مشغور سے بیگانہ ہونے کے بعد ماضی، حال اور مستقبل کے تعینات سے بالا ہوتے ہیں۔ اسے ”بالا“ نہیں بلکہ بے خبر کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ لیکن خدا، اپنے کامل علم کے ساتھ ان تعینات سے بلند ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ازل سے ابد تک کا زمانہ (PRESENT) کی حیثیت رکھتا ہے۔

آسان ترین الفاظ میں بات سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ انسان، ہر آن اپنا ارادہ اور فیصلہ بدلنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن خدا کو اس کا علم ہوتا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ کیا بدلے گا۔ اس لئے انسان تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا لیکن خدا اسے جانتا ہے۔

پیش گوئیاں محض ظن و قیاس ہیں | لہذا، جو لوگ انسانوں کے مستقبل کے متعلق خبریں بتاتے (پیش گوئیاں کرتے) ہیں وہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔ جب انسان خود اپنے متعلق حتم و یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا، تو کوئی دوسرا انسان اس کے متعلق ایسا کس طرح کہہ سکتا ہے۔ انسانوں کے متعلق اس قسم کی خبریں دینے والوں سے کہئے کہ (انسان تو بہت بڑی چیز ہے) وہ ذرا یہ بتائیں کہ یہ مکھی جو اس وقت یہاں بیٹھی ہے، اس کے بعد اڑ کر کہاں بیٹھیگی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری پیش گوئیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ جب کوئی شخص مکھی کے متعلق اس قسم کی پیش گوئی نہیں کر سکتا تو صاحب ارادہ انسان کے متعلق (خدا کے سوا) کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل کیا کرے گا۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں

مختصراً اور کاہن | قرآن کہتا ہے کہ انسان کے دورِ طفولیت میں، کاہن، مبخّم، رنّال یہ دعوے کر کے کہ وہ آسمانوں کی خبریں لاتے ہیں، سادہ لوح انسانوں کو اپنے دامِ تزدیر میں گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ لیکن نزدِ قرآن کے بعد کے دور میں، جب انسانیت اپنے عہدِ شباب کو پہنچ رہی ہے، اس قسم کے دعوے کرنے والوں کو، علم کی بارگاہ سے ”آتشیں کوڑے“ (شہاباً رَصَدًا ۱-۸-۹۲) پڑیں گے۔

یہ درن (اسلام) کے دور کی باتیں تھیں۔ اس کے بعد جب دینِ مذہب میں تبدیل

ہو گیا تو خود ہمارے ہاں بھی، کاہنوں (پیشگوئیاں کرنیوالوں) دین مذہب میں بدل گیا | مہجنتوں، رتالوں، فال نکالنے والوں، کے عفریتی شکر

درائے اور وہ صاحبِ عزم و اختیار انسان، جس نے اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھ سے لکھنی تھی، اپنے ہاتھ دوسروں کو دکھا دکھا کر، اپنی قسمت معلوم کرنے کے چکر میں پھنس گیا۔ اقبال کے الفاظ میں۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو، ناخوب، بتدیج دہی، خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر



چوتھا باب

قانونِ مکافاتِ عمل

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ طبیعی کائنات میں قانونِ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) بطور اصولِ اساسی کار فرما ہے۔ اس کے ساتھ، دوسرا اساسی اصول، قانونِ وحدتِ کائنات (UNIFORMITY OF NATURE) ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قانونِ علت و معلول ساری کائنات میں یکساں طور پر کار فرما رہتا ہے۔ ایک سبب (CAUSE) جن حالات میں، کسی ایک مقام پر کسی ایک وقت، ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے، کائنات میں، جب اور جہاں وہ حالات موجود ہوں گے، وہ سبب ویسا ہی نتیجہ پیدا کرے گا۔ انسانی دنیا میں اس قانون کو، عالمگیر قانونِ مکافاتِ عمل کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کی دو سطحیں | انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک تو دیگر اشیائے کائنات کی طرح طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE)۔ اس میں انسان پر بھی وہی قوانین حاوی ہوتے ہیں جو دیگر حیوانات کو محیط ہوتے ہیں۔ انسانی بچے کی پیدائش، دیگر حیوانات کے بچوں کی طرح ہوتی ہے۔ جن عناصر و عوامل پر عام حیوانات کی زندگی اور نشو و نما کا دار و مدار ہے، انسان کی زندگی اور نشو و نما بھی انہی کی رہین منت ہے۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت، بیماری، سلسلہ تولید و تناسل، موت وغیرہ سب طبیعی قوانین کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ، حیوانات کی صورت میں جن بنیادی خصوصیات کو جبلت (INSTINCTS) کہا جاتا ہے، انہی بنیادی خصوصیات کا حامل انسان بھی ہوتا ہے۔ یعنی جذبہٴ تحفظِ خویش (SELF PRESERVATION) جذبہٴ

تغلب (SELF - AGGRESSION) اور جذبہٴ انفرانشن نسل (SELF - REPRODUCTION)

یہ جذبات بنیادی جبلتیں قرار دیئے جاتے ہیں اور عام حیوانات اور انسانوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔

لیکن انسانی زندگی کی ایک سطح اور بھی ہے، جو حیوانی یا طبعی زندگی سے بلند و بالا ہے۔ اس زندگی کا

حامل انسانی جسم نہیں ہوتا بلکہ ایک اور شے ہے جسے انسانی ذات یا نفس HUMAN PERSON

ALITY کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات، قوانین طبعی کے تابع نہیں ہوتی لیکن

انسانی ذات قوانین کے احاطہ سے یہ بھی باہر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک اور ضابطہ قانون ہوتا

ہے۔ جنہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ دیانت، امانت، صداقت،

جائز و ناجائز کی تمیز، حق و باطل کا امتیاز وغیرہ کا تعلق انہی اقدار سے ہے۔ انسانی اعمال میں ان

اقدار کے انعکاس (REFLECTION) کا نام کیرکٹر ہوتا ہے۔ حیوانات میں صرف (BEHAVIOUR)

ہوتا ہے، کیرکٹر انسانی زندگی کا خاصہ ہے۔

طبعی قوانین کا علم فطرت کے مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ وغیرہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن مستقل

اقدار خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور اب قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جس طرح

انسان کے طبعی افعال کا نتیجہ طبعی قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے، اسی طرح اس کے انسانی اعمال کا

نتیجہ مستقل اقدار سے متعلق قوانین کے مطابق نمودار ہوتا ہے۔ اسے عالمیگر قانون مکافات عمل کہا جاتا ہے۔

انسان کی جس منفرد خصوصیت کو اس کا اختیار و ارادہ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت انسانی ذات کی

خصوصیت ہے۔ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور

ان کی خلاف ورزی سے اس میں ضعف اور اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ نشوونما یافتہ ذات کی ایک

پہچان یہ بھی ہے کہ ایسے انسان کا ارادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہی نشوونما یافتہ ذات، طبعی جسم کی موت

کے بعد آگے چلتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ جس طرح انسان

کے طبعی افعال کا اثر اس کے طبعی جسم پر پڑتا ہے اسی طرح اس کے ان اعمال کا اثر، جن کا تعلق مستقل اقدار سے

ہے، اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اور یہ سب اثرات، قوانین خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

تین قسم کے قوانین

انسانی زندگی میں تین قسم کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔

(۱) طبعی قوانین جن کا تعلق انسان کے طبعی جسم سے ہوتا ہے۔

(۲) تمدنی قوانین، جنہیں حکومت کے قوانین یا معاشرہ (سوسائٹی) کے آداب و دساتیر کہا جاتا

ہے۔ اور

(۳) مستقل اقدار (یا اخلاقی قوانین) جن کا تعلق انسانی ذات سے ہوتا ہے۔ ان ہر قسم دوائر حیات

میں انسان اپنے افعال و اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کی یہی ذمہ داری ہے جس کی بنا پر وہ ان کے

نتائج و عواقب کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے۔ پہلے دو دوائر میں ایسا ہو سکتا ہے (اور ایسا ہوتا ہے)

کہ ایک فرد کو ایسے امور کے نتائج بھی بھگتنے پڑتے ہیں جن کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا۔ مثلاً راہ

چلتے چلتے، کوئی شخص اسے دریا میں دھکا دے دیتا ہے اور وہ ڈوب کر مر جاتا ہے۔ یا چانک وہ پُل ٹوٹ

جاتا ہے جس پر سے وہ گزر رہا تھا۔ یا مثلاً نظم و نسق کی خرابیوں کی وجہ سے ملک میں فحط پڑ جاتا ہے۔

سیلاب آ جاتا ہے۔ یا کسی وجہ سے جنگ چھڑ جاتی ہے۔ ان امور کا ذمہ دار کوئی فرد واحد نہیں ہوتا لیکن افراد

معاشرہ کو ان کے عواقب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن تیسرا دائرہ (جس تعلق انسانی ذات سے ہے) ایسا ہے جس میں ہر فرد اپنے اعمال کا

ذمہ دار آپ ہوتا ہے اور ان کا خمیازہ اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ اس خمیازہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس کے

ہر عمل (حتیٰ کہ اس کے خیالات تک) کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی کو اس کا

اعمال نامہ کہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ دیکھئے کہ انسان کے اجتماعی اعمال ہوں یا انفرادی، قرآن کریم ان سب

کا ذمہ دار انسان کو قرار دیتا ہے۔ ان میں کوئی دائرہ بھی ایسا نہیں جس میں وہ یہ کہتا ہو کہ انسان مجبور

واقع ہوا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی اس تقدیر یا قسمت کے مطابق ہوتا ہے جو پہلے سے طے شدہ،

مقرر یا لکھی ہوئی ہے۔ انسان (انفرادی یا اجتماعی طور پر) اپنے اختیار دار وہ ہے ایک

فیصلہ کرتا ہے اور اس فیصلہ کے مطابق عمل۔ اور اس کے عمل کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قوانین

کے مطابق مرتب ہو جاتا ہے۔ طے شدہ یا مقرر یا پہلے سے لکھا ہوا، قانون مکافات عمل ہے۔ اُسے (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ”تقدیر خداوندی“ کہا جائے گا، نہ کہ انسان کی تقدیر۔ باقی رہی اس کی ”قسمت“ سو اس کی قسمت یا نصیب اس کے اعمال کے وہ نتائج ہوتے ہیں جو تقدیر الہی (قوانین خداوندی) کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

ان امور کی تفصیل آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آئے گی۔

(۱) نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا (۲/۲۱)

تمہارا نصیب تمہارے اپنے اعمال سے مرتب ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ أَسْأَطَتْ بِهَا حَظِيَّتَهُ فَاُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ..... (۲/۸۱)۔ جس کسی نے بھی غلط کام کئے اور اس کی خطاؤں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تو یہ لوگ اہل جہنم ہیں۔ ان کی امیدوں کی کھیتیاں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ..... (۲/۸۲)۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے صلاحیت بخش کام کئے تو وہ اہل جنت ہیں۔

دوسری جگہ ہے..... ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ..... (۲/۲۸۱)۔ جو کچھ کوئی کرتا ہے اسے اس کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے (نیز ۲/۲۲، ۳/۱۶، ۴۰/۱۷)۔ لیکن اس میں انسان کا ارادہ ضروری ہے۔ وَلَٰكِنْ يُوَفَّ أَخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ..... (۲/۲۲۵)۔ مواخذہ اس پر ہوگا جو اپنے دل کے ارادے سے وہ کام کرے۔ جو کام کسی سے جبراً کرایا جائے اس کا وہ ذمہ دار قرار نہیں پاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک آیت ہی اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے انسان صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے، مجبور نہیں۔

سورہ انعام میں ہے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ج وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ج..... (۶/۱۶۵)۔ جو شخص کوئی کام کرتا ہے اس کا خمیازہ وہی بھگتا ہے۔ یاد رکھو۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ہر ایک اپنا اپنا

بوجھ اٹھاتا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داری کی بابت مسئول ہوتا ہے۔ اسی کا اعادہ دیگر مقامات میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۵/۱۷۱ : ۱۸/۳۵ : ۲۹/۷ : ۳۸/۵۳)۔

سورۃ النجم میں ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ سعی و عمل کرے۔ وہ اپنی محنت کے ثمرات کا مستحق ہے۔ لَتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ (۲۰/۱۵)۔ صحیح معاشرہ کا قیام اس لئے ضروری ہے تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل سکے۔ فَالَّذِي كَفَرَ اَن يَّسْعِيَهُ (۲۱/۹۴)۔ کسی کی محنت بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔ وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا (۷۶/۲۲)۔ تمہاری محنت بھرپور نتائج برآمد کر سکے۔ (۱۸-۱۷/۱۷۱)۔

افراد کی طرح اقوام کی زندگی کے لئے بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۳۴)۔ تمہارے اسلاف (اقوام گذشتہ) نے جو کچھ کیا اس کا خمیازہ انہوں نے بھگتا۔ جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے۔ تم سے اتنا بھی نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (نیز ۲/۱۳۱)۔ اس لئے کہ قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ ہر شخص صرف ان اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ہے جنہیں وہ خود کرتا ہے۔ اچھے کاموں کے اچھے نتائج۔ بُرے کاموں کے بُرے۔ ذٰلِ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ (۲/۷۹)۔ لوگوں پر تباہیاں ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ محقر یہ کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۲۸)۔ ہر شخص اپنے اعمال کے ہاتھوں گرد ہے۔ اس نے اپنے اعمال کے بدلے میں اپنے آپ کو رہن کر دیا ہوا ہے۔

(۲) جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۴﴾

جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے

قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا کوئی عمل (صحیح یا غلط) اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طبعی دنیا اور خود انسان کی طبعی زندگی میں چونکہ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے اس میں نہ کوئی مغالطہ ہوتا ہے، نہ شک و شبہ۔ جو آگ میں اُنکلی ڈالتا ہے اس کی انگلی جل جاتی ہے۔

جو بانی پیتا ہے اس کی پیاس بجھ جاتی ہے لیکن مستقل اقدار کے سلسلہ میں چونکہ انسانی اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے نہیں آتے اس لئے یہ سمجھنے میں دشواری ہو جاتی ہے کہ ان کے نتائج فی الواقعہ مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں۔ روٹی کھانے سے بھوک مٹ جاتی ہے، اسے تو ہر شخص جانتا ہے، لیکن یہ کہ رزقِ حرام (پوری اور بے ایمانی سے حاصل کردہ روٹی) سے انسانی ذات کی تباہی ہو جاتی ہے، اسے جاننا مشکل ہے۔ مادی نظریہ حیات چونکہ انسانی ذات کا قائل ہی نہیں، اس لئے وہ اقدار کے نتائج کو بھی نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک قوانین صرف وہی ہیں جنہیں سوسائٹی تسلیم اور نافذ کرتی ہے اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سوسائٹی کے نظامِ عدل کی رو سے سامنے آسکتے ہیں۔ جو کام سوسائٹی کی نگاہوں سے اوجھل رہیں، یا جو امور سوسائٹی کے قوانین کی رو سے جرم ہی نہ ہوں، ان کے نتائج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جو اس وقت ساری دنیا میں جرائم عام ہو رہے ہیں اور دھوکا دہی، فریبکاری، بددیانتی، سلب و نہب، غضب و استھصال کی وباؤں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں انسانی ذات کا یقین باقی نہیں رہا۔ ان کے نزدیک زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے لیکن قرآن کریم کی ساری تعلیم کا محور انسانی ذات پر ایمان ہے اس لئے اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ انسان کا کوئی عمل۔

دنیا میں جرائم کی کثرت کا بنیادی سبب

خواہ اس کا تعلق اس کی طبعی زندگی سے ہو اور خواہ اس کی ذات سے۔ بے نتیجہ نہیں رہتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کارگر کائنات اسی مقصد کے لئے سرگرم عمل ہے کہ انسان کا کوئی کام نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہے۔ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَرَبُّهُ يَوْمَ يُكْفِىُ بِكُمَا كَسْبَتُ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۳۵/۲۲)۔ اللہ نے کائنات (ارض و سموات) کو بالحق پیدا کیا ہے اور اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے کاموں کا ٹھیک ٹھیک بدلہ مل جائے اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے وَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ رِيحٌ يَجْزِي الَّذِينَ يَسْتَوُونَ ۝ (۵۳/۲۱)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے تاکہ غلط روش اختیار کرنے والوں کے کاموں کا نقصان رساں نتیجہ ان کے سامنے آجائے اور اچھے کام کرنے والوں کا خوشگوار نتیجہ۔ سورہ یونس

میں ہے کہ خدا کا تخلیقی پروگرام — یعنی اشیائے کائنات کو پہلی بار وجود میں لانا (مبداء) اور پھر انہیں گردش دے دے کرنی نئی ہیئت میں تبدیل کرنا، معاد اس لئے ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار حیات کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، انہیں ان کاموں کا بدلہ عدل و انصاف کے مطابق مل جائے اور جو لوگ ان سے انکار کریں اور سرکشی بریں، ان کا انجام تباہی ہو (۱۰/۴)۔ اسی کا اعادہ (۱۱/۷) (۱۸/۷) (۶۷/۲) میں کیا گیا ہے۔

سورہ نسا میں ہے کہ مَنْ يَتَعَمَلْ سُوءًا يَجْزِ بِهٖ (۴/۱۲۳)۔ جو شخص بھی کوئی غلط کام کرے گا، اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۵/۸۲) ۹/۹۵ ۱۴/۵۱ ۹۷/۹۷ ۱۶/۹۷ ۴۰/۱۷ جو کچھ بھی انسان کے سامنے آتا ہے وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

کہیں کہا گیا ہے کہ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۳/۳۳)۔ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا۔ اس کا اعادہ مختلف مقامات میں کیا گیا ہے۔ مثلاً ۷۱/۷ ۵۲/۱۶ ۵۶/۲۴ ۵۷/۳۶ (۸۳/۳۶) کسی جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے کہ اِنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلًا مِّنْکُمْ مِّنْکُمْ..... (۳/۱۹۷)۔ خدا کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔ کہیں کہا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۳/۹۰) (۳/۱۳۴)۔ جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں خدا ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

میزانِ عمل | اسی بنیادی اصول کو سمجھانے کے لئے کہا کہ انسان کے ہر عمل کا وزن ہوتا ہے اور وزن کرنے کے لئے میزانیں (وہم کاٹنے) کھڑی کی جاتی ہیں۔ جن میں اعمالِ انسانی کا ذرہ ذرہ تلتا ہے۔ وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لَیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا..... (۲۱/۴۷)۔ اور ہم ظہورِ نتائج کے وقت، عدل کی میزانیں کھڑی کریں گے اور اس طرح کسی شخص پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوگا۔ جن لوگوں کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکتا ہو گا ان کی زندگی خوشگوار ہوگی۔ جن کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ (۲۳/۱۰۳)۔ ہر انسانی عمل کا ذرہ ذرہ ترازو میں ٹل جائے گا۔ (۳۱/۱۶) (۳۲/۳) (۷۹/۸) (۵) (۱۰/۷)۔

اعمال تو لے جائیں گے اور وزن کی پرچی ہر ایک کے ہاتھ میں دے دی جائے گی کہ وہ دیکھ لے کہ

اس کا حساب کیا ہوا ہے۔ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ۹۴/۱۰۵ : ۹۴/۱۰۶ : ۹۴/۱۰۷۔ اس حساب کی رو سے، جس نے اپنی ذات کی مناسب نشوونما کر لی ہوگی اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی۔ جس نے اسے بہت جذبات سے دبا کر، بڑا مردہ کر دیا ہوگا، وہ تباہ ہو جائے گا۔ (۹۴/۱۰۶ : ۹۴/۱۰۷)۔

ان قرآنی نصوص کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے یا وہ ایک ایسی مخلوق نظر آتا ہے جسے اپنے کسی کام پر کوئی اختیار نہیں اور جو کچھ اس کے لئے طے کر دیا گیا ہے وہ طوعاً کرہاً اسے (ایک مقین) کی طرح سرانجام دیتے جاتا ہے؟

مجبور کے کام کی جزا اور سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔



(۳) اِقْرَأْ كِتَابَكَ (۱۱۶)

تو اپنا اعمال نامہ پڑھ

اوپر جس حقیقت کو ترازو کی مثال سے سمجھایا گیا ہے، قرآن کریم کے دیگر مقامات میں اسے اعمال نامہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ کہا کہ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ ۝ ۹۴/۱۰۶ : ۹۴/۱۰۷۔ انسان جو کچھ کہتا ہے ہم اسے لکھ لیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ ہم نے انسان کے آگے پیچھے محافظ اور نگران مقرر کر رکھے ہیں جو اس کے تمام اعمال کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ (۱۱۶/۱۱ : ۱۱۶/۱۲)۔ دوسرے مقام پر انھیں کراما کا تبین کہا گیا ہے۔ (۱۱۶/۱۱)۔ نہایت معزز لکھنے والے۔ یہ ریکارڈ کہیں چھپا کر نہیں رکھا گیا۔ یہ ایک کتاب مبین (۱۱۶/۱۱) کھلی ہوئی اور واضح کتاب ہے

یہ کتاب مبین کہیں باہر نہیں رکھی۔ خود انسان کے سینے میں ہے۔ سورہ نبی اسرار میں ہے کہ ”ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے کلمے میں لٹکا ہوا ہے۔“ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے۔ ظہور نتائج کے وقت اسے کھول دیا جائے گا اور انسان سے کہا جائے گا کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ۔ تو اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھ۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْنَكَ حَسِيبًا (۱۱۶/۱۳)۔ خود پڑھ لے اور اپنا حساب بھی آپ ہی کر لے۔ تو اپنا حساب کر لے کے لئے آپ کافی ہے۔ اس فہرست جرائم کے ثبوت میں کسی خارجی گواہ کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ انسان اپنے خلاف خود آپ گواہی دے گا اور اپنے غلط اعمال

کے جواز میں خود فریبی کے جھوٹے بہانے، جنہیں وہ اس سے پہلے تراش کر تا تھا، ان کی خود ہی تردید کر دے گا۔ (۴۵/۱۴)۔

یہ ہے وہ ریکارڈ جس کے متعلق کہا کہ وَكَذٰلِكَ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳/۶۲)۔ ”ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچی سچی بات کہہ دیتی ہے۔ کہیں غلطی نہیں کرتی۔“ اور یہی وہ کتاب ہے جسے دیکھ کر مجرم چیخ اٹھے گا (۱۱۸/۴۹)۔ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَلِيْنَتْنِيْ كُنْتُ تَوَّابًا ۝ (۷۸/۴۰)۔ اور بصد حسرت ویاس کہے گا کہ اے کاش! میں ذی شعور، صاحب اختیار و ارادہ انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودہ ہوتا تو اس مواخذہ سے بچ جاتا! — مواخذہ تو صاحب اختیار و ارادہ انسان کا ہوتا ہے، پیکر ان گل کا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان کا ہر عمل — حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک (۴۰/۱۹) — کے اثرات محفوظ رہتے ہیں اور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ انسان کا اعمال نامہ اس کے اپنے ہاتھ کی دستاویز ہوتی ہے جسے وہ اپنی ذات کی لوحِ مبین پر نقش کرتا رہتا ہے۔ وہ دنیا میں ایک صاف سیلٹ، لوحِ سادہ لے کر آتا ہے اور پھر اس پر ”اپنی تقدیر“ آپ لکھتا رہتا ہے۔ اِقْبَالَ کے الفاظ میں

تو اپنی سر نوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامہ حق نے تیری جبین

(۱۴) اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (۱۶۱)

اعمال کے نتائج غیر منتقل ہوتے ہیں

جب عمل کا مدار ہر شخص کے اپنے اختیار و ارادہ پر ہو، تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں بھی کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی آپ اس نتیجہ (جزا و سزا) کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آپ اپنی کمائی (روپیہ پیشہ) تو دوسروں کو دے سکتے ہیں اور عند الضرورت دوسرے

لے بھی سکتے ہیں، لیکن اگر آپ ہر روز صبح، سیر کو جائیں اور اس سے آپ کی صحت اچھی ہو جائے تو آپ اپنی اچھی صحت کو کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے، نہ ہی آپ کسی دوسرے کی صحت مستعار لے سکتے ہیں۔ اسی طرح، آگ میں انگلی ڈالنے سے جلن کی جو تکلیف آپ کو ہوگی، اسے آپ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے۔ نہ کسی کی سفارش آپ کو اس سے نجات دلا سکتی ہے۔ نہ ہی آپ کسی کو کچھ دے دلا کر اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں اعمال کے وہ نتائج جو نہ کسی کی طرف منتقل کئے جا سکتے ہیں، نہ کسی سے مستعار لئے جا سکتے، ”صحت“ کی مثال تو ہم نے محض سمجھانے کی خاطر دی ہے۔ دراصل کہنے کی بات یہ ہے کہ اعمال انسانی کے جو اثرات فرد متعلقہ کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں، وہ ناقابل انتقال ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) عمل کا مدار انسان کے ارادہ پر ہوتا ہے اور جب ایک فرد کے ارادے کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا، تو اس کے نتیجے میں کوئی اور کیسے شریک ہو سکے گا؟ اسے انسانی ذات کی انفرادیت (INDIVIDU-ALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مجبور کا اپنا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے کسی عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر کیسے مرتب ہو سکتا ہے؟ اس نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو مجبور، خود اپنے عمل کے نتیجے کا بھی مستحق یا سزاوار نہیں ہوتا، چہ جائیکہ کوئی دوسرا اس میں شریک ہو۔

صاحب اختیار و ارادہ انسانی ذات کی اس انفرادیت کے متعلق قرآن کریم نے متعدد مقامات پر تصریح کی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ **إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ** **وَأِنْ أَسَاءْتُمْ فَكَرِهًا** (۱۷/۷)۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ بھی تمہاری اپنی ذات کو ہوگا اور اگر غلط کام کرو گے تو ان کا نقصان بھی تمہیں ہی اٹھانا ہوگا۔ **مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ** **وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا** (۴۱/۴۲)۔ جو صلاحیت بخش کام کرتا ہے اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو ہوتا ہے۔ جو تخریبی کام کرتا ہے اس کا وبال بھی اس کے اپنے اوپر پڑتا ہے۔ **وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ** **لِّلْعَبِيدِ** (۴۱/۴۶)۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ (نیز ۲۵/۱۵) **وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ** (۲۹/۶)۔ جو بھی جدوجہد کرتا ہے وہ اپنی ذات کے لئے کرتا ہے۔ سورہ یونس میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ** (۱۰/۲۳)۔ اے لوگو!

انسان! تم اگر قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتو گے تو اس کا نقصان تمہاری اپنی ذات کو ہو گا۔ (نیز ۱۱/۴)۔ سورۃ انعام میں ہے۔ قَدْ جَاءَكُمْ بِصَاحِبٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَنْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَ مَنْ عَصَىٰ فَعَلَيْهَا ۖ (۶/۱۰۵)۔ تمہاری طرف، تمہارے رب کی جانب سے واضح اور روش راسخ آگئے ہیں۔ سو شخص آنکھیں کھول کر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہو گا۔ اور جو اندھوں کی طرح آنکھیں بند کر کے چلے گا، تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے کہ ”اے نوبع انسان! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے۔ پس جو کوئی اس کے پیش کردہ صحیح راستے پر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہو گا۔ جو اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے (غلط) راستے اختیار کر لے گا، اس کا نقصان وہ خود اٹھائے گا۔ (نیز ۱۵/۱۴، ۲۴/۳۰، ۳۱/۱۲)۔

اسی سکتہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ صاحب اختیار و ارادہ انسان کے عمل کے جو نتائج اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں، وہ کسی دوسرے کے مثلے مت نہیں سکتے۔ بالفاظِ دیگر، جزا اور سزا کے معاملہ میں کوئی دوسرا دخلت کر ہی نہیں سکتا۔ اس حقیقت کی وضاحت قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر کی ہے۔ مثلاً (۲/۲۸) میں کہا گیا ہے کہ ”اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ نہ ہی اس معاملہ میں شفاعت (سفارش) کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نہ ہی کوئی شخص کچھ دے دلا کر

یہ کاروباری معاملہ نہیں

اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ نہ ہی کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے۔“ (نیز ۱۳۳/۲)۔ دوسری جگہ ہے کہ نتائجِ اعمال کا معاملہ، کاروباری نہیں ہے کہ انہیں قیمتاً خرید لیا جائے۔ نہ ہی اس باب میں کسی کی دوستی کام آ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کسی کی شفاعت کر سکتا ہے۔ (۲/۲۵۴)۔ اور اس باب میں کسی کی استثنائے نہیں۔ حتیٰ کہ، اور تو اور، خود حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (۱۵/۱۰۹)۔ اگر میں بھی ان قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے نتیجہ سے مجھے بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے خائف ہوں۔

انسانی ذات کی یہی انفرادیت تھی۔۔۔ یعنی ہر ایک کا اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہونا۔۔۔ جس کے پیشِ نظر نبی اکرمؐ نے اپنے مخالفین سے بر ملا کہہ دیا کہ اس بارے میں جھگڑا کرنے کی کیا

ضرورت ہے۔ دَلَنَّا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (۲/۱۳۹)۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ لَا تَسْأَلُونَنَا اَجْرًا وَلَا تَسْأَلُوا عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (۲۴/۲۵)۔ نہ تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے کون کون سے جرائم کئے۔ نہ ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا۔ لَكُمْ دِينُكُمْ دَلِيٌّ دِينِ ۝ (۱۰۹/۶)۔ تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے لئے ہمارے اعمال کے ہمارے لئے۔ يٰٓ اَعْمٰلُ عَلٰی دَلٰلَتِكُمْ عَلٰیكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْءُونَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا بِرَبِّیْ رَمِيًّا تَعْمَلُونَ ۝ (۱۰/۴۱)۔ میرے اعمال میرے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم میرے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ میں تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔

اعمال کے نتائج کا ذمہ دار تو اس کو قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے ان اعمال کا مرتکب ہوا ہو۔ جس سے مجبوراً کوئی کام کرایا جائے وہ اس کا ذمہ دار کس طرح ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس معاملہ میں خدا بھی دخل نہیں دیتا۔ البتہ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ کون کس قسم کا کام کرتا رہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ ۝ (۲/۲۳۷)۔ ”خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔“ وہ ان سے باخبر ہے۔ (۲/۲۳۸)۔ کسی کا کوئی کام بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ (۲/۱۴۴)۔ حَتّٰی كَلَّمَ اللّٰهُ يٰعِلْمُ مَا رَفِیْ اَنْفُسِكُمْ (۲/۲۳۵) جو کچھ تمہارے دل میں ہوتا ہے، اللہ کو اس کا بھی علم ہوتا ہے۔

”خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے“ سے مراد یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے باہر نہیں رہ سکتا۔ انسان کا ہر عمل اس کے دائرے کے اندر ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِیْطٌ (۳/۱۱۹)۔ اسی لئے انسان کا کوئی کام بھی نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہر ایک کو اپنے اعمال کا نتیجہ خود بھگتنا پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

پانچواں باب

مصائبِ اَلام

اس قسم کے واقعات آپ کے سامنے آئے دن آتے رہتے ہیں۔ مثلاً،
(۱) اگر کوئی مریض شفا یاب ہو جائے تو اس کے لواحقین بڑے فخر اور مسرت سے کہیں گے کہ ہم نے اس کے علاج کے لئے بڑی دھڑ دھوپ کی۔ فلاں حکیم کا علاج کیا۔ فلاں ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ آخر الامر اسے فلاں دوائی سے آرام آیا۔

لیکن اگر وہ مریض مر جائے تو کہا جائے گا کہ ہم نے اپنی طرف سے تو بہت کوشش کی۔ اس کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔ کیا کیا جائے۔ وہاں دم مارنے کی جا نہیں۔
(۲) اگر لڑکا امتحان میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی محنت کا ثمر ہو گا لیکن اگر وہ فیل ہو جائے تو کہا جائے گا کہ اس نے تو اپنی طرف سے بڑی محنت کی تھی لیکن خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔

(۳) اگر مقدمہ میں کامیابی ہو جائے تو اسے اپنے حسن تدبیر اور وکیل کی محنت اور مہارت کا تصدق ٹھہرایا جائے گا، لیکن اگر اس میں ناکامی ہو جائے تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیا جائے گا کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔

(۴) حتیٰ کہ اگر کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہو تو اس پر جشنِ مسرت منایا جائے گا اور اگر علی التواتر دو تین

لڑکیاں گھر میں آجائیں تو

کامیابی اپنی کاریگری سے، ناکامی خدا کی مرضی سے

دلایا جائے گا کہ اچھا بہن! صبر کرو۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ اس پر کسی کا زور تھوڑا چل سکتا ہے،

یعنی انسان اپنے آپ کو شکست اور ناکامی کی صورت میں مجبور تصور کرتا، اور ایسے واقعات کو خدا کی مرضی پر محمول کرتا ہے، لیکن کامیابیوں اور کامرانیوں میں وہ اپنے آپ کو مجبور نہیں محسوس کرتا۔ انھیں اپنی ہنرمندی اور کاریگری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ جب انسان نے اپنے عہد طفولیت میں اپنے آپ کو اپنے نامساعد ماحول کے مقابلہ میں بے بس پایا تھا تو اسے کسی فوق الفطرت قوت کا خیال آیا تھا۔ لہذا، شکست اور ناکامی میں اپنے آپ کو مجبور تصور کرنا اور مصائب و آلام کو خدا کی طرف منسوب کرنا، ذہن انسانی کے انہی ابتدائی نقوش کے اثرات ہیں، جنہیں ”مذہب“ نے زندہ رکھ چھوڑا ہے۔ اور اس کی تائید اس قسم کی ”مقدس سندوں“ سے کرتا رہتا ہے کہ عَرَفْتُ اَنْفَلَهٗ بِفَسْحٍ اَنْحَزَ اَيْمٰنُهٗ میں نے اللہ کو اپنی اسکیمنوں کے ناکام رہ جانے سے پہچانا ہے اور چونکہ درد و غم اور حزن و ملال، مشرقی شاعری کی جان ہیں، اس لئے شعراء اس قسم کے تصورات میں یہ کہہ کر اور بھی زہر بھر دیتے ہیں کہ ۷

جو نہیں آشنا مصیبت کا درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کوڑیا

وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے

اُسے معلوم کیا خدا کیا ہے

اور اس کے بعد تصوف نے اس میں ایسی رنگ آمیزی کی کہ یہ عقیدہ، ایک ”مسلمہ حقیقت“ بن گیا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ خدا کا دین اس باب میں کیا کہتا ہے۔

مصیبت کے معنی | **مُصِيبَةٌ** عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (ص۔ و۔ ب) ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اترنا اور اتر کر اپنے مستقر تک جا پہنچنا۔ اس اعتبار سے، ہر واقعہ یا حادثہ کو ”مصیبت“ کہا جائے گا لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (مُصِيبَةٌ) حَسَنَةً کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۹/۵۰)۔ اس لئے، عام طور پر اس کے معنی ناخوشگوار واقعہ کے لئے

۱۷ اس قول کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ یہ، صوفیاء میں سے کسی کا قول نظر آتا ہے۔

جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مصائب و آلام (ناخوشگوار واقعات) خدا کی طرف سے ظہور پذیر ہونے ہیں یا یہ انسان کے اپنے (انفرادی یا اجتماعی) اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم اس سوال کا جواب بڑی وضاحت سے دیتا ہے۔

سورہ شوریٰ میں ہے۔ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ

(۳۰/۴۲)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے

مصائب اپنے اعمال کا نتیجہ

اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ان پر

جب کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ آتٰی هٰذَا۔۔۔ یہ کیسے آگئی، اس کا ذمہ دار کون ہے۔ کہا کہ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ (۱۴۳/۱۳)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں۔ خود تم ہو۔ سورہ نحل میں ہے۔ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا (۳۶/۱۶)۔ خود ان کے بُرے اعمال، مصیبتیں بن کر ان کے سامنے آ گئے۔

غلط کاموں کے نتائج برآمد ہونے کے لئے خدا کا مقرر کردہ طریق یہ ہے کہ پہلے یہ نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ایک مدت کے بعد وہ محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں (اسے مُہلت

کا وقفہ یا قانونِ تدریج و امہال کہا جاتا ہے)۔ سورہ زمر میں ہے، یہ لوگ

مُہلت کا وقفہ

اس وقت اپنی من مانی زندگی بسر کر کے خوش ہو رہے اور قوانینِ خداوندی

کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وَبَدَّ إِلَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِمِ كَسْتَهْزِئُونَ (۳۸/۲۹)۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس کے نتائج ابھر کر ان کے سامنے آجائیں گے۔ اور جس قانونِ مکافات کی یہ مہنسی اڑا رہے ہیں، وہ انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

قرآن کریم نے عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کے لئے ایک

بڑی معنی رس اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عمل پہلے سزا دہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بعد میں

سامنے آتا ہے۔ قرآن اُسے یوں سمجھاتا ہے گویا انسان اس نتیجہ کو اپنی روانگی سے پہلے آگے بھیج دیتا ہے۔

وہ آگے جا کر اس کا انتظار کرتا ہے اور جب یہ، اس کے بعد وہاں پہنچتا ہے، تو اسے اپنے سامنے کھڑا

پاتا ہے۔ اس کے لئے اس کی اصطلاح ہے بِمَا قَدْ مَتَّ أَيْدِيهِمْ۔ جو کچھ ان کے

ہاتھ ان کے لئے پہلے سے آگے بھیج دیتے ہیں۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ جو جرائم یہ لوگ اس وقت کر رہے ہیں ہم انہیں ایک ایک کر کے نکھتے چلے جا رہے ہیں۔ جب یہ سفر زندگی میں آگے بڑھیں گے تو ان کے نتائج ان کے سامنے آجائیں گے۔

اس وقت ان سے کہا جائے گا۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ **بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَكُمْ** (۲/۱۸۱)۔ یہ نتائج (مصائب)

کہیں خارج سے نہیں ٹپک پڑے۔ یہ وہی ہیں جنہیں تم نے پہلے سے بھیج رکھا تھا یہ آگے آگے آئے ہیں۔ تم ان کے پیچھے پیچھے آئے ہو۔ دوسری جگہ انہیں مَا أَسْلَفْتُمْ کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۰/۳۰)۔ یعنی جو اس راستے سے تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

سورۃ حج میں ہے کہ ان لوگوں کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوں گے

اور آخرت میں بھی تباہ و برباد۔ اور جب ان کی یہ حالت ہو گی تو ان سے کہا جائے گا، ذٰلِكَ بِمَا

قَدَّمْتُمْ يَدَايَ (۲۲/۱۰)۔ یہ وہی کچھ تو ہے جو تم نے اپنے لئے پہلے بھیجا تھا۔ سورۃ قصص

میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں

اپنے لئے پہلے سے بھیجا ہوتا ہے تو یہ چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں۔ (۲۸/۲۴)۔ نیز (۴/۶۲)۔

سورۃ روم میں ہے کہ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں کامیابیاں اور خوشگواریاں نصیب ہوتی

ہیں تو ان پر اتراتے ہیں اور جب مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو سخت مایوس اور افسردہ ہو جاتے

ہیں حالانکہ انہوں نے یہ مصیبتیں اپنے لئے خود اپنے ہاتھوں پہلے سے بھیج رکھی تھیں۔ (۳۰/۳۶)۔

[اس کا اعادہ (۲۲/۲۸) میں بھی کیا گیا ہے]۔ سورۃ الفجر میں ہے کہ جب انسان اس تباہی

کو اپنے سامنے دیکھے گا جو مرگ آفریں ہو گی تو با صد حسرت و یاس پکارے گا کہ لَيْلَتُنِيْ

قَدَّمْتُ لِخَيَاتِيْ (۸۹/۲۴)۔ اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے سے

کچھ بھیج رکھا ہوتا۔

مصائب و آلام ہی نہیں بلکہ زندگی کی جو خوشگواریاں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، انہیں بھی

اس نے اپنے لئے پہلے سے بھیج رکھا ہوتا ہے۔ سورۃ مزمل میں ہے۔ وَ مَا تُقَدِّمُوا

لَا تَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (۴۳/۲۰)۔ جو خوشگواریاں بھی تم

اپنے لئے پہلے سے بھیج دے، انہیں تم اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔

مندرجہ بالا آیات میں بِمَا قَدْ مَتَّ اَيْدِيَكُمْ کہا گیا ہے۔ یعنی جو کچھ تمہارے ہاتھوں نے پہلے سے بھیجا ہو۔ بعض مقامات میں مَا قَدْ مَتَّ لَكُمْ اَنْفُسَهُمْ کہا گیا ہے (۵/۸) یعنی جو کچھ ان کی ذات نے ان کے لئے آگے بھیج رکھا ہے۔ قرآن کریم، انسانی اعمال کا ذمہ دار اس کی ذات کو قرار دیتا ہے جو اس کے اختیار و ارادہ کا سرچشمہ ہے۔ اور اس لئے اس کے اعمال کے نتائج کی سزاوار بھی اس کی ذات ہی کو قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ وَلَتَنْظُرُنَّ نَفْسٌ مَّا قَدْ مَتَّ رِجْلُكَ (۵۹/۱۸)۔ انسانی ذات کو چاہئے کہ وہ دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے؛ ظہور نتائج کے سلسلہ میں کہا کہ عَلِمْتَ نَفْسٌ مَّا قَدْ مَتَّ وَ اَخْرَجْتَ (۸۲/۵)۔ اس وقت ہر ذات کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کیا کچھ آگے بھیجا ہے اور کیا کچھ پیچھے چھوڑ آئی ہے، اس لئے کہ یہ سب کچھ اس کے ”نامہ اعمال“ میں درج تھا۔ سورہ یسین میں ہے کہ وَ نَكْتُبُ مَا قَدْ مُوَاَدَّ اَثَامِهِمْ (۳۶/۱۲)۔ یہ لوگ، سفر زندگی میں، اپنے جو نقوش قدم پیچھے چھوڑتے ہیں اور جو کچھ آگے بھیجتے ہیں، ہم ان سب کو بکھتے جلاتے ہیں۔ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِينٍ (۳۶/۱۲)۔ اور ہر شے کا اندراج ایک واضح صحیفہ میں ہوتا رہتا ہے جو ان کے آگے آگے چلتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، انسان پر جو مصیبت بھی آتی ہے، وہ اس کے اپنے (انفرادی یا اجتماعی) اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سورہ بقرہ میں: بنی اسرائیل کی تباہی کے سلسلہ میں کہا گیا ہے وَفِيْ لَّهْمُ يَمَتًا يَكْسِبُوْنَ (۲/۷۹)۔ ان کی تباہی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی۔ وہ ہلاک اس لئے ہوئے کہ وہ ظالم اور فاسق تھے۔ (۲/۵۹)۔ وہ ذلت و خواری کے عذاب میں مانوڑ ہوئے کیونکہ انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ (۲/۶۱ ز ۳/۱۱۱)۔

اور ایک بنی اسرائیل ہی کی کیا تخصیص ہے، یہ خدا کا عالمیگر قانون ہے کہ ذلت و خواری

انسان کے اپنے غلط اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے ہر وہ قوم جس کی کیفیت یہ **ذلت و خواری** ہو کہ وہ ضابطہ قوانین کے ایک حصہ کو مانے اور دوسرے حصے کے ماننے سے

انکار کر دے، اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ خِزْيٌ فِي الْخَيُولِ الدُّنْيَا دَيُّوْمَ الْفَيْلَةِ مِيْزُوْنٌ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۝ (۲/۸۵)۔ کہ وہ دنیادی زندگی میں ذلیل و خوار ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مسلط کیا جائے گا۔ (نیز ۱۱۴/۲ ز ۹ - ۲۲/۱۰)۔

سورہ فجر میں اس حقیقت کو بڑے دل نشین انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ کہا کہ جب انسان ذلیل و خوار ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ رَجِئْتُ اَهْلًا مِّنْ ۱۶۱ - ۱۹/۸۹)۔ خدا نے مجھے یونہی ذلیل و خوار کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ صحیح نہیں۔ خدا کسی کو یوں ہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ تم ذلیل ہوئے ہو اپنے غلط اعمال کے نتیجہ میں۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ معاشرہ میں جو لوگ تمہارے جلتے تھے تم ان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ جن لوگوں کی چلتی ہوئی گاڑی رُک جاتی تھی، تم ان کی روٹی کا انتظام نہ خود کرتے تھے نہ دوسروں کو ایسا کرنے کے لئے کہتے تھے۔ جو کچھ تمہیں باپ دادا سے وراثت میں ملتا تھا تم اس کے واحد مالک بن بیٹھتے تھے۔ تم نے ایسا معاشی نظام قائم کر رکھا تھا جس میں بڑا سرمایہ چھوٹے سرمائے کو کھینچ کر اپنی طرف لے آتا تھا۔ یہ تھی تمہاری ذہنیت اور یہ تھا تمہارا نظام جس کا نتیجہ یہ ذلت و خوارى ہے۔ اور اس کے باوجود تم شکایت کر رہے ہو کہ خدا نے تمہیں ناحق، بلا وجہ ذلیل کر دیا۔ خدا کسی کو ناحق ذلیل نہیں کیا کرتا۔ (نیز ۴ - ۱۰/۹۲)۔

”خدا کسی کو ناحق ذلیل نہیں کرتا۔“ اس لئے کہ کسی کو ناحق ذلیل کرنا تو ظلم ہے، اور خدا کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو قرآن نے بے شمار مقامات پر واضح کر دیا ہے۔

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا | سورہ آل عمران میں ہے کہ جو لوگ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں ان کی کمیتیاں پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ وہ تباہ و برباد ہو جائیں۔

ہیں۔ اور اس کے بعد ہے وَ مَا ظَلَمْنَاهُمْ اَللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۳/۱۱۶)۔ اللہ ان پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ سورہ توبہ میں مختلف اقوام سابقہ کی تباہیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ - وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۹/۷۵)۔ ان کی یہ تباہیاں اور بربادیاں اس لئے نہیں ہوئی تھیں کہ خدا نے ان پر ناحق ظلم کیا تھا۔ یہ اس لئے واقع ہوئی تھیں کہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی، اس کو (۱۱/۱۱) میں دہرایا گیا ہے۔ (نیز ۲۳/۱۶ اور ۲۹/۴) میں۔ سورہ یونس میں بتایا گیا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ

شَيْئًا وَ لَكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۱۰۷/۴۳)۔ خدا انسانوں پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا۔ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں جس کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ خدا لا انتہا قوتوں کا مالک ہے اور انسان اس کے پیدا کردہ بندے جن کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ اپنی ضعیف و ناتواں مخلوق پر ظلم اور زیادتی کرے گا۔ لوگوں پر جو مصیبتیں اور تباہیاں آتی ہیں ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ يَدَاكِ يَہ ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۲/۱۰)۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ بندوں پر ظلم کرنا تو ایک طرف وہ اس کا کبھی ارادہ تک نہیں کرتا۔ وَ مَا اللّٰهُ سَرِیْدٌ ظَلَمًا لِّلْعِبَادِ ۝ (۳۰/۳۱)۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی۔ مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ (۴۱/۴۲)۔ اگر تم قوانین خداوندی کی صدا کو تسلیم کرو اور انھیں دل سے قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرو، تو خدا کو نہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ خدا کی ”نفسیانی کیفیت“ (معاذ اللہ) (SADISTS) کی نہیں جو دوسروں کو ناحق ستا کر اور اذیت پہنچا کر ذہنی لذت لیتے ہیں۔ اس لئے اس کا تصور تک بھی نہ کرو کہ خدا کسی کو یونہی، بلا وجہ تکلیف پہنچاتا ہے۔ انسانوں کو تکالیف ان کی اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچتی ہیں — اس کو ”اپنے آپ پر ظلم کرنا“ کہتے ہیں

خدا کے ہاں ہر بات کا فیصلہ حق و انصاف کے مطابق ہوتا ہے۔ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ دُفِیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ۔ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۲۹/۷۰-۷۱)۔ اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوتی۔

اعمال انسانی کے ظہور نتائج کے سلسلہ میں ہے کہ الْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ (۴۰/۱۷)۔ اس دن ہر شخص کو اس کے کاموں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اُس دن کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۰۷/۴۲)۔ ان کا عدل انصاف کے مطابق فیصلہ ہوگا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ (نیز ۵۴/۱۰)۔

اس سلسلہ میں سورہ نسا کی دو آیات بڑی غور طلب اور معنی رس ہیں۔ ہمد ر سالت ماب

کے ایک گروہ کی معکوس ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ فَإِنْ تَصِيبُهُمْ
حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ
مِنْ عِنْدِكَ۔ انہیں جب خوشگوار باتیں حاصل ہوتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کے ہاں سے ملی ہیں۔

اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو رسول اللہ سے کہتے ہیں کہ یہ
سورۃ نسا کی دو آیات سب تمہاری وجہ سے ہے۔ کہا کہ كُلُّ شَيْءٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ

(۴/۷۸)۔ ان سے کہہ دو کہ اس قسم کی تفریق و تخصیص صحیح نہیں۔ حسنات و مصائب سب خدا کی
طرف سے ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ فَمَالِ هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا
ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور جو جی میں آتا ہے کہتے چلے
جاتے ہیں۔

اس کے بعد انہیں بات سمجھائی گئی کہ يَادْرِكُوهُ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ
مَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ۔ (۴/۷۹)۔ جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہاری اپنی
لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور جو خوشگوار باتیں تمہیں حاصل ہوتی ہیں، وہ خدا کے ہاں سے ملتی ہیں۔
ان دونوں آیتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ حسنات اور مصائب
كُلُّ شَيْءٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ حسنات
خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور مصائب ہماری اپنی آؤرہ۔ یہ بات کیا ہوئی؟
یہاں کہا یہ کیا ہے کہ

(۱) جو واقعات بھی رد نما ہوتے ہیں، وہ مساعد ہوں یا نامساعد۔ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، سب فیہین
خداوندی کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ كُلُّ شَيْءٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔

(۲) خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر تم ان کے مطابق چلو گے تو اس کا نتیجہ حسنات (خوشگواریاں) ہوگا۔
مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ۔ اور

(۳) اگر تم ان کے برعکس، خود اپنے فصولوں کے مطابق چلو گے تو اس کا نتیجہ مصائب و مشکلات ہوں
گی۔ مَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ۔

یعنی اس جہان سعی و عمل میں، سب نتائج خدا کے قانون مکافات عمل کی رُو سے مرتب ہوتے

ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سب من عند اللہ ہوتے ہیں۔ اب رہی خوشگوار اور ناخوشگوار نتائج کی تفریق، سو اس کے لئے اصول یہ ہے کہ جو کام قوانین خداوندی کے مطابق کئے جائیں ان کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے (اسے من اللہ کہا گیا ہے) اور جو کام ان کے خلاف انسان خود اپنی مرضی سے کرے ان کا نتیجہ ناخوشگوار ہوتا ہے۔ (اسے من نفس کہا گیا ہے۔)

یہاں سے یہ عظیم حقیقت سامنے آگئی کہ خدا کی طرف سے ہمیشہ خیر ہی خیر ملتا ہے۔ مصائب و مشکلات (جسے شر کہا جاتا ہے) وہ انسان کا اپنا آوردہ ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا آگے چل کر (خیر اور شر کے عنوان میں ملے گی۔)

ان تصریحات کی روشنی میں دو بنیادی امور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) یہ جو ہم ہر ناگہانی مصیبت اور ناخوشگوار واقعہ پر کہتے ہیں کہ کیا کیا جائے، اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی یا اللہ کو یہی منظور تھا، تو ایسا کہنا نہ صرف حقیقت کے خلاف ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے خلاف بہت بڑا الزام ہے۔ ”خدا کی مرضی ہی ایسی تھی“ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے نہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں — ہم نے تو ہر طرح کی کوشش کر لی

غلط تصورات

تھی کہ ایسا نہ ہوا، لیکن اس کے باوجود خدا نے ایسا کر دیا — اور نہ ہی اس کی کوئی معقول وجہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خدا کی مرضی کے خلاف دم مارنے کی جا نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ جو جی چاہے کرے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کی حکمت سے وہی واقف ہے۔ — خدا کی باتیں خدا ہی جانے! آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کس قسم کے خدا کا تصور سامنے آتا ہے — ایسا خدا جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون، نہ حساب ہے نہ کتاب، نہ عدل ہے نہ انصاف۔ وہ جو جی میں آئے کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو ناحق مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے، نہ اس کی فہم کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی اس کی بابت اس سے پوچھ سکتا ہے۔

(۲) اور دوسری بات یہ کہ انسان کی تجویز و تدبیر اور اس کی تنگ و تاز اور سعی و کاوش سے کچھ نہیں ہوتا۔ — وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے — اس سے انسان ایک مجبور محض مخلوق بن کر رہ جاتا ہے۔ اس نکتہ کے متعلق تفصیلاً بعد میں لکھا جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ

اتفاق یہ ایسا ہو گیا (۱) اکثر ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کا کوئی سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم اسے اتفاق (یا CHANCE) کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور (۲) ایک فرد ان مصائب و آلام کا بھی شکار ہو جاتا ہے جن کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا بلکہ یوں ہوتا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کے اعمال کا نتیجہ کچھ اور (یعنی خوشگوار) ہونا چاہیئے لیکن ہوتا اس کے برعکس (ناخوشگوار) ہے۔ مثلاً ایک بد دیانت معاشرہ میں، دیانت و امانت کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والا، قسم قسم کی پریشانیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، حالانکہ قانونِ خداوندی کے مطابق، حسنِ عمل کا نتیجہ الحسنیٰ (خوشگواریاں) ہونا چاہیئے۔

جہاں تک شقِ اول (CHANCE) کا تعلق ہے، اس کائنات میں، جو قانونِ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے غیر متبدل نظام کے تابع سرگرم عمل ہے، کوئی واقعہ ایسا رونما نہیں ہو سکتا جس کا کوئی سبب (CAUSE) نہ ہو۔ لیکن اسباب (CAUSES) کا معلوم ہونا، انسانی علم و تحقیق پر منحصر ہے۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں، کسی واقعہ کا بھی سبب نہیں جانتا تھا، اس لئے وہ ہر واقعہ کو اتفاق (چانس) پر محمول کرتا تھا۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا گیا، روزِ فطرت پر پڑے ہوئے پردے اُٹھتے گئے اور واقعات و حوادث کے اسباب اس کی نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ سینکڑوں واقعات، حوادث حتیٰ کہ امراض ایسے ہیں جنہیں اس سے پہلے محض اتفاق (چانس) کا نتیجہ قرار دیا جاتا تھا لیکن اب وہ قانونِ علت و معلول کے دائرے کے اندر آچکے ہیں۔ اب بھی کیفیت یہ ہے کہ افریقہ، امریکہ، یا آسٹریلیا وغیرہ کے قدیم قبائل کے نزدیک جو حوادث ایسے ہیں جن کی کوئی علت ان کی سمجھ میں نہیں آتی، اس لئے وہ انہیں دیوی دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ مہذب دنیا میں، جہاں نت نئے سائنس کے انکشافات وجہ نقاب کشائی اسرارِ فطرت ہوتے رہتے ہیں، ان حوادث کی علت کے سمجھنے میں کچھ بھی دشواری پیش نہیں آتی۔ حتیٰ کہ بعض ایسے امور جن کی کوئی وجہ ہمارے بچپن کے زمانے میں ہماری سمجھ میں نہیں آیا کرتی تھی، ہمارے بچے اب انہیں روزمرہ کا معمول سمجھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح واقع ہوتے ہیں۔ اور یہ بات غیر مہذب قدیم قبائل تک ہی محدود نہیں۔ ایک مہذب ملک میں بھی جو لوگ مذہب کی پیدا کردہ توہم پرستیوں

کی تاریکیوں میں زندگی بسر کرنے کے نوگربیں، وہ ابھی تک ان حوادث کو "خدا کی شان" کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، جن کے اسباب و علل سے علمی گھرانوں کے بچوں تک باخبر ہوتے ہیں۔ جن امراض کے لئے وہ ابھی تک تعویذ کراتے اور قبروں پر چراغ جلاتے رہتے ہیں، یہ بچے ان کے لئے سیدھے ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر انجکشن لگوا آتے ہیں۔

لہذا، جن حوادث کے اسباب و علل سے ہمیں واقفیت نہیں ہوتی، ہم انہیں اتفاقی (چانس) پر محمول کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں بھی (اس کے باوجود کہ انسان نے کارگہ کائنات کے بہت سے رموز و اسرار سے آگہی حاصل کر لی ہے)۔ ہنوز کئی گوشے ایسے ہیں جن میں حوادث کے اسباب و علل کا علم حاصل نہیں ہو سکا۔ جوں جوں کائنات سے متعلق ہمارا علم آگے بڑھتا جائے گا، ان حوادث کے اسباب و علل بھی ہمارے حیطہ معلومات میں آجائیں گے اور اس طرح آخر الامر فطرت کا کوئی حادثہ بھی راز نہیں رہے گا۔ قرآن کریم نے آدم (یعنی آدمی) کے سلسلہ میں جو کہا تھا کہ **وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ** — خدا نے آدم میں اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی، تو اس کے ساتھ **كُلَّمَا نَزَّلَ آيَةً مِنْهُ لَيَأْتِيَنَّهُمْ بَخِيلُونَ يُأْتِيَنِ النَّاسَ سُوءًا وَمِنْ بَيْنِهِمْ كَوْنٌ** (۲/۲۱)۔ کے اضافہ سے اس کی بھی صراحت کر دی کہ ان اشیاء میں سے کوئی بھی ایسی نہیں رہے گی جس کا علم یہ حاصل نہ کر سکے۔

اتفاق (CHANCE) ہمارے علم کی کمی کا نام ہے، ورنہ کائنات میں کوئی واقعہ بھی اتفاقیہ (BY CHANCE) ظہور پذیر نہیں ہوتا۔

غلط معاشرہ میں افراد کی حالت | اب آئیے دوسری شق کی طرف اٹھ کر ایک فرد ایسے مصائب کا شکار بھی ہو جاتا ہے جو اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے، اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب انسان کسی معاشرہ میں زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اس معاشرہ کا جزو بن جاتا ہے۔ جب معاشرہ صحیح روش پر گامزن ہوتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج سے تمام افراد معاشرہ متمتع ہوتے ہیں۔ وہ افراد بھی جنہوں نے خواہ انفرادی طور پر ان خوشگوار بھروسوں کے حصول کی جدوجہد میں حصہ نہ بھی لیا ہو — مثلاً اگر کسی معاشرہ کی صحیح جدوجہد سے فصلیں اچھی ہوں اور پیداوار میں فراوانی، تو اس معاشرہ کے وہ افراد بھی خوش حال ہو جاتے ہیں جنہوں نے ان فصلوں کے کھیتوں کی شکل تک بھی نہ دیکھی ہو۔ اسی اصول کے مطابق 'جو معاشرہ' غلط روش

اختیار کرے، اس کے تباہ کن نتائج ان افراد کو بھی بھگتے پڑتے ہیں جو اس غلط روش سے براہِ راست متعلق نہ ہوں اور انھوں نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا ہو۔ جب کسی دریا کا بند ٹوٹ جائے تو اگرچہ اس کے بلا واسطہ ذمہ دار حکومت کے اربابِ نظم و نسق ہوتے ہیں، لیکن اس کی تباہ کاریوں کی پیٹ میں گاؤں کے وہ افراد بھی آجاتے ہیں جنھیں اس کا علم تک بھی نہ ہو کہ وہ بند کیسے ٹوٹا ہے۔ یہی وہ اجتماعی خطرات ہوتے ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً** ج (۸/۲۵۱)۔ اپنے معاشرہ کو ایسے خطرہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، جو جب آتا ہے تو پھر اس کی زد میں صرف وہی لوگ نہیں آتے جو خرابیوں اور تباہیوں کے براہِ راست ذمہ دار ہوں، اس کی پیٹ میں ہر کہہ دمہ آجایا کرتا ہے۔

لیکن انسان کی حالت عجیب ہے۔ معاشرہ کے اجتماعی نظام کے حسنِ تدبیر سے جو اساسیں اور خوش حالیوں ایک فرد کو میسر ہوتی ہیں، ان کے متعلق وہ کبھی نہیں کہتا کہ میں نے اس کے حصوں کے لئے کوئی کوشش نہیں کی، اس لئے میرا ان پر کوئی حق نہیں۔ یہ صرف انھیں ملنی چاہئیں جنھوں نے ان کے لئے ٹھگ و دو کی ہے۔ وہ ان سب سے بہرہ ور ہوتا ہے اور اس طرح ہوتا ہے گویا یہ اس کا حق ہے، اور اس لئے وہ کبھی ان لوگوں کا شکریہ تک بھی ضروری نہیں سمجھتا جن کے حسنِ تدبیر یا سعی و عمل کی وجہ سے وہ اساسیں میسر آئی ہیں لیکن اگر معاشرہ کی کسی خرابی کی وجہ سے کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ چلائے لگ جاتا ہے کہ میں اس خرابی کا ذمہ وار نہیں، اس لئے میں یہ مصیبت کیوں بھگتوں۔ یہ مجھ پر ظلم ہے، زیادتی ہے۔ وہ دہائی مچا دیتا ہے کہ جو لوگ معاشرہ کے اجتماعی نظم و نسق کے ذمہ دار ہیں، ان کا مواخذہ ہونا چاہیے۔ یہ مصیبتیں انھیں اٹھانی چاہئیں، ہمیں ان کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے!

انسان کی اس ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، قرآن کہتا ہے کہ **وَ اِذَا اَنْعَمْنَا عَلٰى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَا بَجَابِنِهٖ**۔ **وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤْمُرُ مَنَّا** (۱۷/۸۳)۔ جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں اور اسے زندگی کی خوشگواریاں میسر ہوتی ہیں، وہ (قوانینِ خداوندی کی طرف سے) اعراض برتتا اور نخوت و تکبر سے منہ دوسری طرف موڑ لیتا ہے لیکن جب اس پر مصیبت آتی ہے تو مایوس ہو کر چیخنے چلانے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے **قُلْ كُلٌّ يَّعْمَدُ عَلٰى سَنَابِلِهٖ** ان سے کہو کہ معاشرہ کا ہر فرد اپنی اپنی حدودِ اختیار کے اندر مصروفِ کار رہتا ہے، اس لئے وہ اجتماعی زندگی کے منفعت

لے شِکَاۗلُ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کا پاؤں یا ندھ دیتے ہیں (یعنی TETHER) "بانی اگلے صفحہ پر دیکھئے۔"

بخش اور ضرر رساں نتائج اعمال میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک، فلہذا، ان کا ذمہ دار ہوتا ہے قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے دل نشین انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ جہنم میں لیڈر اور عوام جہنم میں لیڈر اور عوام کے مکالمات | اب بھی جھگڑیں گے اور ایک دوسرے کے سر الزام دھریں گے کہ تم ہی ان مصائب و آلام کے ذمہ دار ہو۔ سورہ سبأ میں ہے۔

اگر تو اس منظر کو سامنے لائے جب یہ لوگ جھنوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی، خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلطی کا ایک دوسرے کے خلاف الزام دھر رہے ہوں گے۔ عوام اپنے لیڈر سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانین خداوندی پر ایمان لے آتے۔ لیڈر کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تھلے سلنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اسے اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو!

ان کے متبعین (FOLLOWERS) کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچاتے رہتے تھے جس سے ہم سیدھے راستے کی طرف آہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا! (۳۱-۳۳/۳۴)

لیکن ان میں سے کسی کا بھی یہ عذر قابل قبول نہیں سمجھا جائیگا اور فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ہ وہ سب اس عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اسے سب کو یکساں طور پر بھگتنا پڑے گا۔

لے لیڈروں اور عوام کے ان مکالمات کی تفصیل ”میری کتاب ”جہان فردا“ میں جہنم کے عنوان میں ملے گی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۹) اس کی وجہ سے وہ ایک خاص دائرہ کے اندر ہی چل پھر سکتا ہے۔ اس آیت میں مشاکلتہ کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی فرد کے حدود اختیار۔

اربابِ نظم و نسق کو ان کی غلط اندیشیوں کی وجہ سے اور عوام کو اس لئے کہ یہی تو ان خواص کی اُس قوت کا باعث تھے جس کی بنا پر وہ معاشرہ کو غلط پر چلاتے تھے۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے، اجتماعی زندگی میں فرد اور معاشرہ کا تعلق۔ معاشرہ، افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہوتا ہے۔ وہ بنا بنایا، کہیں اوپر سے نہیں ٹپک پڑتا۔ اگر عوام غلط روش پر چلنا نہیں چاہتے، تو انھیں چاہیئے کہ اٹھ کر اس نظام کو بدل دیں جو معاشرہ کو صحیح روش پر نہیں چلنے دیتا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن، عوام کے اس عذر کو قابلِ پذیرائی قرار نہیں دیتا کہ ہم کمزور فلہذا، مجبوس تھے اس لئے ہمیں اس عذاب میں ماخوذ نہ کیا جائے۔ صاحب اختیار و ارادہ انسان کا اپنے آپ کو مجبور قرار دینا، سب سے بڑا جرم تو خود ہی ہے۔ وہ جرم جس کی پاداش میں ابلیس ہمیشہ کے لئے کشادگی راہوں سے رحیم (رانہ) قرار پا گیا۔ لہذا اپنے آپ کو مجبور کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کرنا، شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کمزور انسان (یعنی جن کے پاس قوت کا سامان نہیں) معاشرہ کی غلط روش بدلنے کے لئے جہدِ اول میں ناکام رہ جائیں، لیکن اس جہد و جد میں ناکام رہ جانا اور بات ہے او، اپنے آپ کو مجبور کہہ کر اس کے سامنے سپر ڈال دینا اور اس کے بدلنے کی کوشش ہی نہ کرنا، اور بات۔ میزانِ خداوندی میں پہلی روش موجبِ ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَٰوٰتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَ سَاخَمَةٌ ۚ فَ (۲/۱۵۷) اور دوسری روش مستوجبِ عذابِ جہنم۔ فَاُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ (۳/۹۷)۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے، معاشرتی زندگی میں مصائب و آلام کی صحیح پوزیشن۔ جب تک قرآنِ کریم کی یہ تعلیم مسلمانوں کے سامنے رہی، وہ ہر اجتماعی مصیبت کے وقت کھڑے ہو کر سوچتے اور اس امر کا جائزہ لیتے کہ اس مصیبت کی وجہ کیا ہے۔ وہ اگر دیکھتے کہ اس مصیبت کا باعث نظم و نسق کی کوئی خرابی ہے، تو عوام، اربابِ نظم و نسق کو اس سے متنبہ کرتے اور اس کی اصلاح کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے۔ اگر وہ براہِ راست عوام کے تساہل یا تغافل کا نتیجہ ہوتی، تو عوام خود اس کے ازالہ اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تو

اسے خدا کی طرف منسوب کر کے فرار کی راہ اختیار کرتا، اور نہ ہی اپنی "تقدیر" کہہ کر رو دھو کر بیٹھ جاتا۔

لیکن بعد میں جب اربابِ نظم و نسق نے استبداد کی راہیں اختیار کیں اور ان کی وجہ سے معاشرتی مصائب و آلام سیلاب کی طرح امنڈنے لگے، تو انہیں فکر پیدا ہوئی کہ اگر عوام

بعد میں سازش

نے یہ سمجھ لیا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں، تو ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے، اس لئے انھوں نے اس خطرہ سے بچنے کے لئے سوچا یہ کہ عوام کی توجہ کا رخ کسی دوسری طرف موڑ دیا جائے۔ ایسا کرنا تنہا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے انھوں نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملایا۔ کوئی فرعون بھی ہا مان کے بغیر آفاکما بککم اذعلے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کونسی مشکل بات ہے۔ ابھی لو! چنانچہ انھوں نے عوام سے یہ وعظ کہنا شروع کر دیا کہ دنیا میں خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ جو تمہارے حاکم بنے بیٹھے ہیں انھیں اس کا کیا اختیار تھا کہ یہ حکم بن جاتے۔ انہیں حاکم خدا نے بنایا ہے۔ پھر جو کچھ یہ کرتے ہیں، انھیں اس کا بھی کس طرح اختیار ہو سکتا تھا کہ یہ اپنی مرضی سے ایسا کرتے۔ یہ بھی خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اگر خدا کی مرضی ایسی نہ ہوتی تو یہ اس قسم کی روش کیسے اختیار کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے ظلم کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف دل میں بھی احساسِ شکایت بیدار نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم خدا کی مشیت اور اس کی مرضی کے خلاف شکایت کر رہے ہو۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے، ارتداد ہے۔ توبہ کرو، ہزار بار توبہ کرو۔

اور ان وعظوں کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ ہر مصیبت خدا کی مرضی سے وارد ہوتی ہے۔ اس پر انسان کو "صبرِ شکر" کرنا چاہیئے بلے

یاد رکھئے۔ وَ مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (۳۰/۴۲)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے، تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ کبھی انفرادی طور پر آتی ہے۔ جیسے خود اپنی انگلی آگ میں ڈال دینا۔ اور کبھی اجتماعی طور پر۔ جیسے دریا

لے یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں بتایا جائے گا کہ یہ تبدیلی ہوئی کیسے اور کب؟

کابند ٹوٹ جانے سے سیلاب کی تباہ کاریاں۔ اور یا غلط معاشرہ میں، اصول پرستی کی دیانتدارانہ زندگی بسر کرنے والوں کو قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا۔

یہ آخری چیز (یعنی دیانت دارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی پریشانیاں) مزید وضاحت چاہتی ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ** (۵/۱۰۵)۔ اسے افرادِ جماعتِ مومنین! تم اپنی ذات (انفُسُكُمْ) کی نگہداشت کرو۔ یہ تم خود ہی کر سکتے ہو۔ دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ یاد رکھو! اگر تم (اپنی ذات کی نگہداشت سے) صحیح راستے پر چلتے رہے، تو غلط روش پر چلنے والے تمہیں کوئی

دیانت دارانہ زندگی بسر کرنے والوں پر پریشانیاں کیوں آتی ہیں؟

نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہ آیت عظیم حقائق کی پیامبر ہے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے۔ کہ اگر تم صحیح راستے پر چلتے رہو تو غلط راہ پر چلنے والے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکیں گے لیکن ہمارا مشاہدہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ ایک شخص جو دیانت اور امانت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، آئے دن نقصان اٹھاتا ہے۔ دیانتدار و کا نذار کے خلاف، بد دیانت کا رد باری اس طرح محاذِ قائم کر لیتے ہیں کہ اس کا اثاثہ تک نقصان کی نذر ہو جاتا ہے۔ دیانت دار اور فرائض شناس افسر کے خلاف، اس کے معصروں اس کا عملہ، اس طرح کی سازشیں کرتا ہے کہ اس کا جینا محال ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں معاشرہ کے ہر گوشے میں مل سکتی ہیں۔ پھر قرآن نے یہ کیسے کہہ دیا کہ جو شخص صحیح روش اختیار کرتا ہے، غلط روش پر چلنے والے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ بات ذرا گہرے غور و تدبیر کی متقاضی ہے!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، انسانی بیکر میں پنچنے پر زندگی دو سطحوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

طبعی زندگی کا نفع نقصان | ایک، وہی حیوانی سطح جو پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ اسے طبعی زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی قوانینِ طبعی کے تابع رہتی ہے اور

اس میں نیک و بد، حتیٰ کہ مومن و کافر میں بھی کوئی تمیز و تفریق نہیں ہوتی۔ آگ میں ہاتھ نیک آدمی ڈالے

یابد، اس کا اثر دونوں پر یکساں ہوگا۔ سنکھیا کا فرکھائے یا مومن، دونوں ہلاک ہو جائیں گے۔ اس زندگی میں نقصانات بھی طبعی قوانین کے مطابق ہوتے ہیں اور منافع بھی انہی قوانین کے مطابق حاصل۔ جو شخص بھی 'زراعت کے قوانین کے مطابق' اپنی زمین سنوارے گا اور محنت کرے گا، اس کی فصل اچھی ہوگی۔ جو اس میں تساہل برتے گا اس کی فصل خراب ہوگی۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

ہمارا قانون یہ ہے کہ جو کوئی اس دنیا میں طبعی مفادِ عاجلہ چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے طبعی قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے، ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق بنایا ہے، مادی مفاد دیدیتے ہیں۔ لیکن مستقبل کی زندگی میں اس کے لئے جہنم کی تباہی ہوتی ہے جس میں وہ بدعال اور دھتکارا ہوا داخل کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، جو شخص 'مفادِ عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں بھی چاہتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتا ہے جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اور مستقل اقدار پر یقین رکھتا ہے، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں 'حال اور مستقبل' دونوں میں بھرپور نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

ہم اس طرح ان دونوں گروہوں کو۔ یعنی صرف مفادِ عاجلہ چاہنے والوں اور مفادِ عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں طلب کرنے والوں کو اپنے قوانین کی رُوسے انکی کوششوں کے مطابق آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تیرے نشوونما دینے والے کی بخشائیں ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلی رہتی ہیں۔ ہم ان کے راستے میں کسی کے لئے بندہ نہیں لگا دیتے کہ ایک گروہ تو آگے بڑھ جائے اور دوسرے گروہ کو وہیں روک دیا جائے (۱۸-۱۶/۲۰)۔

یعنی جو سامانِ زیست 'طبعی قوانین کے مطابق حاصل ہوتا ہے' اسے ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو ان قوانین کے مطابق ان کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔ زندگی کی اس دوڑ میں 'کافر و مومن' دونوں کے لئے یکساں طور پر میدان کھلا رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کافر کو اس کی کوشش کے باوجود پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا جائے اور مومن کو 'خواہ وہ اس کے لئے کوشش نہ ہی کرے آگے بڑھا دیا جائے'۔

ہست ایں میکده و دعوت علم است این جا : قسمت بادہ باندازه جام است این جا

دوسری جگہ ہے۔

جو شخص مستقبل کے مفاد چاہتا ہے تو ہم، اس کی کوشش کے مطابق، ان میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص محض دنیاوی مفاد کا طالب ہوتا ہے، تو اسے، اس کی کوشش کے مطابق، وہ مفاد مل جاتے ہیں لیکن اس کے لئے مستقبل کے مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (۲۰/۴۲)

یہ ہے خدا کا قانون طبعی زندگی سے متعلق۔ چونکہ اس مقام پر زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے، اس لئے اس میں نیک اور بد میں کسی قسم کی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیوانوں میں نہ کوئی نیک ہوتا ہے نہ بد، نہ کافر ہوتا ہے نہ مومن۔

زندگی کی دوسری سطح، جسے ہم بغرض تعارف انسانی زندگی کہہ کر پکارتے ہیں، حیوانی زندگی سے بلند

ہوتی ہے۔ اس میں اخلاقی اقدار کی کار فرمائی ہوتی ہے جو **دوسری سطح زندگی کا نفع نقصان** شخص ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ترک جاتی ہے اسے مستقبل کی زندگی یا حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن زندگی کی اس سطح پر حیوانی زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ وہ بھی بدستور موجود ہوتی ہے اور اس کے تقاضے بھی اسی طرح زندہ۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی زندگی پر دوسرے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایک طبعی قوانین اور دوسرے مستقل اقدار سے متعلق قوانین۔ صحیح زندگی (جسے اسلامی زندگی یا ایک مومن کی زندگی کہا جاتا ہے) وہ ہے جس میں انسانی جسم اور اس کی ذات، دونوں کے تقاضے بہ حسن و خوبی پورے ہوتے رہیں۔ صحیح (اسلامی) معاشرہ میں ان دونوں میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ لیکن غلط (غیر اسلامی) معاشرہ میں ان دونوں میں قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں ایک طرف ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو مستقل اقدار (دیرانت، امانت، پاک بازی) کا تحفظ چاہتا ہے اور اس کے مد مقابل دوسرا انسان (یا انسانوں کا گروہ) جنہیں ان اقدار کا کوئی پاس نہیں ہوتا۔ وہ صرف مادی مفادات کے خواہاں ہوتے ہیں خواہ وہ کسی طریق سے حاصل ہو جائیں۔ جب ان دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس شخص کے مقابلہ میں، جو ان کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ بلا تا مل استعمال کرے، وہ شخص

ناکام رہے گا جو ہاتھ اٹھانے سے پہلے یہ سوچے کہ مستقل قدر اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔ اب اس شخص کے سامنے دو راستے ہیں، جن میں سے یہ جو نسا چاہے منتخب کر لے۔ یا تو یہ بھی اقدار پرستی کو بالائے طاق رکھ کر ہر حربہ استعمال کر لے اور اس طرح فریقِ مقابل کا، اس کے برابر کی سطح پر کھڑے ہو کر مقابلہ کرے۔ اس سے اسے مادی مفاد تو حاصل ہو جائیں گے لیکن اس کی ذات کا نقصان ہو گا اور یا یہ اپنی ذات کے مفاد کو ترجیح دے کر اصول پرستی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس طرح اسے مادی نقصان تو اٹھانا پڑے گا لیکن اس کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لہذا جب قرآن کریم نے کہا تھا کہ عَنِكُمْ أَنْفُسُكُمْ - لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ - تو اس کا یہی مطلب تھا کہ اگر تم اپنی ذات کی نگہداشت کرو گے تو جو شخص غلط راستے پر چل رہا ہے، وہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں مادی نقصان پہنچا دے۔ لیکن وہ تمہاری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۵۱/۵)۔ انسانی ذات کے نفع یا نقصان کا اندازہ مادی بیمانوں سے نہیں لگایا جاسکتا۔ اسے خدائی پیمانوں سے ماپا جاتا ہے، اس لئے اس کا صحیح صحیح اندازہ اس وقت ہو گا جب اسے قانونِ مکافاتِ عمل کی میزان میں تولاجائے گا۔

لیکن قرآن کریم طبعی زندگی کے تقاضوں (یعنی مادی مفادات) کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ انہیں بڑی

اہمیت دیتا ہے۔ اس لئے وہ مومن کی زندگی یہ بتاتا ہے

مادی مفادات کی اہمیت کہ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ

(۲/۲۱)۔ اسے دنیا کی خوش گواریاں بھی حاصل ہوتی ہیں اور مستقبل کی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقصد حاصل کیسے ہو؟ یعنی انسان کو مادی مفاد بھی حاصل ہوتے رہیں،

اور مستقل اقدار کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ قرآن کی ساری تعلیم اسی پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔

ایک اصول پرست انسان (مرد مومن)، اور مادہ پرست انسان (صرف مفادِ عاجلہ کا خواہاں جسے کافر کہا

جاتا ہے) میں باہمی ٹکراؤ کو حق و باطل کی کش مکش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کش مکش میں، اصول پرست

انسان اس لئے شکست کھا جاتا ہے کہ غلط معاشرہ میں، باطل پرست افراد ایک متحدہ محاذ کی شکل

اختیار کئے ہوتے ہیں اور اصول پرست انسان، الگ الگ انفرادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن

کی رُو سے، اصول پرستوں کا یہ شعار (یعنی انفرادی اندازِ زیست، جسے تصوف یا مسلکِ خانقاہیت کہا

جاتا ہے) غلط ہے۔ اس کے نزدیک صحیح اسلامی زندگی یہ ہے کہ یہ حق پرست افراد جماعتی زندگی بسر کریں اور اس طرح متحدہ طور پر باطل پرست محاذ کا مقابلہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس مقابلہ میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ باطل پرست گروہ اپنے مفادات کو آسانی سے نہیں چھوڑے گا، وہ ان کے تحفظ کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کرے گا۔ حق و باطل کے اس تصادم و تراحم کے ہی وہ مقامات ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ اسے معرکہ جہاد کہا جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؛ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تمہیں بھی ان جانگداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے باطل کی قوتوں سے ٹکری تھی۔ اس تصادم میں حالت یہ ہو جاتی تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اُٹھتے کہ ہا! الہا! ہماری کوششوں کے بار آور ہونے کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور نصرت خداوندی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔

یاد رکھو! تمہیں بھی انہی مراحل میں گزرنا پڑے گا۔ (۲/۲۱۴)

جنگِ احزاب میں اس ٹکراؤ نے کس قدر شدت اختیار کر لی تھی، اس کا نقشہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

وہ تم پر ایسا سختی کا وقت تھا کہ دشمن کا لشکر چاروں طرف سے اُمنڈ کر آگئے تھے۔ خوف کے مارے تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چارہا تھا اور دہشت سے تمہارے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اُچھل کر حلق تک پہنچیں گے۔ اور تم میں سے جو کمزور ایمان کے حامل تھے ان کے دل میں خدا کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔

اس لرزادینے والی مصیبت کے وقت مومنین کا جذبہ صادق ابھر کر سامنے آگیا اور دیکھنے والوں

نے دیکھ لیا کہ وہ کس پامروی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔ (۱۱-۱۰/۳۳)۔

یہی وہ تصادمات ہیں جن میں ہر قسم کے (طبعی) نقصانات کا امکان و احتمال ہوتا ہے۔

ان میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا۔ کہیں سامان خورد و نوش کی کمی ہوگی۔ کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا۔ کہیں کھیت اور باغ اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا، لیکن اس کے بعد فتح و کامرانی کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب و آلام کے ہجوم میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصد باطل قوتوں کو شکست دے کر حق کا نظام قائم کرنا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں۔ ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ وہی ہمارا مقصود و منتهی ہے اور ہم ہر حال میں اس کی طرف بڑھیں گے۔ (۱۵۶-۱۵۵/۲)

اس مقابلہ کے لئے، صبر و استقامت کے جوہر ذاتی کے ساتھ ساتھ مادی ساز و سامان کی بھی ایسی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہا گیا کہ تم اپنی استطاعت بھر اپنی سرحدوں کا سامان مدافعت تیار رکھو۔ (۸/۶۰) رزم گاہ میں اگر جنگی تدبیریں کوئی نقص رہ جاتا ہے تو اس کا خمیازہ، جماعتِ مومنین کو بھی اسی طرح بھگتنا پڑتا ہے، جس طرح، ایسے حالات میں، مخالفین کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ چنانچہ جنگِ احد میں، جنگی تدبیروں کی ایک خرابی کی وجہ سے، جماعتِ مومنین کی فتح تبدیل بہ شکست ہو گئی اور اس کے نتیجے میں انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ حتیٰ کہ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اس میں خود رسول اللہ کو بھی زخم آئے اور آپ کے رفقاء نے بڑی جانفشانی اور سرفروشی سے آپ کی حفاظت کی۔

یہی وہ مقامات ہیں جہاں جماعتِ مومنین کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا گیا کہ اِنْ تَكُونُوا تَائِمُونَ فَلَا تَهْمُ يَا كَمُونَ كَمَا تَائِمُونَ ۚ (۴/۱۰۴)۔ اگر تمہیں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ فریقِ مخالف کو بھی نہ اس قسم کے نقصانات اٹھانے پڑے تھے۔ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ مَضَتْ اَوَّلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ وقائع و حوادثِ زمانہ کی یہ گردش اسی طرح رہتی ہے اور اس کی پیٹ میں تمام انسان آ سکتے ہیں۔ کبھی ان کا پلڑا بھاری، کبھی اُن کا۔ لہذا، مشکلات کے وقت گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ استقامت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

ان تصادمات میں اگر حق پرستوں کی جماعت، ضروری ساز و سامان کے ساتھ، ثبات و استقامت سے، مخالفین کا مقابلہ کرتی رہے تو آخر الامر کامیابی انہی کی ہوتی ہے اور اس طرح اس معاشرہ کا

قیام عمل میں آجاتا ہے جس میں مستقل اقدار کی پابندی کے لئے مادی نقصان اٹھانا نہیں پڑتا۔ یہ وہ نظام ہے جس میں: لَا يَضُرُّكُمْ مِّنْ ضَلٍّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ (اگر تم صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا) کے مطابق، مادی نقصان ہو گا نہ انسانی ذات کا زیاں۔ اُسے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ کہا جائے گا۔ اس دنیا میں مادی خوشگواریاں اور اخروی زندگی میں انسانی ذات کی سرفرازیاں۔ وَ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ یہ انتہائی کامرانی ہے۔

اس جدوجہد میں جو لوگ اس نظام کے قیام سے پہلے ہی جان دے دیتے ہیں، ان کے حصے میں اس دنیا کے مصائب و آلام ہی آتے ہیں لیکن ان کی اخروی زندگی ایسی حسین ہو جاتی ہے کہ ہر چینے والا اس قسم کی موت پر ہزار رشک کرتا ہے۔ انہی کو مقتولین فی سبیل اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور چینے والوں سے کہا جاتا ہے کہ انہیں مردہ مت سمجھو۔ یہ حیاتِ جاوداں سے ہم آغوش ہیں۔ (۲/۱۵۴)۔

لیکن یہ کامرانی حاصل ہوتی ہے، اپنی سعی و عمل ہی سے۔ اور یہ سعی و عمل نتیجہ خیز ہوتی ہے اجتماعی بہنج زندگی میں۔ اسے قومی یا ملی زندگی کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔



قوموں کی "تقدیر"

افراد کی زندگی کی طرح، قوموں کی زندگی بھی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے تابع رہتی ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو ان کے عروج و زوال کا پیمانہ بنتا اور ان کی موت و حیات کے فیصلے کرتا ہے اور چوں کہ (جیسا کہ ہم سابقہ باب میں دیکھ چکے ہیں) افراد کی "تقدیر" اقوام کی "تقدیر" (یعنی حیاتِ اجتماعیہ) کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، اس لئے یوں کہئے کہ اقوام سے متعلق قانونِ مکافات کا دائرہ افراد اور اقوام دونوں کو محیط ہوتا ہے۔

قوموں کے تغیرِ احوال کے متعلق، ہم خدا کا یہ قانون پہلے دیکھ چکے ہیں کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۸/۵۳) (۱۱/۳۳)

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

یہی وہ قانون (خدا کا امر) ہے جس کے متعلق کہا کہ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُودًا لَا تَأْتِيهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۸/۴۲)۔ جس قوم کو ہلاک ہونا ہے وہ بھی ولأول وبراہین کی رو سے یَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط (۸/۴۲)۔

قوموں کی موت و حیات بلا وجہ نہیں ہوتی علیٰ وجہ البصیرت ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت زندہ

لے خدا کے امر" کی بحث دوسرے باب میں آچکی ہے۔

رہے۔ یہاں نہ کسی قوم کو زندگی یونہی بطور ”بخشش“ ملتی ہے اور نہ ہی اس کی ہلاکت، دھاندلی سے (بلاوجہ) ہوتی ہے۔ یہاں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو ناحق بلاوجہ تباہ کر دیا جائے۔ ذٰلِكَ اَنْ تَمُوتَ بِغَيْرِ رُبِّكَ مَهْلِكُ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غَفُلُونَ ۝ (۶/۱۳۳)۔ یہ اس لئے کہ تیرا رب ایسا کبھی نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ناحق تباہ کر دے اور اسے اس کا علم ہی نہ ہو کہ اس کا یہ انجام کیوں ہوا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ وَاَمَّا كَانَ رَبُّكَ لِيُهِلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصِلِحُونَ ۝ (۱۱/۱۱۴)۔ یہ خدا کے شایان شان ہی نہیں۔ یہ اس سے بہت بعید ہے۔ وہ ایسا کرتا ہی نہیں کہ کسی بستی کو ناحق ہلاک کر دے درحالیکہ اس کے رہنے والوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ سورہ روم میں قرآن کی اولین مخاطب قوم [عربوں] کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھیں لاکھ سمجھایا گیا کہ غلط روش کا نتیجہ ہلاکت انگیز ہوتا ہے اس لئے، اگر یہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں تو انھیں چاہیئے کہ یہ روش چھوڑ دیں، لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ ان سے کہو کہ اگر یہ بات ان کی سمجھ میں اس طرح نہیں آتی تو یہ تاریخی شہادات

تاریخی نوشتوں کو دیکھیں۔ اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر غور کریں اور ان کے انجام و عواقب کو سامنے لائیں۔

اس مقصد کے لئے اگر یہ لوگ آنکھیں کھول کر دنیا میں چلیں پھریں گے تو انہیں نظر آجائے گا کہ جن قوموں نے ان سے پہلے، انہی جیسی روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ وہ قومیں شوکت و حشمت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا۔ ملکوں کو آباد کیا۔ ان کی آبادیاں بھی ان مخاطبین کی آبادی سے کہیں زیادہ تھیں۔ ان کے رسول ان کے پاس واضح قوانین لے کر آئے۔

قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ پھر ان کا انجام کیا ہوا، ایک اصولی بات سُن رکھو۔ وہ یہ کہ ایسا کہیں نہیں ہوا کہ خدا نے کسی قوم کو یونہی ظلم اور زیادتی سے تباہ کر دیا ہو۔ قومیں اپنے اوپر آپ ظلم کرتی ہیں۔ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

ہاں تو خدا کے رسول ان کے پاس آئے لیکن انھوں نے انھیں جھٹلایا، ان کا تسخّر اڑایا اور اپنی اسی غلط روش پر گامزن رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جنھوں نے

اس قسم کا ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام قائم کر رکھا تھا، ان کی اپنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں۔ ان کے معاشرہ کا توازن بگڑ گیا اور وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ (۹۔ ۱۰/۳۰)۔

تکذیبِ رسل سے کیا مُراد ہے | یہاں کہا یہ کیا ہے کہ انھوں نے خدا کے رسولوں کو اور اس کے قوانین کو جھٹلایا۔ (ان کی تکذیب

کی) تو وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ جھٹلانا کیا ہے؟ تکذیب کسے کہتے ہیں؟ یہ غور طلب بات ہے۔ حکیم کسی مریض سے کہتا ہے کہ تم دودھ نہ پینا، ورنہ تمھاری حالت خراب ہو جائے گی۔ وہ گھر آتا ہے اور یاروں دوستوں سے کہتا ہے کہ تم نے اس حکیم کی بات سنی۔ کہتا ہے، دودھ مت پینا ورنہ تمھاری حالت خراب ہو جائے گی۔ پاگل ہو گیا ہے۔ کبھی دودھ سے بھی کسی کی حالت خراب ہوتی ہے؟ یہ کہتا ہے اور غٹا غٹ دودھ کا گلاس انڈیل لیتا ہے۔ دوسری ہی صبح اس کی شکایت بڑھ جاتی ہے۔

اسے کہتے ہیں تکذیب۔ یعنی سچی بات کو جھٹلانا اور اس کے علی الرغم اس کے خلاف عمل کرنا۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضراتِ انبیائے کرام، اقوامِ سابقہ کی طرف آتے رہے۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ جس روش پر تم چل رہے ہو یہ تمہیں تباہی و بربادی کے عمیق غاروں میں دھکیل دے گی لیکن وہ ان کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا اور اس کے بعد..... اپنی اسی روش پر آگے بڑھتے چلے جاتے اور آخرِ لامر تب اسی کے جہنم میں جا گرتے۔ یہ تھا ان کی تکذیب کا نتیجہ۔ ان اقوام کی سرگزشتیں بیان کرنے کے بعد قرآنِ کریم اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں تم بھی اپنی اپنی روش کا جائزہ لو اور دیکھو کہ یہ راستے بھی بربادیوں کی طرف لے جانے والے تو نہیں۔ اگر یہ راستے ویسے ہی ہوں جیسے راستے ان سابقہ اقوام نے اختیار کئے تھے، تو ان سے اجتناب برتو، ورنہ تمہارا حشر بھی انہی جیسا ہو گا۔ اقوامِ عالم کے فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس روش پر چل کر ایک قوم تباہ ہوئی تھی، جو قوم جب بھی اور جہاں بھی، اس روش پر چلے گی، اس کا انجام ویسا ہی ہو گا۔ یہ ہے قرآنی فلسفہ تاریخ۔

ان حقائق کی روشنی میں وہ اپنی مخاطب اقوام سے (جو عہدِ رسالت مآب کی ہوں یا موجودہ زمانے) یا

آنے والے زمانے کی (کہتا ہے کہ تم تاریخی نوشتوں کو سامنے لاؤ اور دیکھو کہ مکذبین کا انجام کیا ہوا؟
 قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَمْثَلِ كَمَا أَنْظَرْنَا كَيْفَ
 كَانَتْ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ (۳/۱۳۶)۔ "تم سے پہلے کئی قومیں گزر چکی ہیں۔ ذرا
 دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟" (نیز ۱۱/۶۶ : ۱۲/۲۶)۔ سورہ یونس میں
 مکذبین کی جگہ مُنْذِرِیْنَ (۱۰/۷۳) آیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس راستے پر نہ چلنا،
 تباہ ہو جاؤ گے۔

سورہ انعام میں ہے کہ قوموں کی تباہی ان کے جرائم کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔ ارشاد

ہے۔

کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جنہیں
 اس قدر ثروت و سطوت حاصل تھی جو انھیں بھی حاصل نہیں۔ ان پر رزق کی فسرا دانیوں
 کی بارش ہوتی تھی اور معاشی خوش حالیوں کی نہریں بہتی تھیں لیکن وہ اپنے جرائم
 (يَذُنُّهُمْ) کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ (۶/۶۱)۔

ظلم باعث تباہی | ان جرائم کی فہرست طول طویل ہے جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں
 لیکن قرآن کریم نے ان میں ظلم کو سر فہرست رکھا ہے اور واضح الفاظ
 میں بتایا ہے کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا (۶/۴۵)۔ قوموں کی جڑ ظلم کی وجہ سے کٹی
 ہے۔ وہ ان اقوام کی تباہی اور بربادی کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ذَٰلِكَ أَنْقَرَىٰ أَهْلَكَ لَهُمْ
 كَمَا ظَلَمُوا (۱۸/۵۹)۔ یہ ان قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات ہیں جنہوں نے جب ظلم و ستم پر کمر باندھ لی
 تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ دوسری جگہ ہے۔

(اگر یہ لوگ تاریخی نوشتوں سے پوچھیں گے تو وہ انہیں بتائیں گے کہ کتنی ہی بستیاں
 تھیں جن کے رہنے والوں کو ہمارے قانون مکافات نے اپنی گرفت میں لے کر ہلاک کر دیا۔
 یہ اس لئے کہ انھوں نے ظلم و نا انصافی کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ ایسی اجڑیں کہ ان کی
 سربفلک عمارات اذندھی ہو کر گر پڑیں۔ ان کے کنوئیں بے کار ہو کر رہ گئے۔ ان کے مستحکم
 قلعے کھنڈرات بن گئے۔

کیا یہ لوگ ان علاقوں میں چلے پھرے نہیں کہ (ان اقوام گزشتہ کے عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر) ان کے دلوں میں عقل و فکر سے کام لینے کی صلاحیت بیدار اور ان کے کانوں میں بات سننے کی استعداد بردے کار آئے۔ (بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کی ماتھے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ وہ تو بدستور بینا ہوتی ہیں لیکن ان کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں اور اس طرح ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔

(۲۵ - ۲۶/۲۲)

قرآن کریم نے متعدد اقوام سابقہ کی عبرت آموز داستانیں بیان کرنے کے بعد اسی حقیقت کو دہرایا ہے کہ **وَمَا كُنَّا مُنْجِلِكِ الْقُرْآنِ إِلَّا ذَا أَهْلُهَا ظَالِمُونَ** (۲۸/۵۹)۔ یہ ہوتا ہی نہیں کہ ہم کسی قوم کو تباہ کر دیں بجز اس کے کہ وہ ظالم ہو۔ چونکہ اس مقام پر ان اقوام کی سرگزشتوں کا استقصا مقصود نہیں، اس لئے ہم انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس وقت ہم صرف اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ قوموں کا عروج و زوال ان کے اپنے اعمال سے وابستہ ہے۔ ان کی "تقدیر" کبھی کھائی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ اسے خود اپنے ہاتھ سے نکھتی ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قانونِ مکافات کی رو سے، عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس طور پر سامنے آنے میں ایک مدت لگتی ہے جسے ہملت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے **اجل** کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو **اجل** موت کو کہتے ہیں لیکن عربی **اجل یعنی ہملت کا وقفہ** زبان میں اس کے معنی ہملت کے وقفہ کے ہیں۔ چونکہ اقوام کی زندگی دنوں سے نہیں بلکہ صدیوں کے پیمانے سے باطنی جاتی ہے، اس لئے ان کی ہملت کا وقفہ (اجل) بھی خاصا طویل المیعاد ہوتا ہے۔ یہ جو ہم عام طور پر دھوکا کھا جاتے ہیں کہ ایک قوم، مکرر اقوام

لے ان امور کی تفصیل کے لئے میری کتاب "اسلام کیا ہے" دیکھئے یا جوئے نوز۔ برق طور۔ شعلہ مستور جن میں ان تمام اقوام کا تذکرہ ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

پر ہر طرح کا ظلم و استبداد روا رکھتی ہے وہ سلب و نہب کی روش اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کا نظام، استحصال (EXPLOITATION) پر مبنی ہے۔ دنیا اس کے ہاتھوں تنگ آرہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ پینلٹی چلی جا رہی ہے، تو یہ اس لئے کہ یہ اس کی مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ سورہ نمل میں ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا فَزَّكَ عَلَيْهِمْ مِنْ دَابَّةٍ
وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا
يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۚ وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ۝ (۱۶/۶۱)۔

اگر بہار قانونِ تدبیر و اہمال کا فرمانہ ہوتا اور ظلم و استبداد کی بنا پر لوگوں کی گرفت فوراً ہو جایا کرتی تو صفحہ ارض پر کوئی چلنے والا (انسان) نظر نہ آتا۔ لیکن خدا ایسا نہیں کرتا بلکہ ان کے انجام کو ایک مدت تک کے لئے مؤخر کر دیتا ہے۔ جب یہ مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ان کی تباہی میں نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے نہ سویر۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ (نیز ۳۵/۲۵)۔

مہلت کا یہ قانون اس قدر سخت گیر ہے کہ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۲۳/۴۳)۔ کوئی قوم نہ اس وقفہ کو کم کر سکتی ہے نہ اسے بڑھا سکتی ہے۔ اگر کوئی قوم اس مدت کے اندر اندر اپنی اصلاح کر لے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو ہلاک ہو جاتی ہے۔ مہلت کا وقفہ اسی لئے رکھا گیا ہے۔

مہلت کا وقفہ (اجل) بھی ہر قوم کے لئے پہلے سے متعین نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ (مثلاً)

ایک قوم برسرِ اقتدار آتی ہے تو اس کے لئے پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ دو سال تک برسرِ اقتدار رہے گی۔

ہر اجل کے لئے قانون ہے

اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ قوم لاکھ کچھ کرے، نہ دو سال سے پہلے زوال پذیر ہوگی اور نہ ہی دو سال کے بعد زندہ رہ سکے گی۔ ایسا نہیں ہوتا۔ اس مدت کا تعین بھی خدا کے مقدر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ جب تک یہ قوم اس (صحیح) روش پر چلتی رہے گی، اسے ممکنِ مسطوت حاصل رہیں گے۔ جب یہ، اس کے خلاف، دوسرے راستے پر گامزن ہو جائے گی، تو یہ قعرِ مذلت میں گر جائیگی

اس حقیقت کے تبیان کے لئے قرآنِ کریم نے اصول یہ بتایا کہ

(۱) يَكُنْ اُمَّةً اَحَدًا (۱۰/۴۹)۔ ہر قوم کی زندگی کی ایک مدت ہوتی ہے۔ اور

(۲) يَكُنْ اَحَدًا كِتَابًا (۱۳/۳۸)۔ ہر مدت کے لئے ایک قانون ہوتا ہے۔ جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی زندگی کی مدت گھٹا بڑھالے۔

یہ قانون مہلت، کوئی گپت دُویا (باطنی علم) نہیں کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے۔ ایسے قانون کے وضع کرنے سے فائدہ کیا جس کا کسی کو علم ہی نہ ہو سکے۔ قانون کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جن کے لئے وہ قانون وضع کیا گیا ہے انہیں معلوم ہو کہ اگر ہم نے اس کے مطابق کام کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اگر اس کے خلاف چلے تو یہ۔ قرآنِ کریم نے اس قانونِ مہلت کو کِتَابٌ مَّعْلُومٌ (۱۵/۴)۔ کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اس قانون کا ہر ایک کو علم ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے قوانین بڑی شرح و بسط سے دیئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ قانونِ مہلت کِتَابٌ مَّعْلُومٌ ہے۔ یہ ”سنت اللہ“ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ (۳۵/۴۳)۔ اسی کو قوموں کا قانونِ استخلاف و استبدال کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ قانون جس کے مطابق عمل کرنے سے ایک قوم کو ممکن حاصل ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس صلاحیتِ بخش پر وگرام سے اعراض برتتی ہے، تو اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس وقت بھی سنبھل جائے تو اس کی زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو اس سے سطوت و حکومت چھن جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے جس نے اس قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے اندر سطوت و اقتدار کی صلاحیت پیدا کر لی ہوتی ہے خود جماعتِ مومنین سے، جنہیں ان کے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض حاصل ہوا تھا، (۲۴/۵۵) کہا گیا کہ

اگر تم جہاد کے لئے رزم گاہِ حیات میں نہیں آؤ گے تو تم پر الم انکیز عذاب مسلط ہو جائیگا۔

اور وہ عذاب یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ یہ

خدا کے مقرر کردہ پیمانے ہیں۔ (۱۱/۵۷، ۹/۳۹)

سورۃ محمدؐ میں ہے۔

تم میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنا مال کھلا رکھیں، تو وہ بخل کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص

اس معاملہ میں بخل سے کام لیتا ہے۔ وہ بخل خود اس کے اپنے خلاف جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محتاج نہیں۔ تم اپنی زندگی اور بقا کے لئے اس کے محتاج ہو۔ اگر تم زندگی کی صحیح روش سے اعراض نہ کرو گے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔
(تم سے بہتر ہوگی)۔ (۲۴/۳۸)۔

اس لئے کہ قوموں کی موت و حیات اور استخلاف و استبدال کا قانون یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظام زندگی کی حامل ہو وہ باقی رہتی ہے۔ جو غلط نظام رائج کرے وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو۔ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے زندگی کے متعلق ان کے نظریات اور عملی نظام کی رُو سے ہوتے ہیں۔ یہی قوموں کے لئے تقدیرِ الہی (خدا کا قانون) ہے۔

کتاب

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، اس میں ہر واقعہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ مصائب بھی اپنی قوانین کے مطابق وارد ہوتی ہیں اور خوشگواریاں بھی اپنی کے مطابق ملتی ہیں۔ انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا اختیار و ارادہ کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کر کے خوشگواریاں حاصل کر لے اور چاہے ان سے روگردانی کر کے مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے۔

لیکن قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جنہیں اگر سطحی نگاہوں سے دیکھا جائے تو انسان کا ذہن دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اگے بڑھنے سے پہلے ان آیات کا صحیح (قرآنی) مفہوم واضح کیا جائے۔ مثلاً سورہ حدید میں ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأََهَا..... (۵۷/۲۲)۔

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں یا تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کی دنیا میں۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن)

یا مثلاً سورہ توبہ میں ہے کہ

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا..... (۹/۵۱)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

تو کہہ دے کہ ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی کچھ جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔ (ایضاً)

یہ، اور اس قسم کی دیگر آیات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ دنیا میں جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے۔ (اس کا تعلق انسانوں کی انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی سے) وہ پہلے سے لکھا ہوتا ہے اور اسی کے مطابق دنیا میں رونما ہوتا ہے۔ اس سے ”نوشۃ تقدیر“ اور ”قسمت کا لکھا“ جیسی اصطلاحات رواج پذیر ہو گئیں اور اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ عام ہو گیا کہ ہر شخص کی پیدائش سے پہلے اس کی قسمت خدا کے ہاں لکھی جاتی ہے اور پھر سب کچھ اسی کے مطابق واقع ہوتا رہتا ہے۔ نہ اس نوشۃ کو مٹایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کے بس میں ہے کہ قسمت کے لکھے کو مٹا سکے۔ خدا کو کتاب تقدیر بھی اسی عقیدہ کی رو سے تصور کیا جاتا ہے۔

آئیے ہم دیکھیں کہ ان آیات کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

عربوں کے ہاں جب منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کر دی جاتی تھی تو اسے کتاب کہا جاتا تھا۔ کتاب کی آج بھی یہی شکل ہے۔ (ضمناً) قرآن کریم کے شروع ہی میں جو اسے ”ذَلِكَ الْكِتَابُ“ کہا گیا ہے تو اس سے واضح ہے کہ یہ خود رسول اللہ کی زندگی میں، شیرازہ بند کتابی شکل میں موجود تھا۔ یہ روایات کہ قرآن مجید کو کتابی شکل میں بعد میں مرتب کیا گیا تھا، قرآنی شہادت کے خلاف ہیں جس شکل میں قرآن مجید آج ہمارے پاس ہے، یہ اسی شکل میں خود حضور رسالت کی حیات طیبہ میں مدون و مرتب ہو چکا تھا۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آئیے۔

لیکن مادہ (ل. ت. ب) جس سے کتاب کا لفظ وضع ہوا ہے، کے بنیادی معنوں میں ’قانون‘ یا جو کچھ از روئے قانون کسی پر واجب قرار دیا گیا ہو، بھی شامل ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد مقامات پر انہی معانی میں آیا ہے۔ مثلاً۔

(۱) سورۃ نسا میں ان رشتوں کی فہرست دینے کے بعد جن سے نکاح حرام ہے، کہا گیا ہے،
 كُتِبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ (۴/۲۴)۔ مولانا محمود الحسنؒ اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ ”حکم ہوا اللہ کا تم پر“ یعنی
 ان کے نزدیک یہاں کتاب کے معنی حکم کے ہیں۔ ہم پہلے کچھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں قانون کا
 لفظ نہیں آیا۔ اس کی جگہ عام طور پر ”حکم“ کا لفظ آیا ہے۔ حکم کے معنی فیصلہ کے ہوتے ہیں اور جو
 فیصلہ یا حکم، مستقل اور غیر متبدل ہو، اسے قانون کہا جاتا ہے۔ مثلاً حکومت کا یہ فیصلہ کہ ٹریفک کو
 بائیں طرف چلنا چاہیئے، ملکی قانون کہلاتا ہے کیونکہ یہ حکم ایک بار کا نہیں، مستقل اور ہمہ گیر ہے۔ اسی
 طرح خدا کا یہ فیصلہ کہ آگ حرارت پہنچاتی ہے، وقتی فیصلہ نہیں، مستقل اور غیر متبدل ہے، اس لئے اس
 نے قانون کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہی صورت قرآن کے احکامات کی ہے کیونکہ وہ مستقل بھی ہیں، اور
 غیر متبدل بھی۔ بنا بریں، مذکورہ بالا آیت میں ”كُتِبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ“ کے معنی ہوں گے، یہ تمہارے
 لئے خدا کا قانون ہے۔

(۲) سورۃ بقرہ میں مطلقہ عورتوں سے نکاح کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَ
 النِّكَاحِ حَتّٰی يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَحْلٰہُ (۲/۲۳۵)۔ مولانا محمود الحسنؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔
 ”اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت مقررہ اپنی انتہا کو“ یہاں کتاب کا ترجمہ مقررہ
 (عدت) کیا گیا ہے۔ یعنی وہ عدت جسے خدا نے مقرر کیا ہے۔ اسے حکم یا قانون کہا جائے گا۔
 (۳) اِنَّ الصَّلٰوۃَ كَانَتْ عَلٰی الْمُوْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْعًا (۴/۱۰۳) صلوٰۃ
 مومنین پر ایک موقت فریضہ ہے۔

(۴) قرآن کریم کے متعلق ہے۔ فِیْہَا کُتِبَ قِیْمَۃٌ (۹۸/۳)۔ اس میں حکم قوانین ہیں۔
 (۵) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸)۔ تم پر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے۔
 (۶) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔
 (۷) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (۲/۲۱۶)۔ تم پر جنگ فرض قرار دی گئی ہے۔
 (۸) سورۃ نسا میں یٰۤاَیُّهَا النِّسَاءُ کے متعلق ہے کہ لَا تُوْثِقُوْا زُجْرَکُمْ مَا کُتِبَ لَہُنَّ (۴/۳۴)۔
 جو کچھ ان کے لئے قانون کی رو سے مقرر کیا گیا ہے تم انہیں وہ نہیں دیتے۔

(۹) وَ لَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ سِوْرَتُہَا

عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ (۲۱/۱۰۵)۔ ہم نے زبور میں 'اخلاقی نصائح کے بعد' یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث وہ بندے ہوں گے جن میں وراثتِ ارض کی صلاحیت ہوگی۔ یہاں کتاب کے معنی بالکل واضح ہیں۔ خدا کا یہ قانون ہے کہ ممکن (حکومت) اس قوم کو ملتی ہے جو جہاں بانی کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ جنتِ اعلیٰ کی بنا پر مملکت حاصل کی جائے گی تو وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگی۔ وہ جہاں سے حاصل کی جائے گی یا کسی نااہل قوم کو ویسے ہی مل جائے گی، تو وہ خلافِ قانونِ خداوندی ہوگی۔

(۱۱) قوموں کے اعمال نامہ کو بھی ان کی کتاب کہا گیا ہے۔ کُلُّ أُمَّةٍ شَدَعِيَ إِلَى كِتَابِهَا (۲۵/۲۸)۔ ہر قوم کو اس کے اعمال نامہ کی طرف بلایا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۵/۲۸)۔ جو کچھ تم کرتے تھے آج تمہیں اس کا بدلہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوگا۔ اسے خدا نے خود اپنی "کتاب" کہہ کر پکارا ہے۔ هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِأَنَحَقِّ (۲۵/۲۹)۔ ہماری کتاب جو کچھ تمہارے خلاف کہتی ہے، وہ حق ہوتا ہے (نیز ۲۰/۵۲)۔

(۱۱) سورۃ الانعام میں ہے کہ بحر و بر میں جو کچھ ہے خدا کو اس کا علم ہے۔ جو پتہ بھی کسی درخت سے گرتا

ہے، خدا کو اس کا بھی علم ہوتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہو، غرضیکہ رطب و یابس، خشک و تر، جو کچھ بھی ہے، وہ سب کتابِ مبین میں ہے۔ (۶/۵۹)۔ ظاہر ہے کہ یہاں کتابِ مبین سے مراد صحیفہ فطرت ہے۔ یعنی خارجی کائنات میں پہلی ہوئی اشیاء سے متعلق قوانین۔ انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔

(۱۲) سورۃ آل عمران میں ہے کہ قرآن کا ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جو متعین الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔ انہیں مُحْكَمَاتُ کہا جاتا ہے اور ایک حصہ بسیط حقائق سے متعلق ہے جنہیں تشبیہات کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مُحْكَمَاتُ کے متعلق کہا کہ وہ أُمُّ الْكِتَابِ ہیں۔ (۳/۶) یعنی قانون کی اصل و بنیاد۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کائنات سے متعلق قوانینِ خدا کے عالمِ امر میں مدون ہوتے ہیں اور وہ بروئے کار عالمِ خلق میں آتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا کہ وَعِنْدَ كَأُ أُمُّ الْكِتَابِ (۱۳/۲۹)۔ یعنی قوانین کی اصل و اساس، ان کا سرچشمہ خدا کے ہاں ہے، یعنی عالمِ امر میں۔ خود قرآنِ کریم کے متعلق کہا کہ وہ عربی زبان کے حروف و نقوش میں

تو تمہارے پاس ہے لیکن ذِ اٰتِہٖ فِیْ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدٰیْنَا تَعَلٰی حَکِیْمٌ (۴۳/۴)۔ ” وہ ہمارے پاس اُم الکتاب میں ہے۔“

اُم الکتاب 'یا عالم امر' سے مراد علم خداوندی ہے جس سے باہر کوئی شے نہیں۔ سورہ حج میں ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ (۲۲/۷۰)۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا کو اس سب کا علم ہے۔ یہ سب "کتاب میں ہے"۔ دوسری جگہ اسے "کتاب مبین" کہا گیا ہے۔ (۲۶/۷۵)

کائنات میں جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے وہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اپنی آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ قرآن کریم نے ان اولیں مراحل کو "مُسْتَوْدَعٌ" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ سفر جس میں پچھلی منزل 'اپنے' 'مسافر' کو اگلی منزل کے سپرد کر دیتی ہے اور جب وہ آخری منزل میں پہنچ جاتا ہے تو

اسے اس کا "مستقر" کہا گیا ہے۔ یعنی اس کی **مستودع کے مراحل اور مستقر** جائے قرار۔ سورہ قمر میں ہے۔ وَ کُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقَرٌّ

(۵۴/۳)۔ ہر امر (معاملہ) ایک مستقر ہے۔ دوسری جگہ ہے بِکُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (۶/۶۷)۔ ہر خبر کا ایک مستقر ہے۔ اور سورہ ہود میں ہے یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّہَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا۔ کُلُّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۱۱/۶)۔ خدا کو ہر شے کے مستودع کا بھی علم ہوتا ہے اور مستقر کا بھی۔ یہ سب کتاب مبین میں ہوتے ہیں۔

کسی واقعہ کا مستقر تو وہ ہے جہاں وہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ اب رہے اس کے مستودع کے مراحل، تو ان میں سے بعض مراحل کا تعلق عالم امر سے ہوگا۔ اس کے بعد جب یہ "امر" عالم خلق کی منزل میں آئے گا تو وہ قانون اسباب و علل کے تابع آ جائے گا۔ اس میں انسان کو اس کے مستودع کے مراحل کا علم، اس کی علمی سطح کے مطابق ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی معاملہ کے مستودع کے ایسے مراحل ہوں جو ہنوز انسانی معلومات کے دائرے میں نہ آ سکے ہیں۔ اس کے بعد جب انسانی انکشافات مزید ترقی کرتے جائیں تو وہ علت و معلول کی ان کڑیوں کو بھی معلوم کر لے جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں۔

انسانی عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آجانے کا درمیانی عرصہ بھی حصہ مہلت کا وقفہ کہا گیا ہے) دراصل مستودع کی منازل ہیں جو انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وہ اس نتیجہ کو اس وقت دیکھ سکتا ہے جب وہ محسوس شکل میں اس کے سامنے آتا ہے۔ یہ اس کا مستقر ہوگا۔ بالفاظ دیگر، انسان کے ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن اسے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ محسوس و مرنی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے: وَكَذَٰلِكَ قَصَّضْنَا مِنْ قَبْلِكَ كَآثَافًا لِّمَا كَانَتْ ظَالِمَةً ۚ وَآَنُشَأْنَا بَعْدَ هَآءِ قَوْمًا ۙ اٰخَرِيْنَ كَتٰنِيْ هٰۤیَ بَنِيّٰ اٰمِیْنَ جنہیں ہم نے ان کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم ابھر آئی۔ وہ اپنی ظلم و ستم کی روش پر چلے جائے تھے اور چونکہ اس سے ان کا بال تک بیکا نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ انھیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ لیکن درحقیقت یہ وہ عرصہ تھا جس میں ان کے اعمال غیر محسوس طور پر اپنے نتائج مرتب کرتے اور مستقر کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ فَلَمَّا اَحْسَنُوْا بَاْسَنًا ۙ اِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ (۱۱۱-۱۱۲/۲۱)۔ جب ہمارا عذاب محسوس شکل میں ان کے سامنے آگیا تو اس سے بچنے کے لئے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں آواز دی کہ اب تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ تم رکو، اور واپس چلو اپنی انہیں عشرت گاہوں کی طرف جن میں تم دوسروں کی کمائی پر گلچھڑے اڑاتے تھے۔ چلو وہیں، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کس کی کمائی تھی جس سے تم اس طرح اپنی عیش سامانیاں خریدتے تھے۔ اس وقت وہ ہزار چٹخے چلائیں گے۔ لیکن ان کی چیخ و پکار ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔ انہیں ایسا کر دیا جائے گا جیسے کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا شعلہ۔ (۱۳۱-۱۱۵/۲۱)

ہم کہہ رہے تھے کہ خدا نے ہر امر کے مستودع اور مستقر کے متعلق کہا ہے کہ وہ ”کتابِ مبین“ میں

ہوتا ہے۔ (۱۱/۶)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ:-

(۱) ”کتاب“ سے مراد قانون یا ضابطہ قوانین ہے۔

(۲) تمام قوانین عالمِ امر میں طے پاتے اور مدون ہوتے ہیں۔ اس مرحلہ میں اسے ”کتاب اللہ“ کہا

جاتا ہے۔ یعنی علمِ خداوندی — اور

(۳) عالم خلق میں یہی قوانین، قوانین فطرت اور قرآنِ کریم کی شکل میں سامنے آتے ہیں، انہیں کتاب اللہ ہی کہا جاتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ان قوانین کا علم، انسان حاصل کر سکتا ہے کیونکہ یہ کتاب مبین یا کتاب معلوم ہے۔

ان تصریحات کے بعد آپ ان آیات کی طرف آئیے، جنہیں پہلے درج کیا جا چکا ہے اور جنکی وضاحت کے لئے "کتاب" کا قرآنی مفہوم سامنے لایا گیا ہے۔ سب سے پہلے سورہ حدید کی ان آیات کو لیجئے جن سے سطح میں حضرات ان کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، الجھن میں

مسئلہ تقدیر کے سلسلہ میں اہم آیات

متلا ہو جاتے ہیں۔ وہ آیات یہ ہیں۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مِّن قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۚ لَّكِن لَّا
تَأْسُوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ
الْمُفْرِحِينَ

مولانا محمود الحسنؒ نے ان آیات کا یہ ترجمہ کیا ہے

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں اور نہ تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس کے کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔ تاکہ تم غم نہ کھلیا کرو اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور نہ سخی نہ کیا کرو اس پر جو اس نے تم کو دیا اور اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا، بڑائی مارنے والا۔

اور اس سے اس نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے کہ ہر آنے والی مصیبت پہلے سے مقدّر ہوتی ہے۔ اسے کا تقدیر نے ہر ایک کی قسمت میں پہلے ہی سے لکھ رکھا ہوتا ہے اور انسان کچھ بھی کیوں نہ کرے وہ آکر رہتی ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے کہ انسان جو جی میں آئے کر لے، آنے والی مصیبت اٹل ہی نہیں سکتی، تو اس پر رونا رلانا کیسا۔ انسان کو صبر کر کے بیٹھ رہنا چاہیے۔ اس کو 'راضی برضا' کہتے ہیں جو خدا کے نیک بندوں کی علامت ہے۔ اسی طرح، انسان کو اگر خوشحالیوں میں سر آئیں تو اس پر بھی اُسے اترانا نہیں چاہیے کیونکہ وہ بھی اس کی اپنی کارگیری اور مہرِ مندی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اس کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں اس لئے اُسے

مل جاتی ہیں۔ اس میں اس کی کاریگری کیا جس پر یہ ناز کرے!

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ ان آیات کے اس مفہوم کی رُو سے، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت، جو دین کی اصل و اساس ہے، دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ خدا کے یہ ارشادات کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ ہر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہوتی ہے۔ خدا، نہ بلا وجہ کسی کو ذلیل کرتا ہے، نہ یوں ہی اپنے نعمات کے خزانے لٹا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کی اپنی سعی و کوشش کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر سینکڑوں ارشاداتِ خداوندی (معاذ اللہ) جھوٹے قرار پاتے ہیں۔ لہذا، اس بنیادی دلیل کی رُو سے ہی، ان آیات کا یہ مفہوم درست قرار نہیں پاتا اس

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں | کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ خدا نے، قرآن کے من جانب اللہ ہونے کا

ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲)۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے ایک طرف تو یہ کہا ہے کہ ہر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ہر مصیبت پہلے سے مقدر ہوتی ہے جس میں انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا، تو اس سے بڑھ کر تضاد اور اختلاف کیا ہوگا؟ لہذا، ان آیات کا کوئی ایسا مفہوم، جو قرآن کی دیگر آیات سے مختلف ہو، صحیح قرار نہیں پاسکتا۔ اب دیکھئے کہ ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

”کتاب“ کے معنی آپ دیکھ چکے ہیں۔ یعنی قانونِ خداوندی۔ ان معانی کی روشنی میں، آیت (۵۷/۲۲) کا مفہوم یہ ہوا کہ خارجی کائنات (فی الارض) یا خود انسانی دنیا (فی انفسکم) میں جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے اس کے لئے پہلے سے ایک قانون مقرر ہوتا ہے۔ خارجی کائنات کے حوادث اور انسانی زندگی کی مشکلات و مصائب، سب خدا کے مقرر کردہ قانونِ اسباب و علل کے مطابق ظہور میں آتی ہیں اور یہ بات خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ وہ اس قسم کے قوانین متعین کر دیتا۔

اس کے ساتھ ہی اسے بھی سمجھ لیجئے کہ جہاں تکالیف اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق واقع ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ہی اس نے ایسے قوانین بھی بنا دیئے ہیں جن کے مطابق عمل کرنے سے، ان تکالیف کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اگر قانون یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے، شدید تکلیف ہوتی ہے، تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ قانون بھی بنا دیا ہے کہ جلی ہوئی انگلی پر فلاں مہم لگاؤ گے تو تکلیف

جاتی رہے گی۔ لہذا اگر کسی قانون کی خلاف ورزی سے نقصان پہنچتا ہے تو اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے ایسا قانون بھی بنادیا ہے جس سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔

گزیک تقدیر خوں گردد جگر :۔ خواہ از حق حکم تقدیر در گز

اگر تمہیں خدا کی ایک تقدیر (قانون) کے مطابق نقصان پہنچا ہے، تو حضرت عمرؓ کے الفاظ میں اس تقدیر سے خدا کی دوسری تقدیر کی طرف چلے جاؤ۔ لہذا، حوادث و مصائب پر اُسُو پہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے سامنے دوسرا راستہ کھلا ہے۔ اس پر چل نکلو۔ اس سے تلافی مافات ہو جائے گی۔ مایوس تو وہ ہو جسے، یا تو اس کا علم ہی نہ ہو کہ ایسا کیوں ہوا ہے یا، وہ کسی جابر و مستبد حکمران کی طرف سے ہو جس کے خلاف انسان کو دم مارنے کی مجال نہ ہو۔ اس لئے وہ سوائے اس کے کہ ”صبر و شکر“ کر کے بیٹھ جائے، اور کیا کر سکتا ہے۔ یاد رکھو! مایوسیاں اور مجبوریاں ایسے نظام میں ہوتی ہیں، جہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہ ہو۔ جہاں یہ کیفیت ہو کہ ”مزاج شاہاں! — گاہ بہ سلامے بہ بخشند“ و گاہ بہ دشنامے خلعت بہ بخشند — شاہانہ مزاج کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جی چاہا تو سلام کرنیوالے کو حوالہ دار و رسن کر دیا اور کبھی موح میں آئے تو گالی دینے والے کو گاؤں جاگیر میں بخش دیا۔ ایسے نظم میں تو واقعی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان، ہر مصیبت پر ”مایوس و سرخوم“ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن خدا کی بادشاہت میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے اور ہر نقصان کی تلافی کی راہیں کھلی ہیں — وہاں نہ ظلم ہے نہ دھاندلی، نہ لاقانونیت ہے نہ ”مزاج شاہاں“ والی بات۔ لہذا، ایسے حاکم کی مملکت میں کسی نقصان پر مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟ نقصان ہوا ہے تو دیکھو کہ اس کی وجہ کیا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس کی تلافی کے لئے اس نے کیا تدابیر تجویز کر رکھی ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو، نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر کسی کو خوشحالی میسر آئی ہے تو وہ بھی یہ نہ سمجھے کہ چونکہ میں بادشاہ کا مصاحب ہوں، اس لئے اس نے خوش ہو کر مجھے یہ انعام دیا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی مملکت میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں انعامات بھی انسان کے اپنے ہی اعمالِ حسنہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

یہ ہے ان آیات کا صحیح مفہوم۔

(۲) سورۃ انفال میں ہے کہ ایک جنگ میں ایسا ہوا کہ دشمن کو شکستِ فاش دینے کے بجائے اس کے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر لیا تاکہ ان کا زبردستی وصول کر لیا جائے۔ یہ فیصلہ دین کے مقصد کے مطابق نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ محض ایک تدبیری غلطی تھی اور نادانستہ سہو، اس لئے اس پر جماعتِ مؤمنین کے لئے صرف معمولی سی سزائیں کو کافی سمجھا گیا۔ اس سلسلہ میں کہا کہ **لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ** (۸/۶۸)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — ”اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب —“ (مولانا محمود الحسن)۔ اس کا صحیح مفہوم واضح ہے۔ ”كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ“ سے یہاں مراد اللہ کا وہ قانون ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ یعنی یہ قانون کہ جو غلطی سہو و خطا کی وجہ سے سرزد ہو، اس سے درگزر کیا جاسکتا ہے — لہذا آیت زیرِ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ تم لوگوں نے کیا تھا، وہ جرم تو ایسا تھا جس کی تمہیں سزا ملنی چاہیے تھی، لیکن چونکہ قرآنِ کریم میں پہلے سے یہ قانون دیدیا گیا ہے کہ سہو و خطا پر سزائیں کافی ہوتی ہے، اس لئے تمہیں سزا نہیں دی جاتی۔

(۳) سورۃ توبہ میں ہے کہ ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ اگر حالات تمہارے سازگار ہوتے ہیں، تو یہ بات ان پر بڑی گراں گذرتی ہے (کہ تمہیں خوشحالیاں کیوں میسر آگئیں)۔ لیکن اگر حالات ناسازگار ہو جائیں اور تمہیں تکالیف (مصائب) کا سامنا ہو، تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے تم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے پہلے ہی ایسی احتیاط برت لی تھی کہ ان کے ساتھ ہم بھی مصیبتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ہے۔

قُلْ لَّيِّنَ يَصِيبُنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۹/۵۱)۔

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے — ”تو کہہ دے، ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا، مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔ وہی ہے کارِ ساز ہمارا۔ اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کریں مسلمان“ (مولانا محمود الحسن)۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہمیں جو واقعات بھی درپیش آتے ہیں، ان میں نہ تمہاری خوش فہمیوں کا کوئی دخل ہوتا ہے، نہ بددعاؤں کا کوئی واسطہ۔ یہاں ہر بات خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق دینا ہوتی ہے۔ لہذا، ہم جن حوادث سے دوچار ہوتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا اس

قانون کی رو سے لازم ہے اور وہ قانون ایسا محکم اور غیر متبدل ہے کہ اس کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا ہم اس کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں اس لئے تمہاری اس قسم کی باتیں ہم پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ خدا نے ہمارے مقدر میں پہلے سے لکھ رکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ — جو قانون خدا نے ہمارے لئے مقرر کر رکھا ہے — جیسے وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (۲/۱۸۷)۔ جس بات کی تمہیں از روئے قانون خداوندی اجازت دی گئی ہے اس کے حصول کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کہ اگر یہاں "مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ" کے یہ معنی کئے جائیں کہ جو کچھ خدا نے تمہارے لئے مقدر کر دیا (لکھ دیا ہے)۔ تو اس کے ساتھ وَابْتَغُوا کا حکم بے معنی ہو جاتا ہے۔ جو کچھ خدا نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے اس کے حصول کے لئے کوشش کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو بہر صورت مل کر رہے گا لیکن جس بات کے لئے قانون مقرر کر دیا ہو اس کی طلب و حصول کے لئے کوشش ضروری ہوگی۔ جیسے دوسری جگہ ہے۔

كَتَبَ اللَّهُ لَأَعْلَبِينَ أَنَا وَرُسُلِي (۵۸/۲۱)

خدا نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ ہم اور ہمارے رسول غالب آکر رہیں گے۔ اس غلبہ کے کے رسولوں کو جس قدر صبر آزا جدوجہد کرنی پڑتی تھی، اس کی تفصیل سے قرآن کے صفحات درخشاں ہیں۔

سورہ اعراف میں ہے کہ قوم حضرت موسیٰ نے دھاک کی کہ وَاکْتُبْ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ "ہمارے لئے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی لکھ دے" اور آخرت کی بھی۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ فَسَأُخْتَبُّهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ..... (۷/۱۵۶)۔ یہ خوشگواریاں ان کے لئے "لکھی جاتی ہیں" جو تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ خدا نے پہلے سے لکھ رکھا ہے، خدا نے پہلے سے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، اس کے بعد افراد اور اقوام کا نامہ اعمال ان قوانین کے مطابق ساتھ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اسی کے مطابق انہیں خوشگواریاں بھی ملتی ہیں اور مصائب بھی۔

بِإِذْنِ اللَّهِ

ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا۔ قرآن کریم میں اس مضمون کی تو کوئی آیت نہیں، البتہ اس قسم کی آیات ضرور ہیں جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۶۴/۱۱)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا مفہوم یہی ہو تو پھر جس قدر آیات گذشتہ صفحات میں لکھی جا چکی ہیں، ان سب کی تردید ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں زیادہ نہیں تو کم از کم اس ایک آیت کو دوبارہ سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ رَأْسُكُمْ (۳۲/۳۰)

تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور پھر دیکھئے کہ اگر آیت ۶۴/۱۱ کا مفہوم یہ لیا جائے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خدا کے حکم سے آتی ہے تو ان دونوں آیتوں میں کھلا ہوا تضاد ہو گا اور اس کے ساتھ قرآن کے اس دعوے کو دیکھئے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ آیت (۳۲/۳۰) کے الفاظ ایسے ہیں جن کا کوئی اور ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ وہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ لہذا، ظاہر ہے کہ آیت (۶۴/۱۱) میں ”بِإِذْنِ اللَّهِ“ کا مفہوم کچھ اور ہو گا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ بِإِذْنِ اللَّهِ کے معنی کیا ہیں۔

إِذْنُ کے بنیادی معنی اعلان کے ہیں۔ اذان۔ مؤذن اسی سے ہیں۔ **إِذْنِ** کے معنی نیز اس کے معنی اجازت کے بھی ہیں۔

اور علم کے بھی۔ إِذْنِ اللَّهِ کے معنی ”خدا کا علم“ بھی ہیں۔ صاحب مفردات (امام راغب اصفہانی) نے کہا ہے کہ اذن اور علم میں فرق یہ ہے کہ اذن وہیں بولا جاتا ہے جہاں صاحب علم کا ارادہ اور مشیت بھی اس میں شامل ہو۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب خدا کا علم اور ارادہ (امر) عالم خلق میں کار فرما ہوتا ہے تو وہ قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور، جیسا کہ ہم ”حُکْم“ کے متعلق کچھ چکے ہیں، کہ جب ایک حکم مستقل طور پر دے دیا جائے اور وہ غیر تبدیل ہو، تو وہ قانون بن جاتا ہے۔ یہی

کیفیت اجازت کی ہے، جب کسی بات کی اجازت مستقل طور پر دے دی جائے تو وہ ہماری اصطلاح میں قانون کہلائے گی۔ قرآن کریم میں اِذْنِ اللہ کی اصطلاح انہی معانی میں آئی ہے۔ مثلاً

(۱۱) سورہ حج میں ہے اِذْنِ الَّذِیْنَ یُقَتِّلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوا (۲۲/۳۹)۔ جن لوگوں پر

مظالم توڑے گئے ہیں اور ان مظالم کی انتہا یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ وہاں (مکہ) سے ہجرت کر کے منہ آگئے ہیں لیکن مخالفین نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ایک لشکر جرار لے کر ان پر حملہ آور ہوئے ہیں، تو اب ان لوگوں کو بھی اجازت (اذن) دی جاتی ہے کہ یہ ان کے خلاف لڑیں۔

ظاہر ہے کہ جنگ کی یہ اجازت نہ صرف انہی لوگوں کے لئے تھی اور نہ ہی وقتی، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب اور جہاں بھی ایسے حالات پیدا ہوں تو مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہوگی۔ یعنی یہ اجازت وقتی نہیں بلکہ (ان حالات سے مشروط) مستقل تھی۔ بالفاظ دیگر، صورت یہ نہیں ہوگی کہ جب اس قسم کے حالات پیدا ہوں تو مسلمان خدا سے درخواست کریں اور اس کی طرف سے اجازت ملے تو پھر وہ تلوار اٹھائیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب جماعت مومنین نے (جنگ خیبر میں) یہودیوں کے خلاف جنگ کی اور ان کے کھجوروں کے ان درختوں کو کاٹنا جو لڑائی کی راہ میں مزاحم ہو رہے تھے تو قرآن نے کہا کہ تم نے یہ کچھ باذن اللہ کیا تھا (۵۹/۵)۔ حالانکہ قرآن میں، ان کے اس وقت ایسا کرنے کے لئے کسی الگ اجازت (اذن) کا کہیں ذکر نہیں۔

قانونِ زراعت (۲) زراعت کے متعلق واضح طبیعی قوانین موجود ہیں۔ زمین ایسی ہو جس میں پیداوار کی صلاحیت ہو۔ یعنی وہ زرخیز ہو اور اس میں قاعدے کے مطابق کھیتی کی جائے تو اس سے فصل اچھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ہے وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ یُخْرِجُ نَبَاتًا بِاِذْنِ رَبِّہٖ (۷۸/۷)۔ زرخیز زمین، اپنے رب کے اذن سے اچھی فصل دیتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں اِذْنِ کے معنی زراعت سے متعلق قوانین ہیں، جن میں زمین کے زرخیز ہونے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(۳) بارش کے متعلق یہ حقیقت واضح ہے کہ وہ خاص قانونِ طبیعی کے مطابق برستی ہے۔ اس

بارش کے متعلق قانون قانون کا علم حاصل کر لینے کا نتیجہ ہے کہ اب انسان مصنوعی بارش برسانے کے قابل بھی ہو گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ

کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ زمین میں جو کچھ ہے خدا نے ہمارے لئے مسخر کر رکھا ہے اور کشتیاں سمندر میں کس طرح اس کے امر کے مطابق تیرتی رہتی ہیں وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۲/۶۵)۔ اور وہ بادلوں کو فضا میں معلق رکھتا ہے کہ وہ اس کے اذن کے بغیر زمین پر نہ برسیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں اذن سے مراد خدا کا وہ قانون ہے جس کے مطابق فضا میں تیرنے پھرنے والے بخارات (بادل) خاص درجہ کی ٹھنڈک سے پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور چونکہ پانی ہوا سے بھاری ہوتا ہے، اس لئے وہ فضا میں معلق رہنے کے بجائے زمین پر گر جاتے ہیں۔ اسی کو بارش کہتے ہیں۔ لہذا جب کہا جائے گا کہ بارش اذن اللہ سے برسی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق برسی ہے۔

(۴) قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جنگ) کرنے والے مجاہدین وہ تھے جنہوں نے اپنی جانیں خدا کے ہاتھ فروخت کر رکھی تھیں۔ ان کا مقصد حیاتِ حق و صداقت کا بول بالا کرنا تھا خواہ اس کے لئے ان کی جان تک بھی کیوں نہ دے دینی پڑے۔ یہی وہ بلند مقاصد اور مقدس جذبات تھے جن کی بنا پر وہ میدانِ جنگ میں چٹان کی طرح ثبات و استقلال سے جمے رہتے تھے۔ ان کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے کہا گیا کہ یہ مجاہدین اپنے سے دس گنا مخالفین پر بھی غالب آجائیں گے۔ اور اگر ان کے ہاں ساز و سامان کی کمی ہوگی تو بھی یہ اپنے سے دس گنی تعداد پر یَغْدِبُونَا..... بِإِذْنِ اللہ (۸/۶۶)۔ خدا کے اذن سے غالب آجائیں گے۔ یہ ”اذن اللہ“ اس کے سوا کیا ہے کہ جب تم میں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی تو تم اپنے سے دگنی تعداد پر بھی غالب آ جاؤ گے۔ اور جب ”اور جہاں بھی ایسی صورت پیدا ہوگی، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ اس کو قانون کہتے ہیں۔ یہی وہ قانون ہے جس کے مطابق کہا کہ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللہ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (۲/۲۴۹)۔ قلیل التعداد جماعت کثیر التعداد مخالفین پر غالب آ جاتی ہے۔ یہاں بھی بِإِذْنِ اللہ کا مفہوم واضح ہے اور آیت کے آخر میں وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ نے بات اور بھی واضح کر دی ہے کہ خدا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو ثبات و استقلال سے کام لیتے ہیں۔

اس آیت سے آگے ہے کہ (حضرت) طاووت کا لشکر جب جالوت کے مقابلہ کے لئے نکلا تو انہوں نے دُعا کی کہ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَ ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ

الْكَافِرِينَ ۝ (۲/۲۵۰)۔ بارِ الہا! ہم پر ثبات و استقامت کے جام اُنہی دے تاکہ میدانِ جنگ میں ہمارے قدموں میں لغزش نہ آنے پائے اور اس طرح ہمیں مخالفین پر غلبہ اور کامرانی عطا کر دے۔ اس کے بعد ہے۔ فَهَزَمُوا هُمُ بِأَذْنِ اللَّهِ (۲/۲۵۱)۔ اس لشکر نے جالوت کے لشکر کو اذنِ خداوندی کی رُو سے شکست فاش دی۔ یہاں سے اذنِ اللہ کا مفہوم اور بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

(۵) کفر و ایمان کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ (۱) لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶)۔ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ اور (۲) اَوْ قُلِ الْحَقُّ مِنِّي تَمَّتْ مِنِّي شَاءَ فَلْيُؤْمِنُوا وَ مَن شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ خدا کی طرف سے حق و صداقت پر مبنی تعلیم تمہارے سامنے نکھر کر آ گئی ہے۔ تم میں سے جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

ایمان لانے کا قانون

ایک مشفق دوست کی طرح رسول اللہ کی دلی آرزو تھی کہ لوگ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تباہی سے بچ جائیں۔ آپ کی یہ مقدس آرزو اس قدر رشتہ اختیار کر جاتی تھی کہ خدا کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اس سلسلہ میں سورہ نوس میں آپؐ نے کہا گیا کہ اگر خدا چاہتا کہ نوح انسان طوعاً و کرہاً ایک ہی راستے پر چلے، تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا۔ وہ انہیں (حیوانات کی طرح) اختیار و ارادہ سے عاری، مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو انتخاب و اختیار کی صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ جو راستہ چاہے برضا و رغبت خود اختیار کرے۔ اس باب میں یہ ہمارا قانون ہے اَفَأَنْتَ تُكْفِرُ ۚ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مِثْلَ صِينِ (۱۰/۹۹)۔ لیکن تو چاہتا ہے کہ لوگوں کو مجبوراً مومن بنا دے۔ یاد رکھو۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَوْعِدَ مِنَ الرَّحْمٰنِ بِأَذْنِ اللَّهِ (۱۱)۔ کوئی شخص بھی خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا۔

اگر یہاں اذن کے معنی حکم یا اجازت لئے جائیں (یعنی یہ کہا جائے کہ کوئی شخص خدا کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا)۔ تو نہ صرف یہ کہ یہ چیز اَفَأَنْتَ تُكْفِرُ ۚ النَّاسَ (کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا) کے خلاف ہوگی — کیونکہ جب صورت یہ ہو کہ ایمان مشروط ہو جائے خدا کے حکم یا اجازت سے، تو انسان مجبور قرار پا جائے گا۔ بلکہ یہ قرآن کی ساری تعلیم کے خلاف ہوگا — اس لئے یہاں

إِذْنُ اللَّهِ سے مراد خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ اب رہی یہ بات کہ انسان اپنا اختیار و ارادہ صحیح طور پر کس طرح استعمال کر سکتا ہے تو اس کے لئے آیت کے اگلے حصہ میں یہ کہہ کر بات واضح کر دی کہ **وَيَجْعَلُ اللَّهُ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ** (۱۰/۱۰۰)۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر بات واضح نہیں ہوتی۔ وہ (CONFUSED) رہتے ہیں۔ لہذا اِذْنُ اللَّهِ (خدا کا قانون) یہ ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے لئے راستے کا انتخاب کریں۔

(۶) سورہ مجادلہ میں ہے کہ یہ مخالفین اور منافقین جو خفیہ مشورے اور سازشیں کرتے رہتے ہیں، تو شیطان انہیں ایسا کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ **لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا**۔ اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعتِ مومنین کو افسردہ خاطر کرے۔ لیکن اسے (اور سب کو) معلوم ہونا چاہیئے کہ **وَلَيْسَ بِضَارٍّ لَهُمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ** (۵۸/۱۰)۔ شیطان، اِذْنِ خداوندی کے بغیر نہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر یہاں اِذْنِ اللہ کے معنی خدا کا حکم یا اجازت کئے جائیں، تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان بھی جو کچھ کرتا ہے وہ خدا کے حکم یا اجازت سے کرتا ہے۔ اس سے شیطان کا سارا تصور ہی الٹ جاتا ہے، اس لئے کہ اس کی تو سرشت (مستقل خصوصیت) یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کے حکم سے سرکشی اختیار کرتا اور سرتابی برتا ہے۔ بنا بریں، یہاں بھی اِذْنِ اللہ کے معنی قانونِ خداوندی ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ مخالفین جو سازشیں اور خفیہ مشورے کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد جماعتِ مومنین کی ایذا رسانی ہے، بسکن تمہیں اس پر یقین رکھنا چاہیئے کہ قانونِ خداوندی کے خلاف کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم اس کے قانون کو اپنی نگاہ میں رکھو اور جو کچھ اس کے تقاضے ہیں انہیں پورا کرتے رہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ **وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ** (۵۸/۱۰)۔ مومنین کا تو شعارِ زندگی یہ ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

لے شیطان کیا ہے؟ اس کے لئے میری کتاب ”ابلیس و آدم“ دیکھئے۔ یا لغات القرآن میں متعلقہ عنوان۔

ان تصریحات کے بعد اب ان آیات کی طرف آئیے جن میں کہا گیا ہے کہ اذنِ خداوندی کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آتی۔

اذنِ خداوندی کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آتی

جنگِ اُحد میں، جماعتِ مومنین کو اچھی بھلی کامیابی ہو رہی تھی کہ تیر اندازوں کے ایک دستے نے، اپنے کمانڈر کی ہدایات کی غلاوڑی کرتے ہوئے اپنی پوزیشن کو چھوڑ دیا جس سے ان کی فتح مہل شکست ہو گئی اور انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ سورۃ آل عمران میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

تم قانونِ خداوندی کے مطابق دشمن کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ تمہیں غلبہ حاصل ہو رہا تھا اور اس طرح خدا کا وہ وعدہ پورا ہو رہا تھا جو اس نے تم سے کر رکھا تھا لیکن عین اس وقت تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا ہو گئی۔ معاملہ پیش نظر میں تم نے باہمی تنازعہ شروع کر دیا اور تمہارے کمانڈر نے جو حکم دیا تھا، تم نے اس کی نافرمانی کی، حالانکہ فتح و کامرانی جو تمہارا محبوب مقصد تھا، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ قریبی مفاد پر لوٹ پڑے اور کچھ ایسے وہ گئے، جن کی نگاہیں مستقبل کے مفاد پر تھیں۔ یوں تمہارا رخ دشمن سے ہٹ کر دوسری سمت کو پھر گیا۔ (تمہیں شکست ہو گئی اور) اس طرح تم پر بات واضح ہو گئی۔ (اس کے بعد تم نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا۔ پھر اپنے مقام پر واپس آ گئے اور تمہیں کامیابی حاصل ہو گئی اور یوں، تمہاری لغزش کے اثرات مٹ گئے۔ اللہ کا قانون یہی ہے کہ ایک بار کی لغزش سے انسان ہمیشہ کے لئے کامرانیوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔ وہ جب بھی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے پر آجائے، خدائی نوازشات سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔ (۳/۱۵۱)

ان نقصانات کے سلسلہ میں جب تم نے بعد میں سوچنا شروع کیا تو لامحالہ تمہارے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ اِنِّیْ هٰذَا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (۳/۶۴)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ سب تمہاری اپنی وجہ سے ہوا اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔

اور اس کے بعد ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ (۳/۱۶۵)۔

اس دن میدان جنگ میں جو واقعات بھی رونما ہوئے، جو مصیبتیں تھیں پہنچیں، وہ سب باذن اللہ تھیں۔

جو تشریحات پہلے چلی آرہی تھیں، ان کی روشنی میں، باذن اللہ کا مفہوم اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ”جو مصیبتیں تھیں اٹھانی پڑیں وہ خود تمہاری اپنی غلطی کا نتیجہ تھیں اور یہ سب کچھ عین قانونِ خداوندی کے مطابق ہوا۔“

اور انہی تصریحات کی روشنی میں سورہ تغابن کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۶۴/۱۱)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے، وہ باذن اللہ — یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق آتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم میں چار الفاظ ایسے آئے ہیں جن سے نئے بصیرت میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ ہر واقعہ قانونِ خداوندی کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

قانون پیش نظر رہنے سے ہدایت وَمَنْ يُؤْمَرْ بِالْعَمَلِ فَلْيُحْسِنِ الْعَمَلَ (۱۱۰/۶۴) قَالَ لَهُ رَبِّي أَلَمْ نَبْعَثْ فِي هَذِهِ نَذِيرًا (۱۱۱/۶۴)

صداقت پر یقین رکھتا ہے، اس کے قلب کو ایسی راہ نمائی (ہدایت) مل جاتی ہے جس سے وہ علتِ معلول کی کڑیوں پر غور کر کے، اس کا اندازہ کر لیتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر کو ہے۔ مستقبل قریب میں کیا کچھ ہونے کا امکان ہے اور اس کے تدارک کی صورت کیا ہے — قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین اور ان کے تضمینات کے سلسلہ میں ضروری معلومات سے (اقبال کے الفاظ میں) انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پرودہ افلاک میں ہے
عکس اس کا میکہ آئینہ ادراک میں ہے

واضح رہے کہ اس سے مراد ”پیش گوئی“ نہیں، بلکہ فکر و تدبیر سے، علت و معلول کی کڑیوں پر غور کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا مراد ہے۔ اسی لئے اقبال نے ”آئینہ ادراک“ کہا ہے۔ پیشگوئیاں کرنے والوں کا تو عقیدہ یہ ہے کہ جب تک ادراک کے آئینے کو توڑ کر چکنا چور کر دیا جائے، انسان

روحانیت کے اس مقام پر پہنچ ہی نہیں سکتا جہاں سے اُسے غیب کی خبریں ملتی ہیں۔ ان کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ — چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است!!
 بہر حال، یہ ضمنی نکتہ تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ قرآن کریم کی رُو سے، اِذنِ اللہ سے مراد خدا کا مقرر کردہ قانون ہی ہے جو جو مستقل بھی ہوتا ہے اور غیر تبدیل بھی۔

نوٹ:- ہم نے اس مقام پر، اِذنِ اللہ سے متعلق اصولی بحث کی ہے۔ دیگر امور کے متعلق جہاں جہاں اِذنِ اللہ کے الفاظ آئے ہیں، ان کی بابت گفتگو متعلقہ مقامات میں کی جائے گی۔



ساتواں باب

خیر و شر

(GOOD AND EVIL)

انسانی فکر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسائل حیات میں سے کسی مسئلہ نے اسے اس قدر وقف پیچ و تاب نہیں رکھا جس قدر مسئلہ خیر و شر نے اسے غلطیاں و پیچاں رکھا ہے۔ مسئلہ خیر و شر درحقیقت 'مسئلہ تقدیر کا جزو لا ینفک' ہے، اس لئے یہ مسئلہ صرف مفکرین ہی کا محور فکر و نظر نہیں رہا، بلکہ اہل مذہب کا بھی مرکز توجہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں 'اس معتمہ کو بڑی شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے جسے سینٹ ٹامس ایکوینس (ST. THOMAS AQUINAS) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ

اگر شر کا وجود خدا کی مرضی سے ہے تو وہ (خدا) خیر مطلق نہیں ہو سکتا اور اگر شر خدا کی مرضی کے علی الرغم موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں کہلا سکتا۔

چونکہ زیر نظر کتاب میں ہم نے انداز یہ رکھا ہے کہ ہم تقاضا کرتے ہیں کہ اس سے متعلقہ مباحث کے سلسلہ میں فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں میں نہیں الجھیں گے، بلکہ عام فہم انداز میں ان مسائل پر گفتگو کر کے ان سے متعلق قرآنی تعلیمات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے، اس لئے ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے کہ انسانی فکر (حکمائے یونان سے لے کر عصر حاضر تک) نے اس باب میں کیا سوچا اور کیا کہا ہے۔ (جن احباب کو ان تفصیلات سے دل چسپی ہو وہ راقم اسطور کی کتاب — انسان نے کیا سوچا؛ — کا مطالعہ فرمائیں)۔ یہاں ہم، انسانی فکر کی عام سطح کے مطابق اتنا بتائیں گے کہ وہ الجھاؤ کیا ہیں جن میں پھنس کر ذہن انسانی ہزاروں سال سے اس کش مکش میں گرفتار چلا آ رہا ہے اور اس پس منظر میں یہ بتائیں گے

کہ قرآن کریم ان پیچیدگیوں کا حل کیا بتاتا ہے۔

مشہور ہے کہ گوتم بدھ ایک راجہ کے بیٹے، اور ایک ریاست کے راجہ (ولی عہد) تھے۔ تھے تو

شہزادہ لیکن فطرت نے انہیں بڑا درد آشنادل (اور حساس

حساس قلوب کے تاثرات | قلب، عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ چوبہٹا کو ہٹی کھا جاتی ہے اور ہٹی پر کتا جھپٹ پڑتا ہے۔ مرغی کے چوزے کو چیل اُچک کر لے جاتی ہے اور ہرن کو شیر بھاڑ کر کھاتا ہے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ایک غریب انسان فاقوں سے گھل گھل کر مر جاتا ہے اور ایک نادار بیمار، درد و کرب سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔ تو ان کا قلب حساس اسے برداشت نہ کر سکا اور اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ دنیا ہے ہی مصائب و آلام کا گھر اور ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ انسان دنیا کو ترک کر دے اور اس حد تک ترک کر دے کہ اس کے دل میں کوئی آرزو تک پیدا نہ ہو۔ جب دنیا کی طرف سے قطعِ علاق کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو وہ کاملِ علم احساس کی منزل میں داخل ہو جائے گا، جسے منروان کہا جاتا ہے، اوریوں اسے دنیاوی آلام و مصائب سے مکتی (بجات) حاصل ہو جائے گی۔ بعد میں اُن کے ان تاثرات نے فلسفہ کج حیثیت اختیار کر لی، جو اڑھائی ہزار سال سے انسانیت کے اعصاب پر چھایا ہوا ہے۔

چونکہ دنیا نام تھا جہانِ آب و گل؛ یعنی مادہ (MATTER) کا، اس لئے، اس سے یہ کلیہ

مادی دنیا سے نفرت | مستنبط کر لیا گیا کہ مادہ ایک دلدل ہے جس میں انسانی روح بُری طرح پھنس گئی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ روح کو

مادہ کی اس قید سے چھڑا دیا جائے۔ طریقہ اس کا بھی ترکِ دنیا ہی ہے اور یہ مقصد مختلف ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس مسلک کو تصوف کہا جاتا ہے جو دنیا کی ہر قوم میں متواتر چلا آ رہا ہے، اگرچہ نام اس کا مختلف اقوام میں، مختلف رہا ہے۔

ہندی مفکروں نے جب اس سوال پر غور کیا کہ (یہ کیا بات ہے کہ) کچھ لوگ دنیا میں ہنایتِ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسرے لوگ ساری عمر مصائب و تکالیف میں مبتلا رہتے ہیں، تو وہ اس

مسئلہ تنازع | نتیجے پر پہنچے کہ جن لوگوں نے اپنے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے تھے، انہیں موجودہ جنم میں خوش حالیاں اور خوش گواریاں میسر آتی ہیں۔ جنھوں نے بُرے کام کئے تھے

وہ مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ نظریہ درحقیقت، عقیدہٴ تناسخ - TRANSMIGRATION OF SOUL - ہی کا دوسرا نام تھا جو فکرِ یونان کی پیداوار تھا اور جہاں سے اسے ہندی و دونوں نے مستعار لے لیا تھا۔

کچھ دانشوروں نے جب یہ دیکھا کہ دنیا میں جھوٹ، فریب، چوری، ظلم، نا انصافی، عام ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کی فطرت ہی بد واقع ہوئی ہے۔ عیسائیت آگے بڑھی تو اس نے اس بُنیاد پر گناہِ اولین (ORIGINAL SIN) کی عمارت استوار کر لی۔ اس نے کہا کہ آدم اور اس کی بیوی نے بہشت میں جو گناہ کیا تھا اس کا اثر یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اس گناہِ اول کی آلائش اپنے ساتھ لئے اس دنیا میں آتا ہے اور انسانوں کی تمام اخلاقی خرابیوں کی جڑ یہی آلائش ہے۔ اس کے دور کرنے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان، جنابِ مسیحؑ کی تصلیب اور کفارہ پر ایمان لائے۔

ایرانی دانشوروں نے کہا کہ نہیں۔ بات یوں نہیں۔ بات یوں ہے کہ دنیا میں دو مستقل اور باہم درگیر متضاد قوتیں ازل سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک ظلمت (تاریکی) کی قوت ہے، جو سیوں کی شہوت (MAGICAL) جسے اہرمین کہتے ہیں، اور دوسری نور (روشنی) کی قوت جسے یزداں کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں ہر آن جنگ جاری رہتی ہے جسے خیر و شر کی کش مکش کہتے ہیں۔ یہ شہوتِ تاریکی (DUALISM) قدیم ایرانی جو سیوں کا مذہب ہے جسے (جناب) زرتشت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ کائنات میں تضادات کی یہی جنگ ہے جس نے جرمن فلاسفر، ہیگل کے نظریہٴ جدلیت (DIALECTICISM) کو جنم دیا اور جس پر مارکس کے معاشی نظریہ کی عمارت استوار ہے۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں متضاد قوتیں ہیں ہی نہیں جنہیں ہم متضاد قوتیں سمجھتے ہیں ان کے تضاد کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے ہم (مثلاً) دایاں اور بایاں یا اوپر اور نیچے کہتے ہیں۔ یہ محض اضافی الفاظ (RELATIVE TERMS) ہیں۔ اس اعتبار سے، ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ دنیا میں، شر کا وجود نہیں، خیر ہی خیر ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا مکتبِ فکر (جس کا امام شوہنہار ہے) یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ دنیا شر ہی شر ہے۔ اس میں خیر کا وجود ہی نہیں۔ یہ شوہنہار کا فلسفہٴ قنوطیت (ظہر در حقیقت) گو تم بدھ کے نظریہ ہی کی صدائے بازگشت ہے۔

جس شخص کا ذہن ہو رسا، لیکن (بد قسمتی سے) اعصاب ہوں کمزور، تو اس کی فکر پر لازماً قنوطیت (PESSI-MISM) چھا جاتی ہے۔ شوہنہار کے ساتھ ہی ہوا تھا۔

ایک مکتب فکر کا خیال یہ ہے کہ خیر اور شر موجودی الخارج نہیں ہوتے۔ یہ ان تاثرات کا نام ہے جو انسان مختلف واقعات سے اخذ کرتا ہے۔ مثلاً کسی جنگل میں (جہاں کوئی انسان نہ بستا ہو)۔ اگر آندھی کا طوفان یا بارش کا سیلاب آجائے، تو اسے ہم بتا ہی (شر) نہیں کہتے لیکن وہی طوفان یا سیلاب جب کسی بستی میں قیامت برپا کر دے، تو وہ ہمارے لئے شر بن جاتا ہے۔

یا، اس سے بھی برجستہ مثال میں — رات کی تاریکی، رہزن کے لئے خیر ہوتی ہے اور راہرو کے لئے شر — لہذا، ان کے نزدیک، خیر اور شر، انسان کے داخلی تاثرات ہیں۔ ان کا وجود مستقل بالذات کچھ نہیں۔

مختصراً، یہ ہیں مسئلہ خیر و شر کے وہ بگولے جن میں فکر انسانی ہزاروں سال سے طلسم پیچ و تاب بن کر مبتلائے گردش ہے اور جن سے باہر نکلنے کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بگولے، خیر و شر کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ خود ذہن انسانی کے پیدا کردہ ہیں۔ وہ خود ہی انہیں پیدا کرتا ہے اور جب ان کے بندھنوں میں پھنس جاتا ہے تو پیچھے چلانے لگ جاتا ہے کہ مجھے ان سے رہائی کی کوئی شکل نظر نہیں آتی؛ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں مجبوس

خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سید

آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے؟

❦ قرآنی تعلیم

سب سے پہلے خارجی کائنات کے حوادث کو لیجئے جنہیں فطری شر (NATURAL EVIL) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ مَا خَلَقْنَا السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ وَبَيْنَهُمَا إِلَّا بِإِذْنِ الْحَقِّ (۱۵/۸۵)۔ قرآن کریم میں اس مضمون کی متعدد آیات ہیں (یعنی خدا نے کائنات کو بالحق پیدا

کیا ہے۔ لفظ حق کے معانی متعدد ہیں، لیکن موضوع زیر نظر کے اعتبار سے اس کے بنیادی معنی ہیں ایسی چیز جس کا نتیجہ تعمیری (CONSTRUCTIVE) ہو تخریبی (DESTRUCTIVE) نہ ہو۔ اس کے برعکس باطل کے معنی ہیں تخریبی نتائج پیدا کرنے والا۔ یہاں سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے کائنات کی تمام اشیاء اور جو کچھ اس میں ہوتا ہے، سب کا مقصد تعمیر ہے۔ تخریب نہیں۔ بالفاظ دیگر ان کا نتیجہ خیر ہے شر نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کائنات میں بے شمار قوتیں کار فرما ہیں انہیں (FORCES OF NATURE) کہا جاتا ہے اور یہ تمام قوتیں خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ جوں جوں یہ ان قوانین کا علم حاصل کرتا جائے گا، فطرت کی قوتیں اس کے تابع فرمان ہوتی جائیں گی تا آنکہ یہ ایک دن ان تمام قوتوں کو مستحکم کر لے گا۔ وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) خدا کا ارشاد ہے۔ یعنی ساری کائنات انسان کے لئے مستحکم کر دی گئی ہے۔

جب تک انسان کسی فطری قوت سے متعلق قانون کا علم حاصل نہیں کرتا (اسے سائنسی انکشافات کہتے ہیں) وہ قوت سرکش و بیباک رہتی ہے اور انسان کے لئے تباہیوں کا موجب بنتی ہے۔ جب یہ اس سے متعلق قانون کا علم حاصل کر کے، اسے مسخر (HARNES) کر لیتا ہے، اس سے ہزاروں تعمیری کام لئے جاسکتے ہیں۔ ذہن انسانی کے عہد طفولیت میں، جب اس نے ہنوز قوانین فطرت کا علم حاصل نہیں کیا تھا، کائنات کی تمام قوتیں بے باک، فہلہذا، اس کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب تھیں۔ جوں جوں یہ ان کا علم حاصل کر کے، انہیں مسخر کرتا چلا گیا، وہ مضرت رسا ہونے کے بجائے، منفعت بخش بنتی چلی گئیں۔ وہ اشیاء تو منفعت بخش نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی تھیں لیکن انسان کو ان سے مفاد حاصل کرنے کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ قرآن کریم نے ان ارباب ایقان و فکر اور اعیان تحقیق و تجسس کو درخور تبریک قرار دیا ہے جو مسلسل غور و فکر اور پیہم تحقیق و تفتیش سے کائناتی قوتوں کے مبینی برحق ہونے کے دعوے کی صداقت کا علی ثبوت

ارباب فکر و تحقیق کی تحسین

ہم پہنچائیں۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

ان لوگوں کے لئے جو عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں، کائنات کی تخلیق اور دن اور رات کی گردش میں، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

یعنی اُن صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے، جو زندگی کے ہر گوشے میں، گھرے، بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے اور اپنی تحقیقات کے بعد، علی وجہِ البصیرت پکاراٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اس کارِ کائنات کو بے مقصد اور تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ (۱) یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر تباہیوں اور بربادیوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں (تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور علمی تجربات کے بعد، اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح) تباہ کن عذابِ زندگی سے محفوظ رہیں۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سچی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

(۱۸۹ - ۱۹۱/۳)

انھیں "علماء" کہا جاتا ہے | کارِ کائنات پر اس طرح غور و فکر کرنے والوں کو قرآن

"علماء" کہہ کر پکارتا ہے۔ (۲۷ - ۳۵/۲۸)

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا کے علمی ثبوت کے لئے تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ فطرت کی وہ مہیب قوتیں جو سرکش اور بے باک ہونے کی وجہ سے قیامتِ نیز تباہیاں مچایا کرتی تھیں اور اس وجہ سے انسان سمجھتا تھا کہ وہ شر ہی شر ہیں، جب انسان نے ان پر قابو پا لیا تو وہ

فطرت کی قوتیں | ہزار منفعت بخشوں کا موجب بن گئیں اور خیر ہی خیر نظر آنے لگیں۔ بارش کا پانی جب انسانی کنٹرول میں نہیں ہوتا تو سیلاب بن کر تباہیاں لاتا ہے لیکن جب انسان اسے ساحلوں میں مقید

کر دیتا ہے تو وہ زمینِ مُردہ کے لئے حیاتِ تازہ کا پیا مبر اور زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ آگ شعلہ بیباک کی شکل میں ہو تو بستیوں کی جہتیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے لیکن جب وہ انسانی قبضہ (کنٹرول) میں آجاتی ہے تو ہم تن خیر بن جاتی ہے۔ سانپ، بچھو اور دیگر سینکڑوں قسم کے زہریلے جانور، جو اڑتی پھرتی موت اور چلتی پھرتی ہلاکت کے علاوہ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتے تھے اور جن کے متعلق کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا نے انہیں پیدا کیوں کر دیا ہے، اب انہی کے زہروں سے ایسے ایسے تریاق تیار کئے جا رہے ہیں جو سینکڑوں ہلک بھلک بیماریوں کا علاج ہیں۔ اس کی ایک زندہ اور مجسمہ شہادت خود وہ شخص ہے جو اس وقت ان سطور کو لکھ رہا ہے اور اپنے خیالاتِ قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ جب ۱۹۶۳ء میں میرا ایک آپریشن ہوا، تو آپریشن تو کامیاب رہا لیکن اس کے بعد ایک حادثہ کی وجہ سے اس طرح خون جاری ہو گیا کہ وہ ٹھمتا ہی نہیں تھا۔ معالج نے، جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ، سدا پناہ و محبت تھا، سب کچھ کر دیکھا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ نوبت بایں جا رسید کہ میں بے ہوش ہو گیا اور اعزہ واقارب، حتیٰ کہ خود ڈاکٹر صاحب میری زندگی کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ میرا سانس اکھڑ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے آخری تدبیر کے طور پر ایک انجکشن دیا۔ خون رُک گیا۔ میں نے آنکھ کھول دی اور رفتہ رفتہ، موت کے دیرالوں سے دوبارہ زندگی کی وادیوں کی طرف لوٹ آیا۔ بعد میں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ وہ کون سا آپ حیات تھا جس نے یہ مسیحائی کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس دوائی کا نام (REPTILASE) ہے جو سانپ کے زہر سے تیار ہوتی ہے۔ یہ سُن کر میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا۔

اقبال نے، خدا اور آدم کے مکالمہ میں، آدم کی زبان سے کہا تھا کہ
 من آفم کہ از سنگ آئینہ سازم
 من آفم کہ از زہر نوشینہ سازم

۱۷ حبیبِ مکرم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب۔

زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا۔

اگر آپ "از زہر نوشینہ سازم" کی زندہ شہادت لینا چاہیں تو کسی کیمسٹ کی دوکان پر جائیے۔ آپ کو تقریباً نوے فی صد شیشیوں پر لکھا ملے گا (POISON) اور ان میں سے ہر دوائی کسی نہ کسی مرض کے لئے تریاق ہوگی اور یوں ہر زہر زبان حال سے پکار رہا ہوگا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَنِيْ بِاِطْلَاقٍ — اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تخریبی نتائج کے لئے نہیں پیدا کیا تھا۔ یہ انسان کی کوتاہی علم تھی جس کی وجہ سے اس نے ایسا سمجھ رکھا تھا۔

انسان کی یہی کوتاہی علم تھی جس کی وجہ سے وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ بعض بچے پیدائشی، 'لوئے' لنگڑے، اپاہج، حتیٰ کہ اندھے کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بچوں کے پیدائشی نقائص

ان کے کسی پچھلے جنم کے کرموں (غلط اعمال) کا نتیجہ ہیں۔ وہ اس سے زیادہ اور سوچ بھی کیا سکتا تھا؛ لیکن جب انسان علمی تحقیقات میں آگے بڑھا تو اس نے ان حوادث کا راز بھی پالیا۔ چنانچہ اب ترقی یافتہ اقوام کا یہ عالم ہے کہ وہاں پہلے اس جوڑے کا، جو شادی کا خواہاں ہو، طبی معائنہ کرتے ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا تو نہیں جو موروثی طور پر بچے میں منتقل ہو جائے۔ اس طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد، وہ رحم مادر میں جنین کی حالت کا معائنہ کرتے رہتے اور اسے، وہیں ضروری سامان حفاظت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان علمی انکشافات اور حسن تدابیر کا نتیجہ ہے کہ ان اقوام میں بچے بالعموم تندرست و توانا پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں، اس شعبہ میں مزید تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، تاکہ بچوں کے ان نقائص و اسقام کی مدافعت کا بھی انتظام کیا جاسکے جو ابھی ان کی گرفت میں نہیں آئے۔

شر (EVIL) کی سب سے زیادہ سنگین اور کرب آمیز مثال درد (PAIN) کی دی جاتی ہے،

اور جسے درد ہو رہا ہو، اسے اس کا "فلسفہ" سمجھایا ہی نہیں جاسکتا۔ (شدید درد درد کا مسئلہ کی حالت میں، بالعموم سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے)۔ لیکن علم الامراض

کے ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ درد تو فطرت کی رحمت ہے۔ انسانی جسم کی مشینری اس قدر پیچیدہ اور پُر اسرار سی ہے کہ کسی دوسرے انسان کو تو ایک طرف، خود اپنے آپ کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ چل کیسے رہی ہے اور اس میں کوئی سقم تو نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اس مشینری میں نقص اور خرابی پیدا ہو گئی ہے، فطرت نے ایک (DEVICE) تجویز کر رکھی ہے جسے دس دکھا جاتا ہے۔ درد، درحقیقت وہ خطرے کی

گھنٹی ہے جو پکار پکار کر، بلکہ چلا چلا کر، آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتی ہے۔ اگر یہ گھنٹی نہ بجے تو کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے کہ مشین کے اندر کوئی خرابی واقع ہو رہی ہے تا آنکہ وہ مشین چلتے چلتے رگ ہی نہ جائے (یعنی انسان کی موت واقع ہو جائے)۔ اس نقطہ نگاہ سے 'درد' درحقیقت ایک نعمت ہے۔

لیکن فطرت کے دوسرے طریقوں کی طرح، یہ طریق بھی (CRUDE) سا ہے اس لئے انسان اس تلاش میں ہے کہ اس کی جگہ کوئی ایسا طریق دریافت کر لیا جائے جس سے آنے والے خطرہ کا علم تو قبل از وقت ہو جائے لیکن کرب و اذیت ساتھ نہ آئے۔ اس سلسلہ میں بڑی شد و مد سے ریسرچ ہو رہی ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک ریسرچ سکاٹر (GEORGE A. W. BOEHM) کا ایک مینسٹو مقالہ ہے، جس میں اس نے بتایا ہے کہ جس رفتار سے یہ تحقیقات جاری ہیں، اس کے پیش نظر توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ دس سال کے عرصہ میں ایسا ہو جائے کہ انسان کو جسمانی درد سے نجات مل جائے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

بہر حال، ہم کہہ رہے تھے کہ اشیائے کائنات کے متعلق جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے ان کا شر کا پہلو خیر سے بدلتا چلا جاتا ہے۔

اشیاء کی مقدار استعمال | اشیائے کائنات کے خواص دریافت کرنے کے ساتھ، یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کا کس "مقدار" میں استعمال مہر حیات ہے۔

اور کس مقدار میں ہلاکت آفریں۔ بالفاظِ دیگر، ان اشیاء کی "تقدیرات" (پیمانوں) کا معلوم کرنا۔ پانی کا ایک گلاس مہر حیات ہے لیکن وہی پانی جب زیادہ مقدار میں پیٹ میں چلا جائے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ ڈوب کر آدمی اسی طرح مرتا ہے۔ یا مثلاً، سنگھیا کے دس قطرے، تقویت بخش ہوتے ہیں اور پچاس قطرے ہلاکت آفریں۔ اشیاء کے استعمال میں ان کی "تقدیرات" (پیمانوں) کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اس کی مین شہادت ہو میو پیٹک طریق علاج ہے۔ اس طریق علاج کا نقطہ ماسک یہ ہے کہ کسی شے کے زیادہ مقدار میں کھانے سے انسانی طبیعت میں جس قسم کی ناخوشگوار کیفیات پیدا

ہوتی ہیں، اس شے کی ہو میو پیتھک معتاد (Dose) سے ان کیفیات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ہر شے کی اصل خیر ہے۔ یہ اس کی غلط "مقدار" ہے جس سے وہ شر بن جاتی ہے۔

اور اس سے ہمیں قرآن کریم کی اس آیت جلیلہ کا مفہوم آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۱﴾ اَعُوذُ بِرَبِّكَ ﴿۲﴾ اَفَلَا تَعْلَمُ ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۴﴾ (۱۳۱-۱۳۳)

یعنی اس بات کی احتیاط بر تو کہ خدا نے کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے، ان غلط استعمال سے وہ ہمارے لئے شر نہ بن جائے۔ یعنی خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس لئے اشیائے کائنات میں مختلف خواص و تاثیرات رکھ دی ہیں۔ اب ان کا مضر اور منفعت بخش ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ تم انہیں استعمال کس طرح کرتے ہو۔ اگر تم انہیں خدا کے مقرر کردہ قوانین طبعی کے مطابق استعمال کرو گے تو ان کا نتیجہ خیر ہوگا۔ ان کے خلاف استعمال کرو گے تو اس سے شر پیدا ہوگا۔ اسی بنا پر سورہ آل عمران میں بطور اصول بتایا گیا ہے کہ بِرَبِّكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵﴾ (۳/۲۵) خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس لئے اشیائے کائنات کو پیدا کیا اور ان کی "تقدیرات" مقرر کر دیں۔ اگر

انہیں، ان کے مطابق استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوگا۔ کہ **خدا پر شر خیر ہے** اگر انہیں، ان کے خلاف استعمال کیا جائے تو

اس سے شر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی شر خود انسان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جسے سورہ نسا میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس آیت کو ہم پہلے بھی سامنے لا چکے ہیں، لیکن نقطہ نظر کی اہمیت اور نسبت کے لحاظ سے اس کا دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ آیت یہ ہے کہ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ﴿۹﴾ (۴/۹)۔

"تمہیں جو خوشگواریاں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور جو مصیبتیں تم پر آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔" اور اس سے پہلے ہے قُلْ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ ﴿۸﴾ (۴/۸)۔

نتائج سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق عمل کرو تو نتیجہ خیر ہی خیر ہے۔ ان کے خلاف ورزی کرو تو شر ہی شر۔ دوسری جگہ ہے وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ ﴿۲۸﴾ (۲۸/۲۸)۔ جو خدا کے ہاں سے (یعنی اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلنے سے) ملتا ہے۔

وہ خیر (منفعت بخش) بھی ہوتا ہے اور پائندہ بھی۔

بعض مقامات پر اس حقیقت کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ **وَإِذَا آتَيْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ آعْرَضَ وَتَأْبَغْأَ رَبَّهٗ ۚ** جب ہم انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں (آئینا) ہم نوازتے ہیں (تو وہ اعراض برتتا اور بے رُخی اختیار کر لینا ہے۔ **وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ ۖ كَانُ يَوَدُّ أَنَّ سَا۟ءَ مَا ۖ** (۸۳/۱۷۷) اور جب اسے نقصان پہنچتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں خدا نے نقصان یا شر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ دوسری جگہ ہے۔ **وَإِذَا آتَيْنَا النَّاسَ رَحْمَةً ۖ فَرَّحُوا بِهَا ط ۖ** جب ہم انسان کو رحمت سے لطف اندوز کرتے ہیں (آؤتینا) ہم ایسا کرتے ہیں (تو وہ اترنے لگتا ہے **وَإِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۖ يَكْمَأُ قَدَمَتُ أَيُّدِيهِمْ** **وَإِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ۖ** (۳۶/۳۶) نیز (۴۲/۴۸)۔ جب اسے، اس کی خود کردہ غلطیوں کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سورہ اعراف میں یہ انداز اور بھی لطیف اور بلیغ ہو گیا ہے۔ جہاں کہا کہ **وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِي خَبِثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَجِسًا ۖ** (۷۸/۷۸)۔ زرخیز زمین، خدا کے قانون کے مطابق (بإذن ربہ) نہایت عمدہ فصل پیدا کرتی ہے لیکن ناقص زمین، بہت کم پیداوار دیتی ہے۔ دیکھئے یہاں بِإِذْنِہ نہیں کہا حالانکہ یہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

اخلاقی خیر اور شر

یہاں تک ہم نے اشیائے کائنات کے طبیعی خواص و اثرات، ان کے طبیعی طریق استعمال اور ان سے پیدا ہونے والے منفعت بخش (خیر) اور مضرت رساں (شر) نتائج سے بحث کی ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں، خیر اور شر کا ایک اور گوشہ بھی سامنے آتا ہے جس کا تعلق طبیعی قوانین سے نہیں۔ تلوار کی طبیعی خاصیت یہ ہے کہ وہ گلا کاٹ دیتی ہے۔ وہ تلوار ایک ظالم کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس کے مظلوموں اور کمزوروں کا گلا کاٹے گا لیکن وہی تلوار اگر کسی انصاف پسند انسان کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس کے ظالموں کی کلائی سروڑ کر، مظلوموں کی حفاظت کا سامان پیدا کر دے گا۔ تلوار وہی ہے اور اس کی طبیعی خاصیت بھی

وہی لیکن جس مقصد کے لئے اسے استعمال کیا گیا ہے وہ اس کے مقصد، معیارِ خیر و شر

خیر و شر ہونے کا معیار بن جاتا ہے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ ایک شخص فریب دے کر کسی شخص کا روپیہ ہتھیا لیتا ہے۔ ”فریب دینے“ میں کوئی طبعی ذریعہ (تلوار وغیرہ) استعمال نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف عقلِ انسانی کام میں لائی گئی ہے۔ آپ اپنے اس نقصان کا ذکر اپنے کسی ایسے دوست سے کرتے ہیں جو زیادہ ذہین اور فطین ہے۔ وہ ایسی تدبیر کرتا ہے کہ اُس فریب کار کو آپ کا روپیہ واپس دینا پڑتا ہے۔ اس میں بھی آپ کے اس دوست نے عقل ہی کا استعمال کیا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ عقلِ انسانی بھی ایک قوت ہے اور جس مقصد کے لئے اسے استعمال کیا جائے اس کے مطابق وہ خیر یا شر بن جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مقاصد کا تعین کس طرح کیا جائے جن کے مطابق، مادی قوتیں، یا خود انسانی صلاحیتیں شر کے بجائے خیر بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی کی رُو سے ان مقاصد کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ عقل اس سوال کا جواب

مقصد کا تعین وحی کر سکتی ہے

استعمال کیا جائے؛ جس طرح تلوار اپنے استعمال کا مقصد خود متعین نہیں کر سکتی اسی طرح عقلِ انسانی بھی اپنے استعمال کا مقصد خود متعین نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے عقلِ انسانی سے بالاتر کوئی سرچشمہ ہونا چاہیے۔ یہ چشمہ وحیِ خداوندی ہے اور جو معیار، وحی کی رُو سے متعین ہوتا ہے، اُسے دین کی اصطلاح میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ جب فطرت کی قوتوں، اشیائے کائنات، یا خود عقلِ انسانی کو مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ جب انھیں، ان اقدار کے خلاف صرف میں لایا جائے تو اس کا نتیجہ شر ہوتا ہے۔ جو معاشرہ، مستقل اقدارِ خداوندی سے انکار کرتا ہے اور اپنے تمدنی نظام کو صرف عقل کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے، اسے باطل کا نظام کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ، انسان کے لئے شر ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں، فطرت کی قوتوں اور اشیائے کائنات کا استعمال، عقل کی رُو سے کیا جاتا ہے اور عقل کا استعمال اپنے جذبات کی رُو سے۔ جذبات کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ ان جبلتوں (INSTINCTS) کا نام ہے جو انسان کو حیوانی زندگی سے وراثت میں ملے ہیں اور ان جبلتوں میں تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) اور

تغلبِ خویش (SELF - AGGRESSION) کے جذبات بنیادی ہیں۔ یہی جذبات جب انفرادی سے اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں، تو تحفظِ خویش سے مراد ہوتا ہے، اپنی قوم کا تحفظ۔ اب آپ سوچئے کہ جب دنیا میں مختلف قومیں بستی ہوں اور ہر قوم، فطرت کی قوتوں کو، اپنی اپنی عقل (مصالح) کے مطابق اپنے تحفظ اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے، استعمال میں لائے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی جہنم جس میں آج تمام اقوامِ عالم بُری طرح سے گرفتار ہیں! یعنی وہ جہنم جو ان شرار (چنگاریوں) کا بھڑکایا ہوا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مستقل اقدار کے خلاف استعمال کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔

موجودہ دور کا جہنم | یہی وہ نظامِ باطل ہے، جس میں، مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے آرزو مند انسانوں کو طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اسی اعتبار سے، اس معاشرہ کی خرابیوں کے متعلق کہا کہ کَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِیْرًا ۵۱/۷۰ اس کی چنگاریاں اڑ کر لگ جاتی ہیں۔

مستقل اقدار کو نظر انداز کر دینے سے جہاں نوعِ انسانی، قوموں میں بٹ جاتی ہے اور قوموں میں بعض زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہیں اور دوسری قومیں کمزور رہ جاتی ہیں — اور طاقت ور قومیں، کمزور قوموں کا خون چوس کر، اور طاقت ور ہوتی چلی جاتی ہیں — اس طرح، ایک قوم کے اندر مختلف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان طبقات میں بالادست طبقہ، قوم کی دولت اور قوت کا مالک بن بیٹھتا ہے اور زیردست طبقہ ان کا محکوم و محتاج ہو کر، ان کا خدمت گزار بن جاتا ہے۔

پیدائشی امیر اور غریب | پھر اسی باطل نظام کی رُو سے، بالادست طبقہ میں پیدا ہونے والے بچے، زندگی کی مرقہ الحالیاں ہی نہیں، بلکہ پوری پوری عیش سامانیاں ساتھ لئے پیدا ہوتے ہیں اور نچلے طبقہ کے گھروں میں جہنم لینے والے بچے، ساری عمر عسرت اور افلاس میں گزارتے ہیں اور چونکہ معاشرہ میں معیارِ تکرم، دولت قرار پاتا ہے، اس لئے، یہ مفلس اور غریب انسان، اور ان کے بچے، تمام انسانی صلاحیتوں کے باوجود، ذلیل و خوار سمجھے جاتے ہیں۔

ہندو پنڈتوں نے اس تفاوت کی توجیہ یہ وضع کی کہ اختلافِ مدارج و معیارِ زیست، انسان کے پچھلے جنم کے کرموں (کاموں) کا نتیجہ ہیں — جس نے سب سے زیادہ خراب کام کئے تھے، وہ شہور پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اوپر دیش، پھر کھشتری اور سب سے اوپر خود برہمن — ظاہر ہے کہ جب

تعیین مراتب کرنے والے برہمن ہوں تو سب سے اونچا طبقہ برہمنوں کا قرار نہیں پائے گا، تو اور کس کا قرار پائے گا؟

جن لوگوں نے سابقہ جنم کے نظریہ سے اتفاق نہ کیا، انھوں نے، اس اختلاف مدارج کے

متعلق کہہ دیا کہ ان کا تعین خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہے

خدا کی طرف سے امیر بنادے، جسے چاہے مفلس اور محتاج رکھے۔ جسے چاہے عزت عطا کر دے، جسے چاہے ذلیل و خوار کر دے۔ یہ ہر ایک کا نصیب اور قسمت ہے۔ اسی کو انسان کی تقدیر کہتے ہیں، جسے نہ کوئی شخص اپنے لئے بنا سکتا ہے، نہ مٹا سکتا۔ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا اور اسے اس تکرار و اصرار سے دہراتے چلے گئے کہ عوام مستقلاً اس کے فریب میں آگئے۔ یہ سازش اس لئے کی گئی کہ عوام کی نگاہیں کہیں اس طرف نہ اٹھنے پائیں کہ یہ تفریق و تقسیم، خدا کی نہیں بلکہ اس غلط نظام کی پیدا کردہ ہے جس کے قیام و استحکام کا ذمہ وار بالادست طبقہ ہے۔ اور بالادست طبقہ میں ارباب نظم و نسق اور یہ حضرات و عظم و نصیحت، دونوں شامل ہیں۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

اس کے بعد، آپ پھر قرآن کریم کی اس آیہ جلیلہ کی طرف آئے جس میں کہا گیا ہے کہ حسنات و زندگی کی خوشگواریاں سب خدا کی طرف سے ملتی ہیں اور مصائب و آلام، تمہارے اپنے ہاتھوں کے لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مصائب و آلام، اس غلط نظام کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جو مستقل اقدار خداوندی سے اعراض برتنے سے وجود میں آتا ہے۔ اگر معاشرہ ان اقدار کے مطابق قائم ہو تو پھر ہر طرف سے حسنات کی بارشیں ہوتی ہیں۔ یہ اقدار، قرآن کے اندر محفوظ ہیں، اسی لئے خود قرآن کو

قرآن کریم بھی چشمہ خیر ہے، بھی خیر کہا گیا ہے۔ سورہ نحل میں ہے۔ وَ قِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ

یہ مخالفین، جماعت مومنین سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے۔ قَالُوا خَيْرٌ (۱۶/۲۰)۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اس نے خیر نازل کیا ہے۔ یعنی خدا خود خیر کا سرچشمہ ہے اور اس کی طرف سے نازل شدہ ضابطہ قوانین بھی خیر ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے سے، انسانی زندگی ہمہ تن خیر ہو جاتی ہے۔ شر اس کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتا ہے۔ خیر، اس کی طرف

سے۔ شر خود ہمارا آوردہ!

میرے ساتی نے عطا کی ہے مے بے دردِ صفا
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو مے پر مے کا ہے

یہ خیر کیا ہے۔ اس کی تشریح میں کہا۔ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَ
لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ خَيْرٌ (۱۶/۳۰)۔ جو لوگ، مستقل اقدار کے مطابق، حسن کارنامہ انداز سے
زندگی بسر کرتے ہیں، انہیں اس دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی
خوشگواریاں۔ یہاں سے ہمارے سامنے خیر کی ایک اور تعریف (DEFINITION) آئی
ہے جو غور طلب ہے۔

طبعی (یا حیوانی سطح کی) زندگی میں خیر و شر (بافعال اور نقصان) کا معیار بڑا واضح، صاف اور سیدھا
ہے۔ جس بات (یا کام) سے مادی مفاوہ حاصل ہوں، وہ خیر اور جس سے مادی نقصان ہو، وہ شر۔
اس سلسلہ میں اتنی بات اور بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ اس معیار کے مطابق، کوئی شے مستقل
طور پر باعث خیر یا موجب شر قرار نہیں پاسکتی۔ ایک ہی چیز جو ایک وقت میں (اُس وقت کے حالات کے
مطابق) منفعت بخش ہے، دوسرے وقت میں (بہ تبدیلی حالات) مضرت رساں ہو سکتی ہے۔ صحت کے
زمانے میں، دودھ منفعت بخش ہے۔ نزلہ، زکام، کھانسی میں مضرت رساں۔ یا (مقدار کے اعتبار سے)
ایک گلاس پانی منفعت بخش، ایک مٹکا پانی مضرت رساں۔ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ خیر اور شر اضافی
(RELATIVE) ہیں۔ مطلق (ABSOLUTE) نہیں۔

لیکن جب زندگی کو انسانی سطح پر دیکھا جائے۔ یعنی جہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ انسانی زندگی
اس کے مجموعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا
جاتا ہے، تو خیر اور شر (نفع، نقصان) کا ایک اور معیار سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ جن امور سے

انسانی ذات کی نشو و نما (DEVELOPMENT) ہو،
مطلق خیر و شر کا معیار جن سے اس میں استحکام (INTEGRATION)

پیدا ہو، وہ خیر اور جن سے اس کی نشو و نما رک جائے اور اس میں انتشار واقع ہو، وہ شر۔ چونکہ انسانی

ذات غیر مادی، فلہذا غیر مرنی ہے، اس لئے اس کے خیر اور شر کے پیمانے بھی محسوس نہیں ہو سکتے۔ مثلاً سنگھیا کھانے سے کیا نقصان ہوتا ہے اسے ہر شخص جان اور پہچان سکتا ہے، لیکن جھوٹ بولنے سے انسانی ذات کا کیا نقصان ہوتا ہے، اسے نہ دیکھا جاسکتا ہے نہ پایا۔ اس کے برعکس جھوٹ بولنے سے مادی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جھوٹ بولتا ہی اس وقت ہے جب اسے توقع ہو کہ اس سے اسے کچھ فائدہ حاصل ہوگا۔ منفعت کی توقع کے بغیر کوئی ذہنی مریض ہی جھوٹ بولے گا!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں تک انسانی ذات کا تعلق ہے، نہ اس کے نفع یا نقصان کا معیار مادی ہے، نہ پیمانے مادی۔ اس کا معیار مستقل اقدار ہیں جنہیں عام اصطلاح میں اخلاقیات (MORALS) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اخلاق کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ حیوانات میں اخلاق کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ جس معاشرہ میں انسانی ذات کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسے مادی تصور حیات اور اس نظام معاشرت کو سیکولر کہا جاتا ہے اس میں اخلاق (MORALS) کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس میں صرف سوسائٹی کے قوانین (SOCIAL LAWS) یا عدالتی قوانین ہوتے ہیں، جن کے بغیر انسان کی تمدنی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ ان معاشرتی یا عدالتی قوانین میں بیشتر ادبی ہوتے ہیں جنہیں اخلاقی ضوابط کہا جاتا ہے۔

مادی نظریہ حیات اور اخلاقیات

مثلاً جھوٹ نہ بولو، فریب نہ دو، کسی پر زیادتی نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کی حیثیت معاشرتی یا عدالتی قوانین کی ہوتی ہے، اخلاقیات کی نہیں۔ اگرچہ روش عامہ کے ماتحت انہیں اخلاقیات کہہ دیا جاتا ہے۔ اس فرق کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر ایک شخص کو معلوم ہو کہ اسے جھوٹ بولنے سے اتنا فائدہ ہوگا اور اسے اس کا بھی یقین ہو کہ اس کا یہ جھوٹ نہ سوسائٹی کے نوٹس میں آسکتا ہے اور نہ ہی عدلیہ کی مشنری کی گرفت میں، تو مادی نظریہ زندگی کی رو سے، کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو اسے جھوٹ بولنے سے باز رکھ سکے۔ اگر کوئی شخص معاشرے

لے جیسے ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے وہ ان نقوش کا نام ہے جو ابتدائی تعلیم و تربیت سے بچے کے دل پر منقوش ہو جاتے ہیں۔ جس قسم کے ماحول میں بچے کی تربیت، اسی قسم کا اس کا ضمیر۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جس قسم کے غلط ماحول میں موجودہ (بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۴۲ پر دیکھئے)

میں رسوائی یا عدلیہ کی گرفت کے خیال سے جھوٹ نہیں بولتا، تو اسے اعلیٰ اخلاق کا حامل نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص انسانی ذات کو تسلیم کرتا اور اس کے نفع یا نقصان پر نگاہ رکھتا ہے، وہ اس وقت بھی جھوٹ نہیں بولے گا، جب اسے یقین ہو کہ اس کا جھوٹ نہ سوسائٹی کے نوٹس میں آسکتا ہے اور نہ ہی عدلیہ کی گرفت میں اور جھوٹ بولنے سے اسے اس قدر مادی فائدہ ہوگا۔ وہ اس لئے جھوٹ نہیں بولے گا کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے (ہر چند اسے مادی فائدہ ہو جائے گا لیکن) اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ وہ مادی فائدے کو، اپنی ذات کے فائدہ پر قربان کر دے گا۔ اسے اخلاق کہا جائیگا۔

— قرآنی نقطہ نگاہ سے، کیریئر (حسن کردار) کی تعریف یہ ہے کہ جہاں کسی مادی منفعت اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو، انسان مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے (یعنی اپنی ذات کے فائدے کی خاطر) مادی مفاد کو قربان کر دے۔ مادی نظریہ زندگی یا سیکولر نظام میں قانون کی پابندی کا تصور تو ہوتا ہے، اخلاقیات کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں اخلاقیات کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ضابطہ قوانین میں بھی نت نئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی ان کی حیثیت بھی اضافی ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، جس ضابطہ اقدار کا تعلق انسانی ذات سے ہوتا ہے، اس کی حیثیت اضافی نہیں ہوتی۔ وہ اقدار مستقل اور غیر متبدل ہوتی ہیں اور ان کے نتیجہ میں جو خیر یا شر ظہور میں آتا ہے (یعنی انکی پابندی سے خیر اور ان کی خلاف ورزی سے شر) اسے خیر مطلق (ABSOLUTE GOOD) اور شر مطلق (ABSOLUTE EVIL) کہا جاتا ہے۔ یعنی

(۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ فریب دہی، ایک وقت میں تو موجب شر ہو اور دوسرے وقت میں خیر کا موجب۔

(۲) نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ فریب، موجب شر ہو اور تھوڑا سا فریب باعث خیر۔

(۳) یا یہ کہ کسی زمانہ میں صداقت اور دیانت، خیر تھی اور بعد میں کذب و فریب، خیر ہو گیا ہو، یا ہو جائے۔

(ص ۱۴۱ کا بقیہ فٹ نوٹ) نوجوانوں کی تربیت ہوتی ہے اس کی رو سے ان کا ضمیر انہیں غلط کاریوں اور جرائم کو شیوں سے قطعاً نہیں روکتا۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی)

مستقل اقدار (جن کا تعلق انسانی ذات سے ہے) مستقل، غیر تبدیل اور مطلق ہیں۔

غلط معاشرہ (یا باطل کے نظام) میں چونکہ مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں ہوتا، اس لئے اس میں اگر ایک فرد، مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے اکثر و بیشتر، مادی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس تصادم میں مسلک خانقاہیت (قصوف) کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ چونکہ یہ مادہ (یا دنیاوی علائق) قابل نفرت ہیں، اس لئے تم مادی نفع یا نقصان کا خیال تکہ دل میں نہ لاؤ۔ دنیا کا ترک کر دینا ہی اصل حیات ہے۔ لیکن یہ فریب نفس ہے۔ آپ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو ترک کر ہی نہیں سکتے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر معاشرہ مستقل اقدار کے مطابق قائم کر لیا جائے تو ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جس میں انسان کے مادی مفاد اور اس کی ذات کے مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ اس لئے وہ افراد سے کہتا ہے کہ تم انفرادی زندگی بسر کرنے کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرو، جس میں معاشرہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم ہو جائے۔ اس میں تمہیں مادی مفادات بھی حاصل ہوں گے اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے گی۔ قرآن کریم، مادی مفادات کو دنیاوی حسنات سے تعبیر کرتا ہے اور ذات سے متعلق مفادات کو اخروی حسنات سے۔ اس لئے کہ حیاتِ آخرت کا تعلق انسانی ذات سے ہے، نہ کہ انسانی جسم سے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے خیر مطلق وہ ہے جس سے دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوں اور اخروی مفاد بھی — یعنی جس سے انسان کی طبعی زندگی بھی مرقہ الحایوں کی ہو اور اس کی ذات بھی مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اور شر مطلق وہ ہے جو اس کی خلاف نتائج پیدا کرے۔

اور اب ہمارے سامنے سورہ نحل کی اس آیت کا مفہوم نکھر کر آگیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب مومنین سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہاری طرف کیا نازل ہوا ہے تو وہ کہتے ہیں — خیر — یعنی لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَكَذَٰلِكَ أُمَّا الْآخِرَةِ ۖ خَيْرٌ (۱۷۳) یعنی جس کی رو سے مادی مفادات بھی حاصل ہوں اور انسانی ذات سے متعلق مفادات بھی۔ اسی بیج زندگی کو التین کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) مادی نظریہ زندگی (اور سیکولر نظام معاشرت) وہ ہے جس میں مقصود و مقصدی، محض مادی

مفادات ہوتے ہیں۔ یہ بھی الدین کے خلاف ہے۔

(۲) مسلکِ خانقاہیت (تصوف) وہ ہے جس میں مادی دنیا کو قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بھی

الدین کے خلاف ہے۔ اور

(۳) الدین (اسلامی نظامِ زندگی) وہ ہے جس میں مادی مفادات بھی حاصل ہوتے ہیں اور انسانی

ذات کا نشو و ارتقا بھی۔ یہ خیر مطلق ہے۔

یہی وہ خیر ہے جس کے متعلق کہا کہ یہ، ایمان اور تقویٰ سے ملتا ہے۔ یعنی خدا اور انسانی ذات پر

یقینِ محکم اور مستقل اقدار کی نگہداشت سے۔ وَ كُوْنُوْا اَنْتُمْ اٰمِنُوْا وَ اتَّقُوْا لَمْ تُدْبِهٖ

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ط وَ كَا نُوْا يٰعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۳۱)۔ اگر یہ لوگ ایمان و تقویٰ کے

مطابق زندگی بسر کریں تو انہیں خدا کے ہاں سے خیر مل جائے۔ اسے کاش! یہ اس حقیقت کو جان

سکتے۔ انہی کو دوسری جگہ ابرار کہا گیا ہے (۳/۱۹۴)۔ یعنی وہ جنہیں زندگی کی کشائشیں اور انسانی

ذات کی دو سعتیں نصیب ہیں۔ سوہ سخل میں ہے کہ جب مادی مفادات اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہو تو

اُس وقت مستقل قدر کو، مادی مفاد کے بدلے فروخت مت کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے (یعنی اپنی ذات

کے مفاد کو ترجیح دو گے) تو خدا کے ہاں سے تمہیں خیر ملے گا (۱۶/۹۵)۔ دوسری جگہ انہیں خیرِ لَدٰ

نَفْسِکُمْ کہا گیا ہے (۱۶/۹۴)۔ انسانی ذات پر ایمان جن لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا

ہوتا، وہ اس قسم کے ٹکراؤ میں بہتری اس میں سمجھتے ہیں کہ مادی مفاد کو ترجیح دی جائے۔ خیر و شر کے

امتیاز میں یہی غلط نگہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وَ عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَيْئًا

وَ هُوَ خَيْرٌ لَّکُمْ ج وَ عَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَ هُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ط وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ

وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۲۱۶)۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اس

میں تمہارے لئے خیر ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایک شے کو بہت مرغوب رکھو اور وہ تمہارے

لئے موجبِ شر ہو۔ خیر اور شر کے امتیاز میں اس قسم کے التباس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس

کے لئے تم اپنے علم کو معیار قرار نہ دو۔ بلکہ علمِ خداوندی (وحی) کو اساس اور بنیاد قرار دو۔ جسے وہ خیر کہے

اسے خیر سمجھو اور جسے وہ شر قرار دے اُسے شر سمجھو۔ طبعی زندگی اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ کا سنگین

ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں انسان کو، حق کے تحفظ کی خاطر جان تک دے دینی پڑے اُسے معرکہ

جہاد (یا قتال) کہا جاتا ہے۔ ایسے نازک موقع پر قرآن کی تاکید یہ ہے کہ تم، بلا خوف و خطر، سر بکف میدان کارزار میں آ جاؤ۔ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۹/۴۱)۔ اگر تم انسانی زندگی کی اصل و حقیقت پر نگاہ رکھو گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہی چیز تمہارے لئے موجب خیر ہے۔ انسان اس باب میں دھوکا اس لئے کھا جاتا ہے کہ طبعی زندگی کے مفاد اس کے بالکل قریب، سامنے پڑے دکھائی دیتے ہیں، اور خیر کے نتائج کو سامنے آنے میں وقت لگتا ہے۔ وَ کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ (۱۷/۱۱)۔ اور صرف طبعی زندگی پر نگاہ رکھنے والا انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔

جب مادی مفادات اور انسانی ذات کے مفاد میں تصادم ہو، تو اس وقت انسان اس بات کا (TEST) کرتا ہے کہ اس کی ذات میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ اگر اس کی ذات مستحکم ہوگی تو وہ اس تصادم میں، مادی مفادات کی جاذبیت سے مغلوب **ابتلا، یعنی احتساب خویش** نہیں ہوگا۔ اسی مرحلہ کو ابتلا کہا جاتا ہے۔ یعنی انسان کا اپنے آپ کو (TEST) کرنے کا موقع۔ جب اس قسم کے مواقع پر انسانی ذات، مادی جاذبیتوں پر غالب آ جائے تو اس سے اس میں مزید استحکام پیدا ہو جاتا ہے اور اسی قسم کی استحکام یافتہ ذات ہے، جو موت سے بھی مر نہیں سکتی۔ اسی لئے قرآن نے موت کو، انسانی ذات کے استحکام کے پرکھنے کی کسوٹی بتایا ہے۔ (۲۱/۲۵)؛ (۶۷/۲)۔ اور اسی لئے اس نے کہا ہے کہ تو انہیں خداوندی کی اطاعت اس طرح نہ کرو کہ اگر ان کی پابندی سے مفاد حاصل ہوتے ہوں تو تم ان کی اطاعت کرو اور جب اس سے نقصان ہوتا ہو تو ان سے اعراض بر تو۔ یہ انداز زیست تباہی کا موجب ہے۔ (۲۲/۱۱)

اب آپ سوچئے کہ جب قرآنی نقطہ نگاہ سے، وہ لوگ خاسروں نامراد رہیں گے جن کی نگاہوں میں انسانی ذات کے مفادات کی اہمیت کم ہو جائے تو جو لوگ سرے سے انسانی ذات (فلسفہ حیات آخرت) کے قائل ہی نہ ہوں، وہ انسانی زندگی کے حقیقی نفع اور نقصان **عصر حاضر کا انسان** میں کیا امتیاز کر سکیں گے۔ عصر حاضر کے انسان کی یہی کیفیت ہے

اور اسی کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

عشقِ ناپید و خرد می گزرش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خسم و پیچ میں لچھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ دَيْنُ عِ الْاِنْسَانِ بِالْشَّرِّ دُعَاءُكَ بِالْخَيْرِ (۱۱/۷۷)۔ جسے خیر کو طلب کرنا چاہیے تھا، وہ شر کو آوازیں دے دیکر بلا تارہتا ہے!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خیر و شر خود انسانی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ فطرت کی قوتوں اور خود اپنی صلاحیتوں کو مستقل اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ خیر ہوتا ہے، اور اگر وہ انہیں، ان اقدار کے خلاف استعمال کرتا ہے، تو اس کا نتیجہ شر ہوتا ہے۔ اس خیر و شر کے تولد کے لئے خدا کے قانونِ مکافات کے ترازو، ہر آن کھڑے ہوتے ہیں، اور انسانی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ، اسی وزن کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر خیر کا پلڑا جھکتا ہے تو زندگی کامیاب ہے۔ اگر وہ ہلکا رہا، تو اس کی زندگی ناکام و نامراد رہی۔ فَسَنُيَعْمَلُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۚ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۚ (۹۹/۸-۹)۔ اس میزان کی رو سے، انسانی اعمال کے خیر اور شر کا ذرہ ذرہ سامنے آجائے گا۔ (نیز دیکھئے ۲/۱۱۰، ۲/۲۱۵، ۲۴/۸۹، ۲۸/۸۰، ۴۳/۲۰)۔ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ خیر و شر انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ نہیں کہ خدا نے ہر انسان کے لئے خیر اور شر پہلے ہی سے مقدر کر رکھا ہے (یعنی جو مقرر کر رکھا ہے) وہ یہ ہے کہ انسان کے فلاں عمل کا نتیجہ خیر ہوگا اور فلاں کا شر، اور یہ چیز انسان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑ رکھی ہے کہ وہ جس طرح کا عمل چاہے، کرے۔ اسی کے مطابق اس کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ دنیاوی زندگی میں بھی اور آخری میں بھی۔

نفع اور نقصان

قرآن کریم میں، خیر و شر کے لئے نفع اور ضرر کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ فرق صرف الفاظ کا ہے، ورنہ جو اصول اور قانون، خیر و شر کے لئے مقرب ہے، وہی نفع اور نقصان کے لئے ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب انسان ہنوز رموز کائنات سے آگاہ نہیں ہوا تھا تو وہ فطرت

کی مہیب قوتوں سے ڈر کر، ان کے سامنے گڑ گڑاتا اور سجدہ ریز ہوتا تھا، تاکہ وہ ان کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ جلیبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے اسی احساس نے، اس کے ذہن میں ایسی ان بھی قوتوں کا تصور پیدا کیا جسے اس نے دیوی، دیوتا کہہ کر پکارا اور اس کے بعد ان کے محسوس مجسمے تراش کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرایا اور اسے بتایا کہ جن قوتوں کو وہ اپنا مسجود سمجھ رہا ہے، وہ سب اس کے تابع فرمان پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے لئے:

دیوی دیوتا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے

پہنچانے کی کوئی قوت نہیں، اس لئے تم ان کے سامنے جھک کر، شرفِ انسانیت کی تذلیل کیوں کرتے ہو۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ (۲۵/۵۵) ”یہ لوگ، خدا کو چھوڑ کر، ایسے معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہیں جو انہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان“ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو دہرایا ہے۔ مثلاً ۵/۷۶، ۶/۷۱، ۱۰/۱۸، ۲۱/۶۶، ۲۲/۱۳، ۲۸/۱۱)۔ ان لوگوں سے کہا گیا کہ، تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت تو ایک طرف، یہ تو خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ وَلَا يَمْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ صَرًّا وَ لَا خَفْعًا (۲۵/۳، ۱۳/۱۶)

دیوی، دیوتاؤں کے بعد، انسان اس وہم میں بھی مبتلا تھا کہ بزرگ اور خدا رسیدہ انسان، دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس خیالِ باطل کے ازالہ کے لئے، ایسا اندازِ تنبیہ اختیار کیا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں

کوئی بزرگ انسان بھی نہیں

چھوڑی۔ مسلمانوں کے نزدیک، حضورِ رسالت مآب سے زیادہ مقدس اور بزرگ ہستی اور کون ہو سکتی تھی اور ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم نے خود رسول اللہ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرا دیا کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَ لَا ضَرًّا (۱۸۸/۷۹، ۱۷۹/۱)۔ ان سے کہہ دو کہ میں خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ میرے لئے بھی یہ قوانین خداوندی کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

لیکن بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے ہاتھوں نقصان تو پہنچتا ہے۔ اس کے لئے کہہ دیا۔

”إِذْنِ اللَّهِ“ کے مطابق ہوتا ہے۔ لَيْسَ بِضَآئِرٍ هُمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۵۸/۱۰)۔ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ إِذْنِ اللَّهِ سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ اس لئے کہا یہ گیا ہے کہ دوسرا شخص تمہیں نقصان اس لئے پہنچا دیتا ہے کہ تم نے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی حفاظت کا سامان نہیں کیا ہوتا۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ان مخالفین (منافقین) کی کیفیت یہ ہے کہ اگر تمہیں غلط معاشرہ میں انسانوں کی طرف سے نقصان

اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس سے یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ وَ إِنْ تَصْطِرُوا وَ تَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُ هُمْ شَيْئًا (۳/۱۱۹)۔ اگر تم ثابت قدمی اختیار کرو گے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو گے تو ان کی کوئی سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ وَ أَنْتُمْ أَهْلَ الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الْوَرْدِ وَالْأَنْثَرِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۴/۹۶)۔ اگر ان بستیوں کے رہنے والے قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرتے تو ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے لیکن انہوں نے ان قوانین کی تکذیب کی تو ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا مواخذہ ہو گیا۔ یہاں بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ نے واضح کر دیا کہ ”إِذْنِ اللَّهِ“ کے مطابق نقصانات کس طرح ہوتے ہیں۔ یہ سب انسان کے اپنے غلط اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر تم صحیح روش پر چلتے رہو تو تمہیں کوئی شخص نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ لَا يَضُرُّكُمْ مِّنْ ضَلَالٍ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵۱/۵)۔

لیکن یہاں پھر وہی بات سلسلے آجاتی ہے جو پہلے بھی ہماری توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک شخص صحیح راستے پر چلنے کے باوجود، دوسروں کے ہاتھوں نقصان اٹھاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ایسا کچھ غلط معاشرہ میں ہوتا ہے اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس معاشرہ

لے اس آیت میں شیطان کا ذکر ہے۔ ہم ذرا آگے چل کر دیکھیں گے کہ شیطان سے مراد کیا ہے۔

تہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ”تکذیب“ کسے کہتے ہیں۔

اس کا علاج! کوالٹ کر، اس کی جگہ (قوانین خداوندی کے مطابق) صحیح معاشرہ قائم کر دیا جائے۔ اقبال نے اس حقیقت کو ان درخشندہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مرد خود دار سے کہ باشد پختہ کار بامزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد بامزاج او جہاں می شود جنگ آزا با آسمان
بر کند بنیاد موجودات را می دهد ترکیب نودرات را
می کند از قوت خود آشکار روزگار نو کہ باشد سازگار

وہ تقدیر کے ہاتھوں بیٹھا رہتا نہیں رہتا۔ نامساعد ”تقدیر“ کوالٹ کر اس کی جگہ اپنی قوت بازو سے مساعد ”تقدیر“ لے آتا ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے اس لئے خدا اسے خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ سورۃ النعام میں ہے **وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ**۔ **وَإِنْ يَمْسَسْكَ بَخْئٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** (۱۷۱/۱۷۲)۔ اگر تمہیں کوئی نقصان ”خدا کی طرف سے“ (یعنی اس کے قوانین کے مطابق) پہنچے تو اس کا ازالہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ”اس کے قوانین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے ہر بات کے پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔ (نیز ۳۸/۳۹)۔

ایک اہم نکتہ

ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسان جو کام، قوانین خداوندی کے مطابق کرتا ہے، خدا انہیں اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور (اس لئے) مزید وضاحت کا متقاضی۔ جنگِ بدر میں (جو حق و باطل کا اہم ترین معرکہ تھا) مجاہدین (جنہیں خدا نے اپنا شکر، حزب اللہ کہہ کر پکارا تھا) مصروف تیغ زنی اور تیر اندازی ہیں اور اس طرح حق و عدل کے مخالفین کی گردنیں اڑا رہے ہیں۔ اس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ **فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ** **جَنَابَهُ** **قَتَلَهُمْ** تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، خدا خود قتل کر رہا تھا۔ **وَمَا تَمَيَّنَتْ يَدَا**

تَمَیْنَتْ وَ لَکِنَّا اِلٰهَ نَامَحٰی (۸/۱۷۱)۔ اس وقت تم تیر نہیں چلا رہے تھے، خدا چلا رہا تھا۔ تم لوگ ہماری تھیں، لیکن ان کی دھار پر "تقدیر میں" ہماری کار فرما تھیں۔ تیر تھلے تھے، لیکن ان کی اینوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹی ہوئی تھیں۔ اس عظیم حقیقت کو غالب نے کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

اما کشاد آں ز کمانِ محمد است

اور حدیث کے مقام پر، جب یہ سرفروشان اسلام، نبی اکرمؐ کے دست مبارک پر اپنی جان نثاری کے اس معاہدہ کی تجدید کر رہے تھے جو انھوں نے خدا سے باندھا تھا کہ ہم نے بیعت رضوان اپنا مال اور اپنی جان تیرے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں۔ (۹/۱۱۱)۔ تو اس حسین و سادہ و رنگین منظر کا نقشہ، قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اِلٰهًا ط جو لوگ (اے رسولؐ) تجھ سے معاہدہ استوار کر رہے تھے، وہ تجھ سے نہیں بلکہ درحقیقت خدا سے اپنے معاہدہ کی تجدید کر رہے تھے۔ یَذُ اللّٰہُ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ ج (۲۷/۱۰) اس "بیعت" کے وقت، ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں، خود خدا کا ہاتھ تھا۔ جب خدا کا پروگرام اس طرح انسانوں کے ہاتھوں بروئے کار آتا ہے تو، انسان خود خدا کی تقدیر بن جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیرِ مسلمان

مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الہی

دوسری جگہ علامہ کہتے ہیں۔

عبد شے، شکوہ تقدیرِ یزداں

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

مختصراً، کائنات میں جو کچھ بھی قوانین خداوندی کے مطابق ظہور میں آتا ہے، اسے خود خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ خدا خود ایسا کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک دیدہ و درہنہ حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ میں) پکارا اٹھتا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقْنِیْ فَہُوَ یَہْدِیْنِیْ لا خدا وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر سیدھا راستہ دکھایا۔ وَ الَّذِیْ ہُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ لا وہی ہے جو

مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ اور جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ وَ الَّذِي يُمِيتُ سِنِّي ثُمَّ يُحْيِيْنِي ۝ (۸۱-۲۶/۸۱)۔ پھر وہی مجھے مارے گا اور مرنے کے بعد وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔

اشیائے کائنات کے خواص اور تاثیرات ہی نہیں، خود انسان کو بھی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں، انہیں بھی خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، حتیٰ کہ انسان جو کام ان فطری صلاحیتوں کی رو سے کرتا ہے، ان کی نسبت بھی خدا کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ الرحمن میں ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۳-۵۵/۴)۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ ظاہر ہے کہ انسانی بچے کو بولنا، خدا نہیں سکھاتا، اس کا ماحول سکھاتا ہے لیکن چونکہ انسان میں قوتِ گویائی خدا کی عطا کردہ ہے اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو بولنا سکھایا۔ دوسری جگہ ہے۔ الَّذِي عَلَّمَ يَانَقْلَمَ (۴-۹۶/۴) خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا۔ (نیز ۲/۲۸۲)۔ یعنی اس میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ تحریر کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔ سورۃ مائدہ میں کہا ہے کہ شکاری جانور جو شکار پکڑ کر لائیں وہ بھی تمہارے لئے حلال ہے۔ تَعَلَّمُوْا لَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (۴-۵/۴)۔ وہ جانور جنہیں تم اس طرح شکار کرنا سکھاتے ہو جس طرح تمہیں خدا نے سکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کسی انسان کو یہ نہیں سکھاتا کہ شکار کس طرح کرنا چاہیے۔ اس نے انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی ہے اور جو کچھ وہ اس فطری صلاحیت کے مطابق کرتا ہے، اسے خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ خدا کے قوانین کی رو سے ہوتا ہے، یا وہ انسان جو کچھ فطرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے وہ اسے براہِ راست خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے پیش نظر رکھنے سے، قرآن کریم کے وہ تمام مقامات باسانی سمجھ میں آجاتے ہیں، جن میں، اس نکتہ کے سامنے نہ ہونے سے، ذہن میں کئی قسم کے اشکال پیدا ہوتے اور شکوک اُبھرتے ہیں۔ ان مقامات کی تفصیل آئندہ صفحات میں مختلف ابواب میں سامنے آئے گی۔

شیطان ————— ابلیس

اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری نہ قبول کرنے کے سلسلہ میں، انسان نے ایک اور سپر اپنے سامنے رکھ چھوڑی ہے جسے شیطان یا ابلیس کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شیطان کہتے کسے ہیں (اس موضوع پر میں نے تفصیلاً اپنی کتاب 'ابلیس و آدم' میں لکھا ہے۔ اس مقام پر چند اشارات پر اکتفا کیا جائے گا)۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(۱) انسان میں، حیوانی سطح زندگی کی جبلتیں (INSTINCTS) بھی موجود ہیں، جنہیں جذبات کہا جاتا ہے اور عقل بھی۔ عقل کا کام زندگی کے تقاضوں کو بروئے کار لانا ہے۔

(۲) انسانی زندگی، مستقل اقدار کے تابع رہنے کا نام ہے۔

(۳) جب کسی مستقل قدر اور حیوانی جبلت (جذبہ) کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے، تو اس وقت اگر مستقل قدر غالب رہے تو عقل، اس کے تقاضوں کو رُو بہ عمل لانے کی تدابیر اختیار کرتی ہے اور اگر حیوانی جذبہ غالب آجائے، تو عقل اس کے تابع فرمان کام کرتی ہے۔ چونکہ اُس وقت جذبات اور عقل، مستقل اقدار کے تابع نہیں رہتے، اس لیے انہیں جذبات سرکش اور عقل بیباک کہا جاتا ہے۔

انہی جذبات سرکش و عقل بے باک کو، قرآنی اصطلاح میں شیطان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ارباب لغت میں سے بعض کا خیال ہے کہ "شیطان" عربی زبان کا لفظ ہے اور شَاطَ - يَشِيْطُ سے مشتق، جس کے معنی بھڑک اٹھنے کے ہیں۔ ہم نے شیطان کا مذکورہ صدر مفہوم، انہی معانی کی رُو سے مستنبط کیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی رکاوٹیں پیدا کرنے والے، (THE HINDERER) کے ہیں۔ یعنی وہ قوتیں جو مستقل اقدار کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں۔ بات یہ بھی وہی ہے۔

علم النفس (سائکولوجی) کی رُو سے، جب انسان اپنے سرکش جذبات سے مغلوب ہو جائے تو اس سے (AGGRESSION) پیدا ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے پر تغلب حاصل کرنے کا جذبہ۔ ان حالات میں انسان کا دماغ متوازن نہیں رہتا۔ جب یہ جذبہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو اس سے انسان کو

اپنے کئے پر ندامت ہوتی ہے جس کا نتیجہ مایوسی (FRUSTRATION) ہوتا ہے۔

لفظ ابلیس کا مادہ (ب۔ ل۔ س) ہے جس کے معنی مایوس ہو جانے کے ہیں۔ قرآن کریم نے شیطان اور ابلیس ایک ہی کلمہ کے دو رُخ بتائے ہیں۔ یعنی جذبات کی سرکشی جس کا آخری نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ شیطان، درحقیقت انسان کے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے۔ اسی لئے اقبال نے (شیطان کے متعلق) کہا ہے کہ

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ضمیرش سر دوبے ہنگامہ دیدند
بغیر از جانِ ماسوزے کجا بود ترا از آتشِ ما آفریدند

اور دوسری بات ہم نے یہ دیکھ لی کہ جذبات اور عقل، بذاتِ خویش نہ شر ہیں نہ خیر۔ یہ محض قوتیں ہیں جن کا غلط استعمال، شر کے نتائج پیدا کرتا ہے اور صحیح استعمال، خیر کے نتائج۔ لہذا، جو نظریہ یا عقیدہ جذبات کو قابلِ نفرت، فلہذا کشتنی قرار دے اور عقل کو مذہوم، وہ اسلام کی بارگاہ میں قابلِ قبول قرار نہیں پاسکتا۔ جذبات اور عقل، خدا کی تخلیق ہیں اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا، شر کو پیدا نہیں کرتا۔ وہ خیر مطلق کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے اس کی تخلیقات میں سے کسی شے کو بالذات شر قرار دینا، خالق کے خلاف (معاذ اللہ) سنگین الزام ہے۔

لیکن ایران کی مجوسیت نے شیطان (اہرن) کو، شر کی مستقل بالذات قوت قرار دیا اور اسے ایسی ہستی ٹھہرایا جو خارج از انسان اپنا وجود رکھتی اور یزداں سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔

شیطان کے، خارج از انسان ہستی ہونے کے نظریہ سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا جو اپنے آپ کو مجبور قرار دے کر، اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے سے فرار کی راہیں تلاش کرتے

تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کر دیا کہ انسان سے سب غلط کام، **جبر کا عقیدہ** | شیطان کرتا ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس نے حکمِ خداوندی سے

سرتابی برتی تھی لیکن یہ کہہ کر اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ یہ معصیت مجھ سے خود (خدا نے) کرائی ہے۔ مجھے اس کا اختیار کہاں تھا۔ گویا، اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار، خود ابلیسیت ہے۔

ان تصریحات کے بعد آئیے، ہم دیکھیں کہ انسانی اعمال اور شیطان کے تعلق کے سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے۔

قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں کہا گیا ہے کہ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۷/۲۰)۔ شیطان

نے ان دونوں (آدم اور حوا) کے دل میں وسوسہ ڈالا اور سورہ ق میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (۵۰/۱۶)

قرآنی تصریحات

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس، اس میں کیا کیا وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ شیطان، خود نفسِ انسانی ہی ہے، کوئی خارج از انسان ہستی یا قوت نہیں۔

جنگِ احد میں کچھ لوگ (منافقین) میدانِ جنگ سے منہ موڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ ان کے متعلق کہا کہ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا (۳/۱۵۴)۔ شیطان نے، ان کے اعمال کی وجہ سے، ان کے قدموں میں لغزش پیدا کر دی۔ اس سے واضح ہے کہ جسے ”شیطننت“ کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے اپنے ہی غلط اعمال کا دوسرا نام ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب انسان، جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا دماغی توازن صحیح نہیں رہتا۔ سورہ یسین میں ہے کہ جہنم میں جانے والوں سے کہا جائے گا کہ تم نے شیطان (جذبات) کو اپنے اوپر غالب آنے دیا اور اس طرح تمہاری عقل مفلوج ہو گئی، تو تم جہنم میں پہنچ گئے۔ (۶۰/۶۲-۳۶)

سورہ ابراہیم میں، قیامت کے دن، شیطان اور اس کے متبعین کا ایک تمثیلی مکالمہ آیا ہے۔ وہاں غلط کار انسان، شیطان کو الزام دیتے ہیں کہ تم نے ہم سے ایسے کام کرائے تھے۔ اس کے جواب میں شیطان کہتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ میرا تم پر کوئی اقتدار اور اختیار نہیں تھا جو تم سے تمہاری مرضی کے خلاف جبراً کچھ کرا لیتا۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ تمہیں آواز دی تھی۔ تم نے خود اس آواز پر لبیک کہا اور میرے پیچھے چل پڑے۔ فَلَا تَلُوْا مُوْبِیْ وَا لَوْ مُوْبِیْ اَنْفُسُكُمْ (۱۴/۲۲)۔ آج تم مجھے ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ اس لئے کہ تمہارے اعمال کا وقار میں نہیں، خود تم ہو۔

===== فہرست =====

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان جذبات کی موجودگی میں ان کے غلبہ سے بچے کیسے؟

تصویر کیا کہ اس کا طریق یہ ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ (اسے ان کی اصطلاح میں نفس کشی کہتے ہیں)۔ لیکن جس طرح ان کا ترک دنیا کا نظریہ ناممکن العمل، فلہذا فریب نفس ہے، اسی طرح جذبات کو فنا کر دینے کا نظریہ بھی ناقص العمل اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ انسانی جذبات فنا ہو ہی نہیں

سکتے اور اگر (بفرض محال) یہ فنا ہو بھی سکتے ہوں، تو ان کا فنا کر دینا، حماقت اور خسرانِ مبین ہے۔ جذبات تو عقل کی طرح انسان کی متاعِ گراں بہا ہیں۔ زندگی کی شادابیاں،

انسان، جذبات کے غلبے سے

کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے

تاڑکیاں اور ندرت کاریاں آرزوؤں سے وابستہ ہیں اور آرزوؤں کی بیداری جذبات کی رہینِ منت ہے۔ اگر پیکرِ انسانی میں جذبات کی حرارت نہ رہے تو وہ جس حرکت برف کا تودہ بن کر رہ جائے۔ جذبات کے سلسلہ میں جب قرآن کی راہ نمائی سامنے آتی ہے تو روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور صاف نظر آ جاتا ہے کہ سرچشمہ وحی سے عطا شدہ روشنی اور ذہنِ انسانی کے تراشیدہ قیاسات میں کیا فرق ہے۔ اس نے پہلے ان لوگوں کو سامنے لاتے ہوئے جو بلا حدود و قیود جذبات کے اتباع کا مسلک اختیار کئے ہوں، کہا کہ **أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ**۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس دُش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **وَ أَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ وَهَ عَقْلٍ وَ عِلْمٍ رُكْنٍ كَيْفَ عِلْمٍ رُكْنٍ** پڑ جاتا ہے اور جذبات سے مغلوبیت کی وجہ سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ **وَ خَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ وَ قَلْبِهِ وَ جَعَلَ عَلَى بَصَرِهِ غِشَاوَةً**۔ اس کے دل اور کانوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے دیکھنے بھالنے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ مفلوج۔ اس کے بعد ہے **فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ** (۲۸/۲۳) یہ صرف خدا کی ہدایت ہے جو اسے اس گمراہی سے بچا سکتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اندھا دھند اپنے حیوانی جذبات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان سے یہ نہیں کہا کہ وہ جذبات کو فنا کر دیں، ان سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اس نے کہا ہے کہ **وَ مَنْ أَضَلَّ** **مَنْ أَتَّبَعَ هَوَاهُ** **بَغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ** (۲۸/۵۰)۔ گمراہ وہ ہوتا ہے جو ہدایتِ خداوندی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ یہاں قرآن نے بات بالکل واضح کر

دی کہ انسانی جذبات، شر نہیں۔ وہ ستر اس وقت بنتے ہیں جب انہیں بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ اگر انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو پھر ان کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے حضور نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں — جو تابندہ موتیوں کی طرح چمکتی ہے، نہایت بلیغ اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے حضورؐ نے فرمایا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا حضورؐ کا بھی ابلیس ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔

دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ جذبات کو فنا نہیں کیا۔ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا۔ البتہ ان سے کام مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق لیا۔ اس طرح، یہ بے پناہ قوت، تخریبی کے بجائے، یکسر تعمیری ہو گئی۔ یعنی سیلاب کو ساحلوں کا پابند بنا دیا اور اس طرح وہ تباہیوں کا موجب بننے کے بجائے، آبادیوں اور شادابیوں کا باعث بن گیا۔ انسان میں جس طرح، فطرت کی قوتوں کو مستحکم کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے، اسی طرح اسے اس بات کی قوت بھی عطا کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو بھی مستحکم کر سکے۔ قصہ آدمؑ کے تمثیلی انداز میں کہا گیا ہے کہ جب ابلیس کو دھتکارا گیا تو اس نے خدا سے کہا کہ ابلیس کو اپنے تابع کیا جاسکتا ہے | تو نے اپنے اس ”چاہیتے“ کی خاطر مجھے ذلیل و خوار تو کیا ہے اب دیکھ کہ میں اس کے ساتھ

کیا کرتا ہوں۔ میں اس کی ناک میں نکیل ڈال کر اسے اس قدر حیران و سرگرداں پھراؤں گا، اور پھر اس طرح تباہ و برباد کروں گا کہ اسے جھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ (۱۴/۶۳-۶۴)۔ ابلیس کے اس چیلنج کے جواب میں، بارگاہِ ایزدی سے کہا گیا کہ جو کچھ تیرے جی میں آئے کر دیکھ۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۴/۶۵)۔ میرے بندوں پر — یعنی جو میرے قوانین کی پیروی کریں گے ان پر — تجھے کبھی غلبہ و تسلط حاصل نہیں ہو سکے گا۔ (۳۸/۸۳۱)۔ اِنَّهٗ لَيْسَ لَكَ سُلْطٰنٌ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی مَا يَتَوَكَّلُوْنَ۔ جو لوگ خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور ان کی محکمیت پر بھروسہ کریں گے، ان پر ابلیس کا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلٰی الَّذِيْنَ يَتَوَكَّلُوْنَہٗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِمُشْرِکُوْنَہٗ (۱۴/۱۰۰-۹۹)۔ اس کا زور

چلے گا ان لوگوں پر جو قوانین خداوندی سے یکسر اعراض برتیں گے، یا ان پر جو ان سے یکسر اعراض تو نہیں برتیں گے، لیکن ان قوانین کی خالصتہ پیروی نہیں کریں گے بلکہ ان کے ساتھ غیر خداوندی قوانین بھی شامل کر لیں گے۔

قوانین خداوندی کا اتباع کرنے والوں کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ، شیطان کی پیروی کرنا تو ایک طرف رہا۔ اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ - تَذَكَّرُوا ۚ اِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (۷۲/۲۱)۔ اگر کبھی شیطان کا خیال یوں ہی گھومتے گھماتے ان کے ذہن میں آجائے، تو وہ فوراً قوانین خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں اور اس سے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی ہے جس سے ان کی راہیں دُور و دور تک روشن ہو جاتی ہیں اور ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھنے نہیں پاتا۔ یہی وہ

اسوۃ یوسفی "برہانِ رب" تھی جسے دیکھ کر حضرت یوسفؑ نے، عزیزِ مصر کی بیوی کے پھیلانے ہوئے شیطنیت کے جال کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور یوں ایک دنیا کو دکھا دیا کہ "خدا کے مخلص بندوں پر شیطان غالب نہیں آسکتا۔" اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ (۱۲/۲۳)۔ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

اس مقام پر، سطحِ بین ذہنیّتوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ، انسان میں شر کا مقابلہ کر کے اسے مغلوب کر لینے کی قوت ہی، لیکن خدا نے ایسا نظام ہی کیوں قائم کیا جس میں ان دو قوتوں میں ٹکراؤ ہوتا رہے۔ اس میں کیا مصلحت تھی؟

اس قسم کا اعتراض کرنے والے اتنا نہیں سوچتے کہ یہ ٹکراؤ، انسان کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کا لازمی نتیجہ تھا۔ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) صاحبِ اختیار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سامنے دو ممکنات (TWO POSSIBILITIES) ہوں اور

اس کی مصلحت اسے اس کا اختیار ہو کہ وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ جس کے

سامنے دو راستے نہ ہوں، ایک ہی راہ ہو، اس کے لئے راستے کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجبور کہا ہی اُسے جاتا ہے جس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔ جس راستے میں دو راہ (CROSS ROADS) نہ آتا ہو، اس میں، سوچنے اور صحیح اور غلط راستے میں امتیاز و انتخاب کا موقع ہی نہیں آتا۔ سفرِ حیات میں یہی وہ انتخاب (CHOICE) کا دورا ہوتا ہے جہاں انسان کی

صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اسی کو ٹکراؤ کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں قانون ارتقار (LAW OF EVOLUTION) کارفرما ہے اور ارتقار کا راز ہی ٹکراؤ میں ہے۔ اس قانون کی رو سے، استحکام و عروج اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ متضادم و متخارب قوتوں سے ہر دو آزما ہو جائے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے لیکن اگر اس کے راستے میں پتھروں کی (FALLS) نہ آئیں تو اس کی پرسکوت روانی، آہستہ آہستہ، تبدیل بہ سکون ہو جائے اور یہ جوئے رواں، جمود و تعطل کا جوہڑ بن کر رہ جائے۔ بریط کے تاروں میں خوابیدہ نغمات، بلا مضرب کبھی بیدار نہیں ہوتے۔ آئینہ شمشیر میں کبھی آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ اسے سنگِ فساں پر صیقل نہ کیا جائے۔ چھاق کی شعلہ فشانی، پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں۔ تضادم و تزامم کا یہی قانون ہے جس سے انسان کی مضمر قوتوں میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔ یہ اسے اس کی خودی کی نمود یا ذات کا استحکام کہا جاتا ہے۔ اگر خودی، اپنے غیر سے متضادم نہ ہو تو ہنگامہ کائنات سوہاڑا ہو جائے۔ بزمِ ہستی کی رنگینیاں بے کیف ہو جائیں۔ یہ جہان رنگ و بو پھر سے مٹی کا گھروندا بن کر رہ جائے۔ خونِ رگ کائنات کی تپش، خودی کے دولہ نمود کی مظہر اور اس کی لذت کش کش کی رہین منت ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبال نے اس شوخ انداز میں بیان کیا ہے کہ

مزی اندر جہانے کور ذوقے

کہ یزواں وارو و شیطان ندارد

”بالِ جبریل“ میں، علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو، ابلیس اور جبریل کے مکالمہ کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں ابلیس، جبریل سے کہتا ہے کہ

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے

قصہ آدم کو رہیں کر گیا کس کا لہوا

یہ ہے شیطان کی پوزیشن قرآن کی روشنی میں۔ یعنی انسان کی حیوانی زندگی اور انسانی زندگی کی وہ کشمکش جو اس کی مضمر صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا ذریعہ بنتی ہے اور جس میں انسان، ہر آن محاسبہ

خویش سے یہ دیکھتا اور پرکھتا چلا جاتا ہے کہ اس کی ذات (انسانی زندگی) میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ اسی کو قرآن کریم، حق و باطل کی کش مکش سے تعبیر کرتا ہے جس میں حق (تعمیری پروگرام) بالآخر باطل (تخریبی پروگرام) پر غالب آکر رہتا ہے۔ **بَلْ نَقْذِرُ الْبَاطِلَ فَيَدُ مَغْدًا فَإِذَا هُوَ خَرُّ هَاقًا** (۲۱/۱۸)۔ ہم، حق کے ہتھوڑے سے باطل کے سر پر چوٹیں لگاتے رہتے ہیں، تا آنکہ باطل کا بھر کس نکل جاتا ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں، حق کا یہ غلبہ، اس اجتماعی نظام میں جو مستقل اقدار خداوندی کی رو سے قائم کیا جائے، بڑی برق رفتاری سے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، باطل کا نظام، جس میں حیوانی جذبات کو کھل کھیلنے دیا جاتا ہے، حق کی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا کہ، کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں لیکن جن کی عملی حالت یہ ہے کہ **يَتَحَاكُمُونَ آيَاتِ الطَّاغُوتِ** وہ نظام ایسا قائم کرتے ہیں جس میں ان کے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین (طاغوت یا شیطان) کی رو سے ہوتے ہیں۔ **وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ**۔ حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس سے سرتابی برتیں۔ **وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا** (۴/۶۰)۔ اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ انہیں دور کی گمراہی میں لے جائے۔



تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ قرآنی نقطہ نظر سے، خیر اور شر (یا اہرمن ویزواں) کا مفہوم و مقصود کیا ہے۔ دو لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ، فطرت کی قوتوں اور خود انسانی صلاحیتوں کے استعمال کے دو طریق ہیں۔ اگر انہیں، مستقل اقدار خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے۔ اگر ان کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ تخریبی نتائج پیدا کرتی ہیں۔ اور انسان کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ یہ ان دو طریقوں میں سے جو نسا طریق جی چاہے اختیار کر لے۔ جو طریقہ وہ اختیار کرے گا اس کے مطابق ان کے نتائج مرتب ہو جائیں گے۔ یعنی اس کے مطابق یہ خیر یا شر بن جائیں گی۔ فطرت کی قوتوں اور خود اپنی صلاحیتوں سے، اپنے مقاصد کے مطابق نتائج مرتب کرانے کو، اقبال نے ”ققدیر شکن قوت“ کی

اصلاح سے تعبیر کیا ہے جہاں کہا ہے کہ
 تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
 ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
 یہ وہی چیز ہے جسے حضرت عمرؓ نے ”خدا کی ایک تقدیر سے“ خدا اسی کی دوسری تقدیر کی طرف
 رخ کرنے سے تعبیر کیا تھا۔



اگر..... تو

(قرآن مجید میں)

شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ قانون (LAW) کی تعریف یہ ہے کہ
اگر..... تو..... ہمیشہ

یعنی اگر یہ (یا ایسا) کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا اور تم جب اور جہاں بھی ایسا کرو گے اس کا نتیجہ ہمیشہ
وہی برآمد ہو گا جو حکم، نظریہ، فارمولہ یا قلمہ، ان شرائط کو پورا کرے، اسے قانون کہا جائے گا۔

دنیا میں قانون کی تین شکلیں معروف ہیں۔ اول عدالتی قانون۔ (مثلاً) ”اگر تم چوری کرو گے تو ہمیں
سزا ملے گی جو تین سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ تک ہو سکتی ہے۔“ اس قانون میں آپ دیکھیں

گئے کہ عمل (چوری کرنا) اور اس کے نتیجہ (قید یا جرمانہ) میں کوئی داخلی
رابطہ نہیں۔ **عدالتی قوانین** ملک کے صابطہ قوانین میں چوری کرنے کو جرم قرار دیا گیا ہے

اور عدالت کی طرف سے اس جرم کی سزا کا حکم دیا جاتا ہے۔ اگر ملک کے صابطہ قوانین کی رو سے
چوری کو جرم قرار نہ دیا جاتا، یا چوری کا مرتکب عدالتی مشینری کی گرفت میں نہ آ سکے، تو اس عمل

(چوری) کا کوئی نتیجہ ہی برآمد نہ ہو۔ بالفاظ دیگر، عدالتی قوانین میں، عمل کا نتیجہ اس کے اندر مضمر
نہیں ہوتا، خارج سے حادث کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوانین کہیں پہلے سے از خود موجود نہیں ہوتے۔

انہیں وضع کیا جاتا ہے۔ کوئی ملک اپنے لئے جس قسم کے قوانین چاہے وضع کر لے، اور جب جی چاہے، ان میں رد و بدل کرے۔ یہی کیفیت معاشرتی (یعنی سوسائٹی کے) قوانین و ضوابط کی ہے۔

اب قوانین کی دوسری شق کو لیجئے جنہیں طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) یا قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قانون کہ آگ میں انگلی ڈالو گے، تو وہ جل جائے

گی۔ اس میں آپ دیکھئے کہ اس عمل کا نتیجہ خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہے،

طبیعی قوانین کہیں خارج سے وارد نہیں کیا گیا۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی ملک یہ قانون پاس کر دے کہ ہمارے ہاں آگ سے انگلی جلے گی نہیں، تو آگ جلانا چھوڑ دے۔ یا کوئی شخص ایسی جگہ آگ میں انگلی ڈالے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو اس وقت اس کی انگلی نہ جلے۔ یہ وہ قوانین ہیں جن پر قانون کی مذکورہ صدر تعریف ٹھیک ٹھیک منطبق ہوتی ہے۔ یہ قوانین از خود موجود ہیں (انسان کے وضع کردہ نہیں) اور غیر متبدل بھی ہیں۔

اب آئیے قوانین کی تیسری شق کی طرف (مثلاً یہ کہ) اگر تم نے محتاجوں کی مدد نہ کی تو تباہ ہو جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ یہ قانون، ”اگر اور تو“ کی شرط تو پوری کرتا ہے، لیکن یہ نہ تو عدالتی یا تمدنی

قوانین کے دائرے میں آتا ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین فطرت کے ذیل میں۔

مستقل اقدار انہیں مستقل اقدار خداوندی کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ غیر متبدل بھی ہیں اور انسانوں کی وضع کردہ نہیں بلکہ خدائی مقرر کردہ اور اس کی طرف سے بذریعہ وحی عطا شدہ ہیں۔ ان قوانین کا

دوہرا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے مطابق عمل کرنے سے، انسانوں کی تمدنی زندگی سنور جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس سے افراد کی ذات (PERSONALITY) یا (SELF) کی نشوونما

ہو جاتی ہے۔ ان اقدار کی صداقت پر یقین وہی شخص رکھ سکتا ہے جو انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان اقدار کے مطابق عمل کرنے کے لئے ایمان (یعنی انسانی ذات)

اور وحی خداوندی کی رو سے عطا شدہ مستقل اقدار پر یقین (لاینفک ہے۔ قرآن کریم نے ان قوانین کے تمدنی پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے اور اس گوشہ کو بھی جس کا تعلق انسانی ذات سے ہے۔ مثلاً اس نے زنا کو مستقل اقدار کی خلاف ورزی کہا ہے تو ایک طرف اسے عدالتی جرم قرار دیتے ہوئے اس کی سزا

تجزی کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اس سے انسانی ذات میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (۲۵/۶۸)۔

قرآن کریم میں ”کتاب اور حکمت“ دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے۔ ”کتاب“ قانون کا ”اگر“ کا حصہ ہے، اور ”حکمت“ اس کی ”تو“ ہے۔ اگر کسی حکم میں ”اگر“ کے ساتھ ”تو“ نہ ہو، تو وہ حکم، قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ تمدنی دنیا میں جب کسی ملک میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو اس میں ”اگر“ تو اپنی جگہ موجود ہوتا ہے لیکن اس کا ”تو“ غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس میں قانون یہ تھا اگر رشوت لوگے تو ملازمت سے برخاست کر دیئے جاؤ گے۔ لیکن لاقانونیت میں ہوتا یہ ہے کہ لوگ رشوت دھڑا دھڑا لیتے ہیں لیکن ملازمت سے برخاست نہیں ہوتے۔ انہیں اس جرم کی سزا نہیں ملتی۔

اسی طرح جب دین، مذہب کی سطح پر آ جاتا ہے تو اس میں قوانین، ایسے احکام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی تعمیل تو ضروری قرار دی جاتی ہے لیکن ان کا کوئی محسوس نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ ان کی تعمیل یہ کہہ کر کرائی جاتی ہے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے وہ ناراض ہو جاتا ہے۔

لیکن دین میں، احکام، قوانین کی شکل میں بروئے کار آتے ہیں۔ ان کی تعمیل سے متعینہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو اس دنیا میں بھی محسوس شکل میں سامنے آتا ہے اور آخرت میں بھی سامنے آئے گا۔ ”کتاب حکمت“ سے یہی مراد ہے۔ کتاب کے ساتھ ”حکمت“ کو اس لئے واضح کر دیا گیا تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ ”اگر“ کے ساتھ ”تو“ کے ساتھ چیک کرتے جائیں کہ حکم پر صحیح صحیح عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی تعمیل سے وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے، جو بتایا گیا تھا، تو اس پر صحیح صحیح عمل ہو رہا ہے۔ اگر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا تو ہمیں رُک کر دیکھنا ہو گا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ مذہب میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ اس میں انسان اپنی خوش عقیدگی (خوش فہمی) میں مگن رہتا ہے اور نتیجہ سے عمل کے صحیح یا غلط ہونے کی پرکھ نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ حقیقت اس کے سامنے ہی نہیں ہوتی کہ اس حکم کی تعمیل سے کوئی محسوس نتیجہ سامنے آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی فارمولا پر آپ عمل کریں اور اس کا معینہ نتیجہ مرتب نہ ہو، لیکن اس کے باوجود آپ

اسی طرح عمل کئے جائیں، تو آپ کی ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اسے قرآن کریم حَبَطَتْ اَعْمَالُھُمْ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی ان کے اعمال ضائع چلے گئے، کوششیں بے نتیجہ رہ گئیں۔

دین میں ہر کوشش، جو قانون کے مطابق کی جائے نتیجہ خیز ہوتی ہے، مذہب میں رائیگاں جاتی ہے۔

جو کچھ ادھر کہا گیا ہے اسے ہم جتہ جتہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس مقام پر ایک اور مقصد کے لئے اس کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ ”اگر“ کا سوال صرف اُس کے لئے پیدا ہوتا ہے جو صاحب اختیار ہو۔ مجبور کے لئے ”اگر“ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ”اگر تم نے یہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔“ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس سے ایسا کہا جا رہا ہے اسے اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایسا کرے اور چاہے ایسا نہ کرے۔ یہ صرف آنکھوں والے سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر راستہ دیکھ کر چلے تو تم گڑھے میں گرنے سے بچ جاؤ گے۔ اندھے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر تم راستہ دیکھ کر چلے تو تم گڑھے میں نہیں گرو گے۔ لہذا، قرآن کریم کا انسانوں سے یہ کہنا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، انسان کو صاحب اختیار و ارادہ ٹھہراتا ہے، مجبور نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے عام طور پر ”اگر..... تو“ (اِنْ..... ف) کی ترکیب استعمال کی ہے اور کہیں کہیں ایسا بھی کہا ہے کہ ”تمہیں ایسا کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ..... (لَعَلَّكُمْ.....)۔ دونوں صورتوں میں مقصد ایک ہی ہے۔ اس مقام پر ہم قرآن کریم کے چند ایک قوانین پیش کر کے اس

چند کرائی مثالیں

کی ”اگر..... تو“ کی حکمت سامنے لانا چاہتے ہیں جس سے واضح ہوگا کہ انسان اپنے عمل میں صاحب اختیار ہے۔

(۱) ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ جنت کی زندگی ہے۔ یعنی اگر ایمان لاؤ گے اور اعمالِ صالحہ کرو گے تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوگا۔ (۲/۲۵)

(۲) ہماری ہدایات کا اتباع کرو گے تو خوف و حزن نہیں ہوگا (۲/۳۸)۔ اپنا مال خدا کی راہ میں کھلا رکھو گے تو خوف و حزن نہیں ہوگا۔ (۲/۲۶۲ ذ ۲/۲۷۴ ذ ۲/۲۷۷ ذ ۲/۳۸ ذ ۲/۳۹ ذ ۲/۴۰ ذ ۲/۴۱ ذ ۲/۴۲ ذ ۲/۴۳ ذ ۲/۴۴ ذ ۲/۴۵ ذ ۲/۴۶ ذ ۲/۴۷ ذ ۲/۴۸ ذ ۲/۴۹ ذ ۲/۵۰ ذ ۲/۵۱ ذ ۲/۵۲ ذ ۲/۵۳ ذ ۲/۵۴ ذ ۲/۵۵ ذ ۲/۵۶ ذ ۲/۵۷ ذ ۲/۵۸ ذ ۲/۵۹ ذ ۲/۶۰ ذ ۲/۶۱ ذ ۲/۶۲ ذ ۲/۶۳ ذ ۲/۶۴ ذ ۲/۶۵ ذ ۲/۶۶ ذ ۲/۶۷ ذ ۲/۶۸ ذ ۲/۶۹ ذ ۲/۷۰ ذ ۲/۷۱ ذ ۲/۷۲ ذ ۲/۷۳ ذ ۲/۷۴ ذ ۲/۷۵ ذ ۲/۷۶ ذ ۲/۷۷ ذ ۲/۷۸ ذ ۲/۷۹ ذ ۲/۸۰ ذ ۲/۸۱ ذ ۲/۸۲ ذ ۲/۸۳ ذ ۲/۸۴ ذ ۲/۸۵ ذ ۲/۸۶ ذ ۲/۸۷ ذ ۲/۸۸ ذ ۲/۸۹ ذ ۲/۹۰ ذ ۲/۹۱ ذ ۲/۹۲ ذ ۲/۹۳ ذ ۲/۹۴ ذ ۲/۹۵ ذ ۲/۹۶ ذ ۲/۹۷ ذ ۲/۹۸ ذ ۲/۹۹ ذ ۲/۱۰۰ ذ ۲/۱۰۱ ذ ۲/۱۰۲ ذ ۲/۱۰۳ ذ ۲/۱۰۴ ذ ۲/۱۰۵ ذ ۲/۱۰۶ ذ ۲/۱۰۷ ذ ۲/۱۰۸ ذ ۲/۱۰۹ ذ ۲/۱۱۰ ذ ۲/۱۱۱ ذ ۲/۱۱۲ ذ ۲/۱۱۳ ذ ۲/۱۱۴ ذ ۲/۱۱۵ ذ ۲/۱۱۶ ذ ۲/۱۱۷ ذ ۲/۱۱۸ ذ ۲/۱۱۹ ذ ۲/۱۲۰ ذ ۲/۱۲۱ ذ ۲/۱۲۲ ذ ۲/۱۲۳ ذ ۲/۱۲۴ ذ ۲/۱۲۵ ذ ۲/۱۲۶ ذ ۲/۱۲۷ ذ ۲/۱۲۸ ذ ۲/۱۲۹ ذ ۲/۱۳۰ ذ ۲/۱۳۱ ذ ۲/۱۳۲ ذ ۲/۱۳۳ ذ ۲/۱۳۴ ذ ۲/۱۳۵ ذ ۲/۱۳۶ ذ ۲/۱۳۷ ذ ۲/۱۳۸ ذ ۲/۱۳۹ ذ ۲/۱۴۰ ذ ۲/۱۴۱ ذ ۲/۱۴۲ ذ ۲/۱۴۳ ذ ۲/۱۴۴ ذ ۲/۱۴۵ ذ ۲/۱۴۶ ذ ۲/۱۴۷ ذ ۲/۱۴۸ ذ ۲/۱۴۹ ذ ۲/۱۵۰ ذ ۲/۱۵۱ ذ ۲/۱۵۲ ذ ۲/۱۵۳ ذ ۲/۱۵۴ ذ ۲/۱۵۵ ذ ۲/۱۵۶ ذ ۲/۱۵۷ ذ ۲/۱۵۸ ذ ۲/۱۵۹ ذ ۲/۱۶۰ ذ ۲/۱۶۱ ذ ۲/۱۶۲ ذ ۲/۱۶۳ ذ ۲/۱۶۴ ذ ۲/۱۶۵ ذ ۲/۱۶۶ ذ ۲/۱۶۷ ذ ۲/۱۶۸ ذ ۲/۱۶۹ ذ ۲/۱۷۰ ذ ۲/۱۷۱ ذ ۲/۱۷۲ ذ ۲/۱۷۳ ذ ۲/۱۷۴ ذ ۲/۱۷۵ ذ ۲/۱۷۶ ذ ۲/۱۷۷ ذ ۲/۱۷۸ ذ ۲/۱۷۹ ذ ۲/۱۸۰ ذ ۲/۱۸۱ ذ ۲/۱۸۲ ذ ۲/۱۸۳ ذ ۲/۱۸۴ ذ ۲/۱۸۵ ذ ۲/۱۸۶ ذ ۲/۱۸۷ ذ ۲/۱۸۸ ذ ۲/۱۸۹ ذ ۲/۱۹۰ ذ ۲/۱۹۱ ذ ۲/۱۹۲ ذ ۲/۱۹۳ ذ ۲/۱۹۴ ذ ۲/۱۹۵ ذ ۲/۱۹۶ ذ ۲/۱۹۷ ذ ۲/۱۹۸ ذ ۲/۱۹۹ ذ ۲/۲۰۰ ذ ۲/۲۰۱ ذ ۲/۲۰۲ ذ ۲/۲۰۳ ذ ۲/۲۰۴ ذ ۲/۲۰۵ ذ ۲/۲۰۶ ذ ۲/۲۰۷ ذ ۲/۲۰۸ ذ ۲/۲۰۹ ذ ۲/۲۱۰ ذ ۲/۲۱۱ ذ ۲/۲۱۲ ذ ۲/۲۱۳ ذ ۲/۲۱۴ ذ ۲/۲۱۵ ذ ۲/۲۱۶ ذ ۲/۲۱۷ ذ ۲/۲۱۸ ذ ۲/۲۱۹ ذ ۲/۲۲۰ ذ ۲/۲۲۱ ذ ۲/۲۲۲ ذ ۲/۲۲۳ ذ ۲/۲۲۴ ذ ۲/۲۲۵ ذ ۲/۲۲۶ ذ ۲/۲۲۷ ذ ۲/۲۲۸ ذ ۲/۲۲۹ ذ ۲/۲۳۰ ذ ۲/۲۳۱ ذ ۲/۲۳۲ ذ ۲/۲۳۳ ذ ۲/۲۳۴ ذ ۲/۲۳۵ ذ ۲/۲۳۶ ذ ۲/۲۳۷ ذ ۲/۲۳۸ ذ ۲/۲۳۹ ذ ۲/۲۴۰ ذ ۲/۲۴۱ ذ ۲/۲۴۲ ذ ۲/۲۴۳ ذ ۲/۲۴۴ ذ ۲/۲۴۵ ذ ۲/۲۴۶ ذ ۲/۲۴۷ ذ ۲/۲۴۸ ذ ۲/۲۴۹ ذ ۲/۲۵۰ ذ ۲/۲۵۱ ذ ۲/۲۵۲ ذ ۲/۲۵۳ ذ ۲/۲۵۴ ذ ۲/۲۵۵ ذ ۲/۲۵۶ ذ ۲/۲۵۷ ذ ۲/۲۵۸ ذ ۲/۲۵۹ ذ ۲/۲۶۰ ذ ۲/۲۶۱ ذ ۲/۲۶۲ ذ ۲/۲۶۳ ذ ۲/۲۶۴ ذ ۲/۲۶۵ ذ ۲/۲۶۶ ذ ۲/۲۶۷ ذ ۲/۲۶۸ ذ ۲/۲۶۹ ذ ۲/۲۷۰ ذ ۲/۲۷۱ ذ ۲/۲۷۲ ذ ۲/۲۷۳ ذ ۲/۲۷۴ ذ ۲/۲۷۵ ذ ۲/۲۷۶ ذ ۲/۲۷۷ ذ ۲/۲۷۸ ذ ۲/۲۷۹ ذ ۲/۲۸۰ ذ ۲/۲۸۱ ذ ۲/۲۸۲ ذ ۲/۲۸۳ ذ ۲/۲۸۴ ذ ۲/۲۸۵ ذ ۲/۲۸۶ ذ ۲/۲۸۷ ذ ۲/۲۸۸ ذ ۲/۲۸۹ ذ ۲/۲۹۰ ذ ۲/۲۹۱ ذ ۲/۲۹۲ ذ ۲/۲۹۳ ذ ۲/۲۹۴ ذ ۲/۲۹۵ ذ ۲/۲۹۶ ذ ۲/۲۹۷ ذ ۲/۲۹۸ ذ ۲/۲۹۹ ذ ۲/۳۰۰ ذ ۲/۳۰۱ ذ ۲/۳۰۲ ذ ۲/۳۰۳ ذ ۲/۳۰۴ ذ ۲/۳۰۵ ذ ۲/۳۰۶ ذ ۲/۳۰۷ ذ ۲/۳۰۸ ذ ۲/۳۰۹ ذ ۲/۳۱۰ ذ ۲/۳۱۱ ذ ۲/۳۱۲ ذ ۲/۳۱۳ ذ ۲/۳۱۴ ذ ۲/۳۱۵ ذ ۲/۳۱۶ ذ ۲/۳۱۷ ذ ۲/۳۱۸ ذ ۲/۳۱۹ ذ ۲/۳۲۰ ذ ۲/۳۲۱ ذ ۲/۳۲۲ ذ ۲/۳۲۳ ذ ۲/۳۲۴ ذ ۲/۳۲۵ ذ ۲/۳۲۶ ذ ۲/۳۲۷ ذ ۲/۳۲۸ ذ ۲/۳۲۹ ذ ۲/۳۳۰ ذ ۲/۳۳۱ ذ ۲/۳۳۲ ذ ۲/۳۳۳ ذ ۲/۳۳۴ ذ ۲/۳۳۵ ذ ۲/۳۳۶ ذ ۲/۳۳۷ ذ ۲/۳۳۸ ذ ۲/۳۳۹ ذ ۲/۳۴۰ ذ ۲/۳۴۱ ذ ۲/۳۴۲ ذ ۲/۳۴۳ ذ ۲/۳۴۴ ذ ۲/۳۴۵ ذ ۲/۳۴۶ ذ ۲/۳۴۷ ذ ۲/۳۴۸ ذ ۲/۳۴۹ ذ ۲/۳۵۰ ذ ۲/۳۵۱ ذ ۲/۳۵۲ ذ ۲/۳۵۳ ذ ۲/۳۵۴ ذ ۲/۳۵۵ ذ ۲/۳۵۶ ذ ۲/۳۵۷ ذ ۲/۳۵۸ ذ ۲/۳۵۹ ذ ۲/۳۶۰ ذ ۲/۳۶۱ ذ ۲/۳۶۲ ذ ۲/۳۶۳ ذ ۲/۳۶۴ ذ ۲/۳۶۵ ذ ۲/۳۶۶ ذ ۲/۳۶۷ ذ ۲/۳۶۸ ذ ۲/۳۶۹ ذ ۲/۳۷۰ ذ ۲/۳۷۱ ذ ۲/۳۷۲ ذ ۲/۳۷۳ ذ ۲/۳۷۴ ذ ۲/۳۷۵ ذ ۲/۳۷۶ ذ ۲/۳۷۷ ذ ۲/۳۷۸ ذ ۲/۳۷۹ ذ ۲/۳۸۰ ذ ۲/۳۸۱ ذ ۲/۳۸۲ ذ ۲/۳۸۳ ذ ۲/۳۸۴ ذ ۲/۳۸۵ ذ ۲/۳۸۶ ذ ۲/۳۸۷ ذ ۲/۳۸۸ ذ ۲/۳۸۹ ذ ۲/۳۹۰ ذ ۲/۳۹۱ ذ ۲/۳۹۲ ذ ۲/۳۹۳ ذ ۲/۳۹۴ ذ ۲/۳۹۵ ذ ۲/۳۹۶ ذ ۲/۳۹۷ ذ ۲/۳۹۸ ذ ۲/۳۹۹ ذ ۲/۴۰۰ ذ ۲/۴۰۱ ذ ۲/۴۰۲ ذ ۲/۴۰۳ ذ ۲/۴۰۴ ذ ۲/۴۰۵ ذ ۲/۴۰۶ ذ ۲/۴۰۷ ذ ۲/۴۰۸ ذ ۲/۴۰۹ ذ ۲/۴۱۰ ذ ۲/۴۱۱ ذ ۲/۴۱۲ ذ ۲/۴۱۳ ذ ۲/۴۱۴ ذ ۲/۴۱۵ ذ ۲/۴۱۶ ذ ۲/۴۱۷ ذ ۲/۴۱۸ ذ ۲/۴۱۹ ذ ۲/۴۲۰ ذ ۲/۴۲۱ ذ ۲/۴۲۲ ذ ۲/۴۲۳ ذ ۲/۴۲۴ ذ ۲/۴۲۵ ذ ۲/۴۲۶ ذ ۲/۴۲۷ ذ ۲/۴۲۸ ذ ۲/۴۲۹ ذ ۲/۴۳۰ ذ ۲/۴۳۱ ذ ۲/۴۳۲ ذ ۲/۴۳۳ ذ ۲/۴۳۴ ذ ۲/۴۳۵ ذ ۲/۴۳۶ ذ ۲/۴۳۷ ذ ۲/۴۳۸ ذ ۲/۴۳۹ ذ ۲/۴۴۰ ذ ۲/۴۴۱ ذ ۲/۴۴۲ ذ ۲/۴۴۳ ذ ۲/۴۴۴ ذ ۲/۴۴۵ ذ ۲/۴۴۶ ذ ۲/۴۴۷ ذ ۲/۴۴۸ ذ ۲/۴۴۹ ذ ۲/۴۵۰ ذ ۲/۴۵۱ ذ ۲/۴۵۲ ذ ۲/۴۵۳ ذ ۲/۴۵۴ ذ ۲/۴۵۵ ذ ۲/۴۵۶ ذ ۲/۴۵۷ ذ ۲/۴۵۸ ذ ۲/۴۵۹ ذ ۲/۴۶۰ ذ ۲/۴۶۱ ذ ۲/۴۶۲ ذ ۲/۴۶۳ ذ ۲/۴۶۴ ذ ۲/۴۶۵ ذ ۲/۴۶۶ ذ ۲/۴۶۷ ذ ۲/۴۶۸ ذ ۲/۴۶۹ ذ ۲/۴۷۰ ذ ۲/۴۷۱ ذ ۲/۴۷۲ ذ ۲/۴۷۳ ذ ۲/۴۷۴ ذ ۲/۴۷۵ ذ ۲/۴۷۶ ذ ۲/۴۷۷ ذ ۲/۴۷۸ ذ ۲/۴۷۹ ذ ۲/۴۸۰ ذ ۲/۴۸۱ ذ ۲/۴۸۲ ذ ۲/۴۸۳ ذ ۲/۴۸۴ ذ ۲/۴۸۵ ذ ۲/۴۸۶ ذ ۲/۴۸۷ ذ ۲/۴۸۸ ذ ۲/۴۸۹ ذ ۲/۴۹۰ ذ ۲/۴۹۱ ذ ۲/۴۹۲ ذ ۲/۴۹۳ ذ ۲/۴۹۴ ذ ۲/۴۹۵ ذ ۲/۴۹۶ ذ ۲/۴۹۷ ذ ۲/۴۹۸ ذ ۲/۴۹۹ ذ ۲/۵۰۰ ذ ۲/۵۰۱ ذ ۲/۵۰۲ ذ ۲/۵۰۳ ذ ۲/۵۰۴ ذ ۲/۵۰۵ ذ ۲/۵۰۶ ذ ۲/۵۰۷ ذ ۲/۵۰۸ ذ ۲/۵۰۹ ذ ۲/۵۱۰ ذ ۲/۵۱۱ ذ ۲/۵۱۲ ذ ۲/۵۱۳ ذ ۲/۵۱۴ ذ ۲/۵۱۵ ذ ۲/۵۱۶ ذ ۲/۵۱۷ ذ ۲/۵۱۸ ذ ۲/۵۱۹ ذ ۲/۵۲۰ ذ ۲/۵۲۱ ذ ۲/۵۲۲ ذ ۲/۵۲۳ ذ ۲/۵۲۴ ذ ۲/۵۲۵ ذ ۲/۵۲۶ ذ ۲/۵۲۷ ذ ۲/۵۲۸ ذ ۲/۵۲۹ ذ ۲/۵۳۰ ذ ۲/۵۳۱ ذ ۲/۵۳۲ ذ ۲/۵۳۳ ذ ۲/۵۳۴ ذ ۲/۵۳۵ ذ ۲/۵۳۶ ذ ۲/۵۳۷ ذ ۲/۵۳۸ ذ ۲/۵۳۹ ذ ۲/۵۴۰ ذ ۲/۵۴۱ ذ ۲/۵۴۲ ذ ۲/۵۴۳ ذ ۲/۵۴۴ ذ ۲/۵۴۵ ذ ۲/۵۴۶ ذ ۲/۵۴۷ ذ ۲/۵۴۸ ذ ۲/۵۴۹ ذ ۲/۵۵۰ ذ ۲/۵۵۱ ذ ۲/۵۵۲ ذ ۲/۵۵۳ ذ ۲/۵۵۴ ذ ۲/۵۵۵ ذ ۲/۵۵۶ ذ ۲/۵۵۷ ذ ۲/۵۵۸ ذ ۲/۵۵۹ ذ ۲/۵۶۰ ذ ۲/۵۶۱ ذ ۲/۵۶۲ ذ ۲/۵۶۳ ذ ۲/۵۶۴ ذ ۲/۵۶۵ ذ ۲/۵۶۶ ذ ۲/۵۶۷ ذ ۲/۵۶۸ ذ ۲/۵۶۹ ذ ۲/۵۷۰ ذ ۲/۵۷۱ ذ ۲/۵۷۲ ذ ۲/۵۷۳ ذ ۲/۵۷۴ ذ ۲/۵۷۵ ذ ۲/۵۷۶ ذ ۲/۵۷۷ ذ ۲/۵۷۸ ذ ۲/۵۷۹ ذ ۲/۵۸۰ ذ ۲/۵۸۱ ذ ۲/۵۸۲ ذ ۲/۵۸۳ ذ ۲/۵۸۴ ذ ۲/۵۸۵ ذ ۲/۵۸۶ ذ ۲/۵۸۷ ذ ۲/۵۸۸ ذ ۲/۵۸۹ ذ ۲/۵۹۰ ذ ۲/۵۹۱ ذ ۲/۵۹۲ ذ ۲/۵۹۳ ذ ۲/۵۹۴ ذ ۲/۵۹۵ ذ ۲/۵۹۶ ذ ۲/۵۹۷ ذ ۲/۵۹۸ ذ ۲/۵۹۹ ذ ۲/۶۰۰ ذ ۲/۶۰۱ ذ ۲/۶۰۲ ذ ۲/۶۰۳ ذ ۲/۶۰۴ ذ ۲/۶۰۵ ذ ۲/۶۰۶ ذ ۲/۶۰۷ ذ ۲/۶۰۸ ذ ۲/۶۰۹ ذ ۲/۶۱۰ ذ ۲/۶۱۱ ذ ۲/۶۱۲ ذ ۲/۶۱۳ ذ ۲/۶۱۴ ذ ۲/۶۱۵ ذ ۲/۶۱۶ ذ ۲/۶۱۷ ذ ۲/۶۱۸ ذ ۲/۶۱۹ ذ ۲/۶۲۰ ذ ۲/۶۲۱ ذ ۲/۶۲۲ ذ ۲/۶۲۳ ذ ۲/۶۲۴ ذ ۲/۶۲۵ ذ ۲/۶۲۶ ذ ۲/۶۲۷ ذ ۲/۶۲۸ ذ ۲/۶۲۹ ذ ۲/۶۳۰ ذ ۲/۶۳۱ ذ ۲/۶۳۲ ذ ۲/۶۳۳ ذ ۲/۶۳۴ ذ ۲/۶۳۵ ذ ۲/۶۳۶ ذ ۲/۶۳۷ ذ ۲/۶۳۸ ذ ۲/۶۳۹ ذ ۲/۶۴۰ ذ ۲/۶۴۱ ذ ۲/۶۴۲ ذ ۲/۶۴۳ ذ ۲/۶۴۴ ذ ۲/۶۴۵ ذ ۲/۶۴۶ ذ ۲/۶۴۷ ذ ۲/۶۴۸ ذ ۲/۶۴۹ ذ ۲/۶۵۰ ذ ۲/۶۵۱ ذ ۲/۶۵۲ ذ ۲/۶۵۳ ذ ۲/۶۵۴ ذ ۲/۶۵۵ ذ ۲/۶۵۶ ذ ۲/۶۵۷ ذ ۲/۶۵۸ ذ ۲/۶۵۹ ذ ۲/۶۶۰ ذ ۲/۶۶۱ ذ ۲/۶۶۲ ذ ۲/۶۶۳ ذ ۲/۶۶۴ ذ ۲/۶۶۵ ذ ۲/۶۶۶ ذ ۲/۶۶۷ ذ ۲/۶۶۸ ذ ۲/۶۶۹ ذ ۲/۶۷۰ ذ ۲/۶۷۱ ذ ۲/۶۷۲ ذ ۲/۶۷۳ ذ ۲/۶۷۴ ذ ۲/۶۷۵ ذ ۲/۶۷۶ ذ ۲/۶۷۷ ذ ۲/۶۷۸ ذ ۲/۶۷۹ ذ ۲/۶۸۰ ذ ۲/۶۸۱ ذ ۲/۶۸۲ ذ ۲/۶۸۳ ذ ۲/۶۸۴ ذ ۲/۶۸۵ ذ ۲/۶۸۶ ذ ۲/۶۸۷ ذ ۲/۶۸۸ ذ ۲/۶۸۹ ذ ۲/۶۹۰ ذ ۲/۶۹۱ ذ ۲/۶۹۲ ذ ۲/۶۹۳ ذ ۲/۶۹۴ ذ ۲/۶۹۵ ذ ۲/۶۹۶ ذ ۲/۶۹۷ ذ ۲/۶۹۸ ذ ۲/۶۹۹ ذ ۲/۷۰۰ ذ ۲/۷۰۱ ذ ۲/۷۰۲ ذ ۲/۷۰۳ ذ ۲/۷۰۴ ذ ۲/۷۰۵ ذ ۲/۷۰۶ ذ ۲/۷۰۷ ذ ۲/۷۰۸ ذ ۲/۷۰۹ ذ ۲/۷۱۰ ذ ۲/۷۱۱ ذ ۲/۷۱۲ ذ ۲/۷۱۳ ذ ۲/۷۱۴ ذ ۲/۷۱۵ ذ ۲/۷۱۶ ذ ۲/۷۱۷ ذ ۲/۷۱۸ ذ ۲/۷۱۹ ذ ۲/۷۲۰ ذ ۲/۷۲۱ ذ ۲/۷۲۲ ذ ۲/۷۲۳ ذ ۲/۷۲۴ ذ ۲/۷۲۵ ذ ۲/۷۲۶ ذ ۲/۷۲۷ ذ ۲/۷۲۸ ذ ۲/۷۲۹ ذ ۲/۷۳۰ ذ ۲/۷۳۱ ذ ۲/۷۳۲ ذ ۲/۷۳۳ ذ ۲/۷۳۴ ذ ۲/۷۳۵ ذ ۲/۷۳۶ ذ ۲/۷۳۷ ذ ۲/۷۳۸ ذ ۲/۷۳۹ ذ ۲/۷۴۰ ذ ۲/۷۴۱ ذ ۲/۷۴۲ ذ ۲/۷۴۳ ذ ۲/۷۴۴ ذ ۲/۷۴۵ ذ ۲/۷۴۶ ذ ۲/۷۴۷ ذ ۲/۷۴۸ ذ ۲/۷۴۹ ذ ۲/۷۵۰ ذ ۲/۷۵۱ ذ ۲/۷۵۲ ذ ۲/۷۵۳ ذ ۲/۷۵۴ ذ ۲/۷۵۵ ذ ۲/۷۵۶ ذ ۲/۷۵۷ ذ ۲/۷۵۸ ذ ۲/۷۵۹ ذ ۲/۷۶۰ ذ ۲/۷۶۱ ذ ۲/۷۶۲ ذ ۲/۷۶۳ ذ ۲/۷۶۴ ذ ۲/۷۶۵ ذ ۲/۷۶۶ ذ ۲/۷۶۷ ذ ۲/۷۶۸ ذ ۲/۷۶۹ ذ ۲/۷۷۰ ذ ۲/۷۷۱ ذ ۲/۷۷۲ ذ ۲/۷۷۳ ذ ۲/۷۷۴ ذ ۲/۷۷۵ ذ ۲/۷۷۶ ذ ۲/۷۷۷ ذ ۲/۷۷۸ ذ ۲/۷۷۹ ذ ۲/۷۸۰ ذ ۲/۷۸۱ ذ ۲/۷۸۲ ذ ۲/۷۸۳ ذ ۲/۷۸۴ ذ ۲/۷۸۵ ذ ۲/۷۸۶ ذ ۲/۷۸۷ ذ ۲/۷۸۸ ذ ۲/۷۸۹ ذ ۲/۷۹۰ ذ ۲/۷۹۱ ذ ۲/۷۹۲ ذ ۲/۷۹۳ ذ ۲/۷۹۴ ذ ۲/۷۹۵ ذ ۲/۷۹۶ ذ ۲/۷۹۷ ذ ۲/۷۹۸ ذ ۲/۷۹۹ ذ ۲/۸۰۰ ذ ۲/۸۰۱ ذ ۲/۸۰۲ ذ ۲/۸۰۳ ذ ۲/۸۰۴ ذ ۲/۸۰۵ ذ ۲/۸۰۶ ذ ۲/۸۰۷ ذ ۲/۸۰۸ ذ ۲/۸۰۹ ذ ۲/۸۱۰ ذ ۲/۸۱۱ ذ ۲/۸۱۲ ذ ۲/۸۱۳ ذ ۲/۸۱۴ ذ ۲/۸۱۵ ذ ۲/۸۱۶ ذ ۲/۸۱۷ ذ ۲/۸۱۸ ذ ۲/۸۱۹ ذ ۲/۸۲۰ ذ ۲/۸۲۱ ذ ۲/۸۲۲ ذ ۲/۸۲۳ ذ ۲/۸۲۴ ذ ۲/۸۲۵ ذ ۲/۸۲۶ ذ ۲/۸۲۷ ذ ۲/۸۲۸ ذ ۲/۸۲۹ ذ ۲/۸۳۰ ذ ۲/۸۳۱ ذ ۲/۸۳۲ ذ ۲/۸۳۳ ذ ۲/۸۳۴ ذ ۲/۸۳۵ ذ ۲/۸۳۶ ذ ۲/۸۳۷ ذ ۲/۸۳۸ ذ ۲/۸۳۹ ذ ۲/۸۴۰ ذ ۲/۸۴۱ ذ ۲/۸۴۲ ذ ۲/۸۴۳ ذ ۲/۸۴۴ ذ ۲/۸۴۵ ذ ۲/۸۴۶ ذ ۲/۸۴۷ ذ ۲/۸۴۸ ذ ۲/۸۴۹ ذ ۲/۸۵۰ ذ ۲/۸۵۱ ذ ۲/۸۵۲ ذ ۲/۸۵۳ ذ ۲/۸۵۴ ذ ۲/۸۵۵ ذ ۲/۸۵۶ ذ ۲/۸۵۷ ذ ۲/۸۵۸ ذ ۲/۸۵۹ ذ ۲/۸۶۰ ذ ۲/۸۶۱ ذ ۲/۸۶۲ ذ ۲/۸۶۳ ذ ۲/۸۶۴ ذ ۲/۸۶۵ ذ ۲/۸۶۶ ذ ۲/۸۶۷ ذ ۲/۸۶۸ ذ ۲/۸۶۹ ذ ۲/۸۷۰ ذ ۲/۸۷۱ ذ ۲/۸۷۲ ذ ۲/۸۷۳ ذ ۲/۸۷۴ ذ ۲/۸۷۵ ذ ۲/۸۷۶ ذ ۲/۸۷۷ ذ ۲/۸۷۸ ذ ۲/۸۷۹ ذ ۲/۸۸۰ ذ ۲/۸۸۱ ذ ۲/۸۸۲ ذ ۲/۸۸۳ ذ ۲/۸۸۴ ذ ۲/۸۸۵ ذ ۲/۸۸۶ ذ ۲/۸۸۷ ذ ۲/۸۸۸ ذ ۲/۸۸۹ ذ ۲/۸۹۰ ذ ۲/۸۹۱ ذ ۲/۸۹۲ ذ ۲/۸۹۳ ذ ۲/۸۹۴ ذ ۲/۸۹۵ ذ ۲/۸۹۶ ذ ۲/۸۹۷ ذ ۲/۸۹۸ ذ ۲/۸۹۹ ذ ۲/۹۰۰ ذ ۲/۹۰۱ ذ ۲/۹۰۲ ذ ۲/۹۰۳ ذ ۲/۹۰۴ ذ ۲/۹۰۵ ذ ۲/۹۰۶ ذ ۲/۹۰۷ ذ ۲/۹۰۸ ذ ۲/۹۰۹ ذ ۲/۹۱۰ ذ ۲/۹۱۱ ذ ۲/۹۱۲ ذ ۲/۹۱۳ ذ ۲/۹۱۴ ذ ۲/۹۱۵ ذ ۲/۹۱۶ ذ ۲/۹۱۷ ذ ۲/۹۱۸ ذ ۲/۹۱۹ ذ ۲/۹۲۰ ذ ۲/۹۲۱ ذ ۲/۹۲۲ ذ ۲/۹۲۳ ذ ۲/۹۲۴ ذ ۲/۹۲۵ ذ ۲/۹۲۶ ذ ۲/۹۲۷ ذ ۲/۹۲۸ ذ ۲/۹۲۹ ذ ۲/۹۳۰ ذ ۲/۹۳۱ ذ ۲/۹۳۲ ذ ۲/۹۳۳ ذ ۲/۹۳۴ ذ ۲/۹۳۵ ذ ۲/۹۳۶ ذ ۲/۹۳۷ ذ ۲/۹۳۸ ذ ۲/۹۳۹ ذ ۲/۹۴۰ ذ ۲/۹۴۱ ذ ۲/۹۴۲ ذ ۲/۹۴۳ ذ ۲/۹۴۴ ذ ۲/۹۴۵ ذ ۲/۹۴۶ ذ ۲/۹۴۷ ذ ۲/۹۴۸ ذ ۲/۹۴۹ ذ ۲/۹۵۰ ذ ۲/۹۵۱ ذ ۲/۹۵۲ ذ ۲/۹۵۳ ذ ۲/۹۵۴ ذ ۲/۹۵۵ ذ ۲/۹۵۶ ذ ۲/۹۵۷ ذ ۲/۹۵۸ ذ ۲/۹۵۹ ذ ۲/۹۶۰ ذ ۲/۹۶۱ ذ ۲/۹۶۲ ذ ۲/۹۶۳ ذ ۲/۹۶۴ ذ ۲/۹۶۵ ذ ۲/۹۶۶ ذ ۲/۹۶۷ ذ ۲/۹۶۸ ذ ۲/۹۶۹ ذ ۲/۹۷۰ ذ ۲/۹۷۱ ذ ۲/۹۷۲ ذ ۲/۹۷۳ ذ ۲/۹۷۴ ذ ۲/۹۷۵ ذ ۲/۹۷۶ ذ ۲/۹۷۷ ذ ۲/۹۷۸ ذ ۲/۹۷۹ ذ ۲/۹۸۰ ذ ۲/۹۸۱ ذ ۲/۹۸۲ ذ ۲/۹۸۳ ذ ۲/۹۸۴ ذ ۲/۹۸۵ ذ ۲/۹۸۶ ذ ۲/۹۸۷ ذ ۲/۹۸۸ ذ ۲/۹۸۹ ذ ۲/۹۹۰ ذ ۲/۹۹۱ ذ ۲/۹۹۲ ذ ۲/۹۹۳ ذ ۲/۹۹۴ ذ ۲/۹۹۵ ذ ۲/۹۹۶ ذ ۲/۹۹۷ ذ ۲/۹۹۸ ذ ۲/۹۹۹ ذ ۱۰۰۰ ذ ۱۰۰۱ ذ ۱۰۰۲ ذ ۱۰۰۳ ذ ۱۰۰۴ ذ ۱۰۰۵ ذ ۱۰۰۶ ذ ۱۰۰۷ ذ ۱۰۰۸ ذ ۱۰۰۹ ذ ۱۰۱۰ ذ ۱۰۱۱ ذ ۱۰۱۲ ذ ۱۰۱۳ ذ ۱۰۱۴ ذ ۱۰۱۵ ذ ۱۰۱۶ ذ ۱۰۱۷ ذ ۱۰۱۸ ذ ۱۰۱۹ ذ ۱۰۲۰ ذ ۱۰۲۱ ذ ۱۰۲۲ ذ ۱۰۲۳ ذ ۱۰۲۴ ذ ۱۰۲۵ ذ ۱۰۲۶ ذ ۱۰۲۷ ذ ۱۰۲۸ ذ ۱۰۲۹ ذ ۱۰۳۰ ذ ۱۰۳۱ ذ ۱۰۳۲ ذ ۱۰۳۳ ذ ۱۰۳۴ ذ ۱۰۳۵ ذ ۱۰۳۶ ذ ۱۰۳۷ ذ ۱۰۳۸ ذ ۱۰۳۹ ذ ۱۰۴۰ ذ ۱۰۴۱ ذ ۱۰۴۲ ذ ۱۰۴۳ ذ ۱۰۴۴ ذ ۱۰۴۵ ذ ۱۰۴۶ ذ ۱۰۴۷ ذ ۱۰۴۸ ذ ۱۰۴۹ ذ ۱۰۵۰ ذ ۱۰۵۱ ذ ۱۰۵۲ ذ ۱۰۵۳ ذ ۱۰۵۴ ذ ۱۰۵۵ ذ ۱۰۵۶ ذ ۱۰۵۷ ذ ۱۰۵۸ ذ ۱۰۵۹ ذ ۱۰۶۰ ذ ۱۰۶۱ ذ ۱۰۶۲ ذ ۱۰۶۳ ذ ۱۰۶۴ ذ ۱۰۶۵ ذ ۱۰۶۶ ذ ۱۰۶۷ ذ ۱۰۶۸ ذ ۱۰۶۹ ذ ۱۰۷۰ ذ ۱۰۷۱ ذ ۱۰۷۲ ذ ۱۰۷۳ ذ ۱۰۷۴ ذ ۱۰۷۵ ذ ۱۰۷۶ ذ ۱۰۷۷ ذ ۱۰۷۸ ذ ۱۰۷۹ ذ ۱۰۸۰ ذ ۱۰۸۱ ذ ۱۰۸۲ ذ ۱۰۸۳ ذ ۱۰۸۴ ذ ۱۰۸۵ ذ ۱۰۸۶ ذ ۱۰۸۷ ذ ۱۰۸۸

میں ذلیل و خوار ہو گئے اور آخرت میں عذاب شدید میں مبتلا۔ (۲/۸۵)۔

(۴) اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو انہیں بہترین بدلہ ملتا۔ (۲/۱۰۳)

(۵) اگر تم میرے قوانین کو سامنے رکھو گے، انہیں بھلاؤ گے نہیں، تو میں تمہارے شرف و مجد میں

اضافہ کروں گا۔ (۲/۱۵۲)

(۶) اگر یہ اہل کتاب (قرآن پر ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔ (۳/۱۰۹)

(۷) اگر تم مومن ہو گے تو سب پر غالب رہو گے۔ (۳/۱۳۸)

(۸) اگر تم خدا کی راہ میں قتل کئے جاؤ گے یا مرجاؤ گے تو خدا کے ہاں سے مغفرت اور رحمت عطا

ہوگی۔ (۳/۱۵۶)۔

(۹) اگر تمہیں خدا کی نصرت حاصل رہی، تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔ (۳/۱۵۹)۔ لیکن خدا کی مدد

اُسے حاصل ہوتی ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ (۴/۴۰ و ۴/۴۱)۔

(۱۰) اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ شعار ہو گے تو تمہارے لئے اجر عظیم ہوگا۔ (۳/۱۷۸)۔

(۱۱) اگر تم کبار (بنیادی لغزشوں) سے بچو گے تو تمہاری ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی۔ (۴/۳۱)۔

(۱۲) اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ شعار ہوتے تو ہم ان کی زندگی کی ناخوشگواریاں کو دور کر دیتے

(۵/۶۵)۔ اگر یہ وحی خداوندی کا اتباع کرتے رہتے تو انہیں زمین اور آسمان سے کھانے پینے کو ملتا رہتا۔

(۵/۶۶)۔ ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ (۷/۹۶)۔

(۱۳) جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو شامل نہ کرے، تو اسے امن نصیب ہو جاتا ہے

اور کشادگی راہوں کی طرف راہ نمائی مل جاتی ہے۔ (۶/۸۳)۔

(۱۴) اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں امتیازی زندگی مل جائے گی۔ (۸/۲۹)۔

(۱۵) اگر تم بیس مجاہد ثابت قدم ہو گے تو دو سو پر غالب آ جاؤ گے — یہ اس وقت ہوگا جب تم

سامانِ حرب و ضرب کے اعتبار سے فریقِ مخالف کے برابر ہو گے۔ اگر اس باب میں تمہارے ہاں کمی ہوگی،

تو بھی اپنوں سے دو گنوں پر غالب آ جاؤ گے۔ (۸/۶۶-۶۵)۔

(۱۶) ایمان و تقویٰ سے اس زندگی میں بھی خوشگوازیوں کی بشارتیں ملتی ہیں اور آخرت میں بھی۔ یہ

خدا کا اہل قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ (۱۰/۶۴-۶۳)۔

(۱۷) جو ہماری راہ میں جدوجہد کرے گا، اسے ہم حصول مقصد کی کئی راہیں سچا دیں گے۔ (۲۹/۶۹۱)۔
 (۱۸) جو ایمان کے ساتھ ثابت قدم رہے گا اس پر ملائکہ کا نزول ہوگا جو اسے بشارتیں دیں گے کہ اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ (۴۱/۳۱ - ۳۰)۔
 (۱۹) ایمان اور اعمالِ صالحہ سے اختلاف فی الارض حاصل ہوتا ہے۔ (۲۴/۵۵)۔ یعنی اس دنیا میں حکومت اور مملکت مل جاتی ہے۔

(۲۰) اگر تم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔

(۹/۳۹ و ۴۶/۳۸)

(۲۱) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ (۲۰/۱۲۴)۔
 (۲۲) اگر تم شکر گزار ہو گے (نعمائے خداوندی کو اس کے قوانین کے مطابق صرف کرو گے) تو ہماری نعمتوں میں اضافہ ہوگا۔ اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (۱۴/۷)۔
 (۲۳) جو دوسروں کے لئے دے گا اور تقویٰ شعار ہوگا، اس کی زندگی کی راہیں آسان ہو جائیں گی۔ (۵۱ - ۹۲/۷)۔

(۲۴) ثابت قدم رہو۔ باہمی نظم و ضبط رکھو۔ تقویٰ شعار رہو۔ تاکہ تم کامیاب ہو سکو۔

(۳/۱۹۹۶)

(۲۵) بنی اسرائیل کو ذلت و خواری کے عذاب میں ماخوذ کیا گیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی تھی۔ (۳/۱۱۱)۔

ان مثالوں پر غور کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ خدا نے انسان کے سامنے دو ممکنات رکھ دیں اور اس سے کہہ دیا کہ ان میں سے جو راستہ چاہو اختیار کرو لیکن اتنا سمجھ رکھو کہ اگر تم نے یہ راہ اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اور اگر وہ راستہ اختیار کیا تو اس کا مال وہ ہوگا۔

اسی کو غیر تبدیل قانون کہا جاتا ہے اور اس قانون کا مقرر کیا جانا تقدیر کہلاتا ہے۔ یعنی انسانی عمل کا قانونِ خداوندی کے مطابق فطری نتیجہ۔

ہم نے پہلے کہا تھا کہ جو حکم مستقل ہو (یعنی اس میں تبدیلی نہ کی جائے) وہ قانون کی شکل اختیار کر لیتا

ہے۔ اب اس میں یہ اضافہ کر لینا چاہیئے کہ

جب خدا کسی بات کا حکم مستقل طور پر دے دے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا، تو اس حکم کو غیر متبدل قانون کہا جائے گا۔

اسلام دین ہے اور دین میں قوانین دیئے جاتے ہیں — خود لفظ دین کے معنی بھی قانون کے ہیں۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب ہے اس لئے اس میں دیئے گئے احکام میں اب تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان احکام کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس لئے قرآن کریم ضابطہ قوانین خداوندی ہے۔



نوال باب

یہ کیسے ہو گیا؟

قرآنِ کریم کی جو آیات گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکی ہیں، ان پر ایک بار پھر غور کیجئے اور یہ دیکھئے کہ کیا اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ، کوئی التباس و ابہام باقی رہتا ہے، یا خیف سی غلط فہمی کا بھی امکان ہے کہ

(۱) سلسلہ کائنات، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔

(۲) انسان صاحب اختیار و ارادہ اور اپنے فیصلوں اور اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ زندگی کے ہر دور اپنے پر، اس کے سامنے، غلط اور صحیح، دونوں راستے واضح طور پر موجود ہوتے ہیں اور اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جو نسا راستہ چاہے منتخب کر لے۔ وہ جس راستے پر چلے گا، اس کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے، جو اٹل اور غیر متبدل ہے — جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، زندگی کا بنیادی اصول ہے۔

ایک طرف ان حقائق کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ آپ بچپن سے اپنے گھروں میں، محلوں میں، بازاروں میں، مسجدوں میں، علماء کرام کی مجلسوں میں، صوفیاء و عظام کی محفلوں میں، کیا سنتے، اور قرآن مجید کی تفسیروں میں، احادیث کے مجموعوں میں، ائمہ سلف کی کتابوں میں، شعراء کے کلام میں، بزرگوں

ہمارے مروجہ عقائد

کے احوال میں، کیا پڑھتے چلے آئے ہیں۔ یہ کہ

دنیا میں ایک پتہ بھی خدا کے حکم کے بغیر نہیں مل سکتا۔ ان، خدا کے حکم کے بغیر کچھ

نہیں کر سکتا۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ اس کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہوتا ہے، وہ سب، اس کی پیدائش سے پہلے ہی، اس کی تقدیر میں نکھا ہوتا ہے اور اس نوشتہ تقدیر کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ مقدمہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ خدا قادر مطلق ہے، وہ جو چاہے کرے کسی کو اس کے حکم کے سامنے مجالِ سر تابی نہیں۔ وہ جسے چاہے بے حد و حساب رزق دے، جسے چاہے تنگی دے، جسے چاہے امید بنا دے، وہ جسے چاہے مفلس اور قلاش کر دے جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ وہ چاہے تو بادشاہوں سے بھیک منگا دے اور چاہے بھکاریوں کے سر پر تاج شاہی رکھ دے۔ تندرستی اور بیماری، موت اور زندگی، سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ انسانی تدبیر اس میں کچھ نہیں کر سکتی۔ مرضی مولے برہمہ اولیٰ۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ اس کی مرضی کے خلاف دل میں شکایت کا احساس تک پیدا نہ ہونے دے۔ جو کچھ ہو، اس پر صابر و شاکر رہے۔ جس قدر انسان راضی برضا رہے گا، اسی قدر اس کا شمار مقررینِ بارگاہِ الہی میں ہو گا۔

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے

نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

اب یہ ہے اسلام کی تعلیم اور یہ ہیں مسلمانوں کے عقائد! آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ قرآن کریم کی اس قدر صاف اور واضح تعلیم کے خلاف، یہ عقائد مسلمانوں میں کیسے رائج ہو گئے۔ اور رائج بھی اس انداز سے ہو گئے کہ عین دین بن گئے؟ اور ان کے تحت الشعور کی گہرائیوں میں اس شدت سے اتر گئے کہ اگر کسی کے دل میں، کسی وقت، ان کے خلاف کوئی خیال تک بھی ابھرے، تو وہ کانپنے لگ جائے کہ نہ معلوم اس سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے اور اگر کوئی شخص ان عقائد کے خلاف ایک لفظ تک بھی زبان پر لے آئے تو شور مچا دیا جائے کہ یہ ملحد ہے، دہریہ ہے، خدا کی قدرت کا منکر ہے، مادہ پرست ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے؟ یقیناً یہ چیز موجب ہزار حیرت اور باعث صد ہزار تعجب نظر آتی ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم میں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی اور ہمارے عقائد میں ایسا محیر العقول انقلاب کیسے آگیا، دراصل ایک خدا کی کتاب ہمارے پاس اس طرح موجود ہے کہ اس میں ایک حرف اور نقطہ تک

کافر نہیں آیا، اور دن رات، صبح و شام اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس کے درس دیئے جلتے ہیں اس کی تفسیریں لکھی جاتی ہیں۔

فرمایئے کہ یہ مقام ایسا ہے یا نہیں کہ اس پر رُک جائے اور نہایت صبر و سکون اور انتہائی غور و فکر سے اس کے متعلق سوچا جائے کہ یہ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور کیا اب اس کی اصلاح کا امکان ہے یا نہیں؟

ہمارے ہاں مسئلہ تقدیر کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کا عشرِ عشر بھی شاید کسی دوسرے مسئلہ کے حصّہ میں نہیں آیا ہوگا۔ چونکہ اس مسئلہ کو "ایمانیات" کا جزو بنادیا گیا (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی) اس لئے ہونہیں سکتا تھا کہ اسلام کے متعلق کتاب لکھی جائے اور اس میں تقدیر کا ذکر نہ آئے۔ ضمنی طور پر لکھے جانے کے علاوہ، اس موضوع پر بڑی بڑی ضخیم مستقل تصانیف مرتب کی گئیں لیکن اُلجھا دے ڈالنے والوں کا کمال ہے کہ اس مسئلہ کو جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی یہ اتنا ہی اُلجھتا چلا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق قرآنِ کریم کی رُو سے گفتگو کی جاتی، اسے فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں کی آماجگاہ بنادیا گیا اور مذہبی نقطہ نگاہ سے اس پر خارج از قرآن گوشوں سے بحث کی گئی۔ ہم ان تفصیلات کی بحث میں جانا سعیِ لاحاصل سمجھتے ہیں، صرف اس لئے نہیں کہ — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے — بلکہ اس لئے بھی کہ اگر ہم انہیں آپ کے سامنے پیش کریں تو آپ سمجھ ہی نہ سکیں کہ ان کا مطلب کیا ہے اور وہیں سابقہ علم الکلام کی بحثیں آج لا حاصل ہیں | کے ساتھ ان کا تعلق کیا ہے، آج زندگی کے مسائل پر جس زاویہ نگاہ سے غور

فکر کیا جاتا ہے، اس کی روشنی میں، اُس زمانہ کا علم الکلام اب بیکار اور فرسودہ ہو کر رہ گیا ہے۔ فرسودہ بھی، اور دورِ حاضر کے ذہن کے لئے پیچیدہ بلکہ مہمل بھی۔ (مثلاً) امام ابنِ حزم اندلسی کا شمار ممتاز ترین اکابرینِ اسلام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق، کتاب "المحل والنحل" میں فضائل و عقائد کے عنوان سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس بحث کا آغاز حسبِ ذیل سوال و جواب سے ہوتا ہے۔

ان لوگوں نے جو فعل کے ساتھ استطاعت کے قائل ہیں کہا ہے کہ جب یہ سوال کیا

جائے کہ کافر کو اس ایمان کی استطاعت ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے یا اسے اسکی استطاعت نہیں ہے۔ انہوں نے جواب یہ دیا ہے کہ کافر کو بطور بدل کے ایمان کی استطاعت ہے یعنی کفر میں ہمیشہ نہ رہے گا لیکن اسے قطع کر دے گا اور اس کو ایمان سے بدل دے گا۔

اس کا جو جواب دینا واجب ہے وہ یہ ہے کہ وہ بظاہر حال اپنے سلامت اعضاء و ارتفاع موانع کی وجہ سے مستطیع ہے ایمان اور کفر کے جمع کرنے پر جب تک کہ وہ کافر رہے اور جب تک اللہ اس کی مدد نہ کرے غیر مستطیع ہے۔ جب اس کی مدد کر دی تو اس کی استطاعت مکمل ہو گئی تو اس نے فعل کیا۔ اگر کہا جائے کہ تو بے تکلف و مامور ہوا تو ہم کہیں گے ہاں۔

آپ سوچئے کہ اگر اس بحث کو جو سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے تو آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ ہمارے ہاں اس مسئلہ پر اسی انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ کتابوں پر کتابیں اسی پنج سے لکھی گئی ہیں اور یہی کچھ ہمارے مذہبی نکتوں اور دارالعلوموں میں پڑھایا جاتا ہے۔

۱۰۔ اب رہا یہ سوال کہ ان نئے (اور خلاف قرآن) عقائد کی ابتدا کس نے کی اور یہ کس طرح اسلام کا جزو ہی نہیں بلکہ اصل و اساس قرار پا گئے، تو اس کا تعلق تاریخ سے ہے، اور یہ سنکر ایک دفعہ تو آپ یقیناً بھونچتے رہ جائیں گے لیکن ہے یہ حقیقت کہ تاریخی نقطہ

تاریخ ناقابل اعتماد ہے | نگاہ سے ابتدائی دور سے متعلق ہماری تاریخ بڑی ناقابل اعتماد ہے۔ اس بحث کا تعلق ہمارے زیر نظر موضوع سے نہیں اس لئے ہم اس مقام پر اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے بلکہ مختصر اس کی وجوہات یہ ہیں کہ

(۱) ہماری سب سے پہلی مبسوط تاریخ — جسے مستند ہی نہیں بلکہ اقم التواریخ سمجھا جاتا ہے، امام طبری کی تاریخ ہے جو تیرہ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ تاریخ، صدر اول (عہد رسالت مآب) کے قریب تین سو سال بعد منضبط کی گئی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی بنیاد کسی سابقہ تحریری ریکارڈ

لے میں نے اپنی کتاب ”سلیم کے نام خطوط“ جلد سوم میں ”ہماری تاریخ میں کیا ہے“ کے عنوان سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

پر نہیں، بلکہ زبانی روایات پر ہے۔ یعنی امام طہری نے لکھا ہے کہ میں یہ بات فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے سنی اور اس طرح روایات کا یہ زبانی سلسلہ صدرِ اول تک پہنچا دیا گیا۔ جو تاریخ اس طرح مرتب کی جائے وہ جس حد تک قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ اس کے بعد ہمارے ہاں تاریخ کی جو کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان کی بنیاد طہری کی تاریخ ہے۔ (اسی لئے اسے اُمّ التواریخ کہا جاتا ہے)۔

(۲) وہی تاریخ واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر سکتی ہے جو غیر جانبدارانہ اور معروضی طور پر (OBJECTIVELY) منضبط کی جائے۔ ہماری تاریخ جس زمانے میں منضبط ہوئی، امتِ فرقوں میں بٹ چکی تھی۔ اس لئے اس دور میں، تاریخ ہی نہیں بلکہ جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ فرقہ وارانہ تصورات اور گروہ بند تعصبات و رجحانات سے غیر متاثر نہیں رہ سکا۔ اُس زمانے میں خود مسئلہ تقدیر پر بھی فرقہ بندی کی دنیا بن چکا تھا یہی وجہ ہے جو ابو زہرہ مصری نے کہا ہے کہ آج یہ متحقق کرنا بھی دشوار ہے کہ عقیدہ جبر کا اولیں مؤسس کون تھا۔ اس کے الفاظ میں :-

جو فقہ خاص دھڑے کی صورت اختیار کر لے اس کے متعلق یہ فیصلہ کرنا بڑا دشوار ہے کہ اس کا اولین مؤسس کون ہے۔ لہذا اس فرقہ کا نقطہ آغاز معلوم کرنا کچھ آسان کام نہیں۔

(المذاہب اسلامیہ)

(۳) ہمارے ہاں، اسلاف کی عظمت و احترام کے سلسلہ میں یہ عقیدہ عام کر دیا گیا کہ جو کچھ انہوں نے لکھ دیا ہے (بلکہ جو کچھ ان کی طرف منسوب ہے) اس پر تنقید کرنا، ان کے علو مرتبت کی خلاف، فلہذا ان کی شان میں سخت گستاخی اور ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم میں، متقدمین کے متعلق اس قسم کے عقائد مروج ہوں، اس کی تاریخ کو تنقید کا نقطہ نگاہ سے کیسے پرکھا جاسکتا ہے، بالخصوص جب اس قسم تنقید کو کفر اور ارتداد تک قرار دے دیا جائے۔ جس قوم کے بچوں کو سبق یہ پڑھایا جائے کہ — خطائے بزرگاں گریستن خطاست — اس کے قدیم لٹریچر کو علم و بصیرت کی چھلنی میں چھانا کیسے جاسکتا ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر، ہماری تاریخ قابلِ اعتماد قرار نہیں پاسکتی۔ جہاں تک حضورِ نبی اکرم کی سیرتِ مقدسہ اور صحابہ کبار کے احوال و کوائف کا تعلق ہے ان کے لئے ہمارے پاس خدا کی کتاب

تاریخ کے متعلق صحیح مسلک | (قرآن مجید) کی سند و شہادت موجود ہے جس کی صداقت و ثقاہت پر ہمارا ایمان ہے۔ ہماری تاریخ کا جو حصہ اس دور سے متعلق ہے، اسے اس انداز سے پرکھا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں جو واقعات ایسے ہیں جو قرآنی سند و شہادت کے خلاف جاتے ہیں، وہ غلط لبذا، رد کر دینے کے قابل ہیں اور جو واقعات اس کی سند و شہادت کے مطابق ہیں، انہیں صحیح اور قابل قبول سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اس دور کے بعد کی تاریخ کے پرکھنے کے لئے ہمارے پاس اس قسم کا کوئی معیار نہیں۔ مسئلہ تقدیر کے متعلق چونکہ ہمارے پاس قرآن کی شہادت موجود ہیں، اس لئے ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بعد میں جو اعتقادات عام کئے گئے، ان میں کوئی قرآن کے مطابق ہیں اور کوئی اس کے خلاف۔

﴿ ۵۵ ﴾

ظہور اسلام کے وقت عقیدہ جبر | مسئلہ تقدیر کے متعلق قرآنی نقطہ نگاہ ہمارے سامنے آچکا ہے۔ قرآن ہی سے اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ نزول قرآن کے وقت ایسے لوگ موجود تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان کا اس باب میں کوئی اختیار نہیں۔ سورہ انعام میں ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا
آبَاءُ نَا وَلَا حَزَمْنَا مِنْ شَيْءٍ (۶/۱۳۹)۔

مشرکین یہ بات کہیں گے کہ اگر اللہ کو ایسا منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد۔ اور نہ ہی ہم کسی شے کو حرام قرار دیتے۔ (ہم یہ کچھ کر ہی اس لئے رہے ہیں کہ خدا کو ایسا منظور تھا۔ ہمارا اس میں کیا بس ہے)۔

قرآن کریم نے کہا کہ یہ لوگ حقیقت اور صداقت کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دیکھئے آیات (۲۳/۲۰، ۱۶/۳۵)۔ سورہ یٰسین میں ہے۔

وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ
آمَنُوا لَا نَطْعِمُهُمْ مَنْ تَوْشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ (۳۶/۴۷)۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک دور کرنے کے لئے اپنا مال خرچ کرو تو

وہ لوگ جو کافر ہیں یونین سے کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں تو وہ خود انہیں رزق عطا کر دیتا۔ ان کے بھوکے ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ خدا انہیں رزق دینا چاہتا ہی نہیں۔ سو جسے خدا رزق نہیں دینا چاہتا، اسے ہم کس طرح رزق دے سکتے ہیں۔ یہ تو خدا کی مرضی کے خلاف چلنا ہو گا۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں ایسے لوگ موجود تھے جو عقیدہ جبر کے قائل تھے۔ یہ مشرکین اور کفار تھے۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدہ کی تردید کی اور اس کے ساتھ ہی ایسی مثبت تعلیم دی جس سے اس قسم کے عقائد کی جڑ کٹ گئی۔ اس کی روشنی میں تقدیر کا مسئلہ اس آسانی سے حل ہو گیا کہ اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ تک باقی نہ رہا اور کسی کو کسی قسم کی مزید وضاحت کی بھی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ اگر کہیں اس کا شبہ نظر بھی آیا تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی۔ (مثلاً) روایات میں ہے کہ ایک چور کو حضرت عمرؓ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے چوری کیوں کی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ”خدا کا فیصلہ یہی تھا۔“ آپ نے اس پر حد بھی نافذ کر دی اور مزید کوڑوں کی بھی سزا دی۔ جب ان سے اس دوہری سزا کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا کہ حد تو چوری کے جرم کی سزا ہے اور کوڑے اس لئے کہ اس نے خدا کے خلاف جھوٹا الزام لگایا ہے۔

عقیدہ جبر کی وجہ سے سزا

مسلمانوں میں جب تک قرآن عظیم دین کی اساس و بنیاد رہا، جبر کا عقیدہ ان کے ہاں بار نہ پاسکا۔ ظاہر ہے کہ جس عقیدہ کو قرآن بے نص صریح، شرک اور کفر قرار دے، وہ مسلمانوں کے ہاں کس طرح بار پاسکتا تھا۔ لیکن جب قرآن نظروں سے اوجھل ہو گیا (یا اوجھل کر دیا گیا) اور وہ مرکزی اتھارٹی (یعنی نظام مملکت علیٰ منہاج رسالت) باقی نہ رہی جو اُمت کے عقائد و مسالک کو قرآنی ساحلوں کے اندر محصور رکھنے کی ذمہ دار تھی تو ہر قسم کے غیر قرآنی نظریات و تصورات، اسلام کا جزو بنتے چلے گئے۔ انہی میں مسئلہ تقدیر بھی تھا۔ بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ اُمت میں، اعتقاد کی بنا پر جو فرقہ سب سے پہلے

وجود میں آیا، وہ جبرِ فرقہ تھا! اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے، عرب قوم، بیشتر صحرائشین، خانہ بدوش، قبائل پر مشتمل تھی جو ریوڑ پال کر اور کھجوریں کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے دائیں بائیں، ایران اور روم کی وہ سلطنتیں تھیں جنکی تہذیب تمدن اور قوت و حشمت کے غلغلے صدیوں سے بند تھے۔ اہل ایران، ان عربوں کو کس قدر ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، اس شہادت آج بھی فردوسی کے شاہنامہ سے مل سکتی ہے۔ انہوں نے اسلام جیسا دین قبول کیا تو اس سے ان کے قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب پیدا ہو گیا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے، ایران کی وسیع و عریض مملکت کے مالک بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ایرانیوں کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ میدان جنگ میں عربوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور ان کے مفتوح و مغلوب ہو گئے لیکن اس سے ان کے دل پر جو گہرا زخم لگا، وہ مدتوں تک مندمل نہ ہو سکا۔ اس سے ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بدستور سلگتی رہی۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ عربوں کی اس بے پناہ قوت کا راز ان تصورات حیات میں مضرب ہے جو انہیں قرآن نے عطا کئے ہیں میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد جب ایران کا ایک گورنر، ہمس (من) ان، قید ہو کر مدینہ آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ ایرانی تو وہ قوم تھی، جو عربوں سے لڑنا تک اپنے لئے باعثِ ہتک سمجھتی تھی اور اگر کہیں ان کے ساتھ عربوں کی جھڑپ ہو جاتی تھی، تو ان کی فوج کی چھوٹی سی ٹکڑی، انہیں مار بھگایا کرتی تھی۔ اب کیا ہوا کہ ایرانیوں کی پوری قوم، مٹھی بھر عربوں سے اس بُری طرح شکست

کھا گئی۔ ہرمزان نے اس سوال کا جو جواب دیا، وہ بڑا

ہرمزان کی شہادت

غور طلب ہے۔ اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے پہلے جب ہمارا ٹکراؤ ہوتا تھا، تو عرب، ایرانیوں کے مقابلہ میں تنہا آتے تھے، اس لئے ہمارے لئے ان پر غالب آجانا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جو معرکہ پیش آیا تو اس میں ایرانی تو تنہا تھے لیکن ”عربوں کے ساتھ ان کا خدایا بھی تھا“ ان دونوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے لہذا، ہمیں شکست ہو گئی۔

”اب عربوں کے ساتھ ان کا خدا بھی تھا“ — یہ تھا عربوں کی قوت کا اصلی راز جس سے اہل ایران اچھی طرح واقف تھے۔ ”خدا کے ساتھ“ ہونے سے مراد یہی تھی کہ عربوں میں یہ قلبِ ماہیت

اس دین کی وجہ سے ہوئی ہے جو ان کے خدا نے انہیں عطا کیا ہے۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے ان میں انقلاب آفرینی کے جو جذبات ابھرے تھے اور اپنے بلند و بالا نصب العین حیات کی خاطر دنیا کی ہر غیر خدائی قوت کا بے باکانہ مقابلہ کرنے اور اس کے لئے جان تک دے دینے کا جو عزم ان کے سینوں میں بیدار ہوا تھا، اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی تھی۔ ایرانی اور بازنطینی، سب اس راز سے واقف تھے، لہذا، ان کی کوشش یہ تھی کہ عربوں کو ان تصورات حیات سے بیگانہ کر دیا جائے جو ان کی کامرانیوں اور کامیابیوں کی اصل واسطہ تھے۔

ظہور اسلام سے، یہودیت اور عیسائیت کے خود ساختہ مذاہب پر بھی کاری ضرب لگی۔ علاوہ ازیں، مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے، بازنطینی مملکت کے قصر مشید کی بنیادوں میں تزلزل آگیا تھا اور یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے دس نکال مل گیا تھا۔ لہذا، عربوں کے خلاف انتقام جوئی میں، یہ قویں بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی سازش

بروزے کار لانے کے لئے، عرب بھی دہی جو ایرانیوں کے ذہن میں تھا، یعنی مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح قرآن کے عطا کردہ انقلاب آفریں تصورات حیات سے بیگانہ بنا کر، ان کے دین میں بھی وہی ہی تحریف کر دی جائے جیسی تحریف ان کے مذاہب میں ہو چکی تھی۔ علامہ اقبال جب ”عرب“ کے مقابلہ میں ”عجم“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد صرف اہل ایران نہیں ہوتے۔ اس میں تمام غیر عرب قومیں شامل ہوتی ہیں اور جب وہ عربی اسلام کے مقابلہ میں عجمی اسلام پیش کرتے

ہیں، تو عربی اسلام سے ان کی مراد، وہ دین ہوتا ہے جو قرآن خالص نے عطا کیا تھا اور عجمی اسلام سے مفہوم وہ تمام غیر قرآنی تصورات جو مجوسیت، یہودیت، نصرانیت وغیرہ سے مستعار لے کر اسلام کا جزو بنا دیئے گئے اور اس طرح خدا کا یہ دین، انسانوں کے خود ساختہ اس مذہب میں تبدیل ہو گیا جو صدیوں سے ہمارے ہاں مروج چلا آرہا ہے۔ اس تحریف کا آغاز ایران سے ہوا تھا اور اس کے

لے مجھے اگر فرصت اور توفیق نصیب ہوئی تو میرا ارادہ (مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کا ہے جس میں یہ بتایا جائے کہ باقی ڈھلے ڈھلے پر دیکھئے)

پہلی کڑی، عقیدہ تقدیر میں تبدیلی تھی۔ مجوسیت کی بنیاد مسئلہ خیر و شر پر تھی اس لئے اہل ایران خوب جانتے تھے کہ قوموں کی زندگی پر اس عقیدہ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ اس راز سے اچھی طرح واقف تھے کہ جس قوم کا یہ عقیدہ ہو کہ انسان اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھ سے بکھتا ہے اور اقوام عالم کی صف میں اس کا مقام اس کے نظریات حیات اور ان کے مطابق اس کے اعمال و کردار متعین کرتے ہیں، وہ قوم بے پناہ قوتوں کی مالک بن جاتی ہے۔ اسے ان قوتوں سے بے گانہ بنا دینے کا طریق یہ ہے کہ ان میں یہ عقیدہ رائج کر دیا جائے کہ انسان کی اپنی تدبیر و اعمال سے کچھ نہیں ہوتا۔ اُس نے دنیا میں جس حالت میں رہنا ہوتا ہے، وہ پہلے سے مقدر ہوتی ہے اور اس میں کوئی شخص کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا! چنانچہ دین (اسلام) میں اس تحریف کی ابتدا اسی مسئلہ سے ہوئی۔ اعتقادات کی بنیادوں پر مسلمانوں میں جو فرقہ سب سے پہلے نمودار ہوا، اس کی بنیاد، مسئلہ تقدیر کے متعلق باہمی اختلاف پر تھی۔ یہ داستان دل چسپ بھی ہے اور انتہائی عبرت آموز اور الم انگیز بھی۔ یہ داستان نہیں، یہ المیہ ہے اس کے زوال کا، یہ حزینہ ہے اس کی زبوں حالی کا، یہ مرثیہ ہے اس کی موت کا۔

ایران میں ارباب دانش دینش اور ماہرین سیاست کا ایک گروہ تھا جسے اس آوڑہ کہا جاتا

تھا۔ انہیں شاہان ایران (اکاسرہ) کا حلقہ مشیران سمجھے جاتے تھے۔ اکبر کے نورتن) ان مقربین بارگاہ شہنشاہیت کو 'سونے کے کنگن'

بطور امتیازی نشان عطا ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں اس آوڑہ کہا جاتا تھا۔ استوار کے معنی کنگن کے ہیں۔ (ضمناً، قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ اہل جنت کو "سونے کے کنگن" پہنائے جائیں گے تو اس استعارہ سے ان کے بلند ترین امتیازی مقام کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

ایران کی شکست کے بعد، ایرانی فوج نے بالعموم اور اس آوڑہ نے بالخصوص، حضرت سعد بن وقاص (فارخ ایران) سے درخواست کی کہ جو مراعات مسلمانوں کو حاصل ہیں، اگر وہ ہمیں بھی مل جائیں تو ہم اسلام لاکر مسلمانوں کی بستیوں میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ ان یہ شرط منظور کر لی گئی اور اس طرح یہ لوگ

(بقیہ فوٹو مٹا) جائے گا کہ قرآن کا دین، موجودہ مروجہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا اور غیر قرآنی نظریات، تصورات، معتقدات کہاں کہاں سے، اور کن کن راستوں سے درآمد ہوئے۔

کوفہ اور بصرہ وغیرہ میں آباد ہو گئے۔۔۔۔۔ آج ہم ان مصالح کی تفصیلات سے تو واقف نہیں جن کے پیش نظر یہ اجازت دی گئی تھی لیکن جب ہم اس کے نتائج و عواقب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ قرین مصلحت نہیں تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ایران قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا جس کی وجہ سے، غلط تہذیب کے تصنیعات اور مسخ شدہ تمدن کے تکلفات ان کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، نظام سرمایہ داری، ان کے معاشرہ کی رگوں میں بطور خون حیات رواں دواں تھے۔ مجوسی معتقدات پر ان کے مذہب کی بنیاد تھی۔ ان کے ارباب دانش (بالخصوص اساورہ) فلسفہ، منطق، الہیات اور مابعد الطبیعیات وغیرہ سے متعلق مسائل پر بحث و نظر کے ماہر تھے۔

ان کے برعکس، عرب تھے کہ جن کی زندگی، دامن صحرا کی طرح سادہ، اور جن کا ذہن، فضائے دشت کی طرح صاف تھا۔ نہ وہ بساط سیاست کی مہرہ بازیوں سے واقف تھے اور نہ ہی نظری مسائل کی نکات آفرینیوں اور فلسفہ و منطق کی موشگافیوں سے آشنا۔ جس دین کے اتباع سے، انہیں دنیا میں یہ امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا، وہ بھی نہایت صاف، سیدھا اور سادہ تھا۔ چند واضح اور بین تصورات حیات اور ان کی پیدا کردہ قوتِ عمل — یہ تھا ان کا، بیچ زندگی اور اس نیست۔

اب سوچئے کہ اس قسم کی سادہ جبین اور مصفا نگاہ قوم میں، اگر ایرانی ذہن کو غلاما کے مواقع حاصل ہو جائیں اور وہ آپس بھی ایک خاص مقصد کو ساتھ لئے ہوئے، تو اس کا جو نتیجہ ہو گا وہ ظاہر ہے مسلمانوں کا سادہ ذہن، ان کی منطق آفرینیوں کا حریف نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی بستیوں میں مل جل

لے اس اختلاط کا ایک ایسا نتیجہ جس نے ملتِ اسلامیہ کی بے باطلت کر رکھ دی — نہیں؛ بلکہ جس نے انسانیت کی تاریخ کا رُمخ غلط سمت کی طرف موڑ دیا، اس سے بہت پہلے مدینہ میں رونما ہو چکا تھا۔ فتح ایران کے بعد، وہاں کے گورنر ہرمزان (اور اس کے ساتھیوں) کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیدی گئی۔ حضرت عمرؓ کی شہادت، انہی کی سازش کا نتیجہ تھی — وہ حادثہ عظیم جس پر انسانیت کی آنکھ آج تک خونبارہ فشاں ہے! اگر حضرت عمرؓ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

گئے اور وہاں انہوں نے، غیر محسوس طور پر اپنے خیالات کو پھیلانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں میں جس شخص نے سب سے پہلے مسئلہ تقدیر کو چھیڑا، تاریخ اس کا نام مجید بن خالد جھٹی بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو ابولونٹس سے اخذ کیا تھا جس کا تعلق استاورہ سے تھا۔ مقبذہ سے اس عقیدہ کو غیلان دمشقی نے لیا اور اسے آگے پھیلایا۔ اس عقیدہ کی رُو سے، انسان کو مجبور محض اور پہلے سے مقدر شدہ قسمت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا، قرار دیا گیا۔ اس اعتبار سے اس گروہ عیسائیت کے اثرات کو جبریہ کہا جاتا ہے۔

جبر کا عقیدہ، عیسائیت کی بھی بنیاد تھا۔ یہ عقیدہ کہ ہر انسانی پتہ پیدا نشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور انسان کا کوئی عمل، اس اولین گناہ کے دجستے کو دور نہیں کر سکتا، خالصتہً جبر ہے۔ پھر اناجیل کی رُو سے حضرت عیسیٰ نے اپنے آخری لمحات میں یہ دعا مانگی تھی کہ — خدایا! تیری مرضی پوری ہو، نہ کہ میری مرضی — یہ "راضی برضا" رہنے کے عقیدہ کی بنیاد تھی۔ چنانچہ، تاریخ کی ایک روایت کی رُو سے، غیلان دمشقی نے (جو قطبی الاصل تھا) عقیدہ جبر کو ایک نصرانی سے اخذ کیا تھا جو مسلمان ہو گیا تھا اور بعد میں پھر عیسائیت کی طرف پلٹ گیا تھا۔ خیر و شر کی ثنویت کا عقیدہ یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھا۔ جب بابل کی اسیری کے زمانے میں، بنی اسرائیل کو کسریٰ کے زیرِ اقتدار علاقہ کے قرب جوار میں رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کا خلا ملا ایرانیوں کے ساتھ لازمی تھا۔

اور یہودیت کے اس کے بعد، ان کی بابل سے رہائی اور اپنے سابقہ وطن میں دوبارہ آبادی بھی اکاسرہ ایران ہی کی کرم گسٹری کی رہنِ منت تھی۔ اس سے وہ زرتشتیوں سے اور بھی زیادہ متاثر ہوئے۔ خیر و شر کی ثنویت کا عقیدہ اس طرح ان کے ہاں ور آیا۔ اور مابعد الطبیعیاتی فلسفیانہ مسائل سے ان کی دل چسپی نے اس پر اور بھی جلا کر دیا۔ اسکندریہ میں یہودیوں کی دانش گاہ، اس زمانے میں فلسفہ کا مرکز تھی۔

چنانچہ تاریخ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ عقیدہ جبر کا بانی جعد بن درہم تھا جو خود تو مسلمان تھا لیکن اس نے یہ عقیدہ شام کے ایک یہودی سے اخذ کیا تھا۔ درہم سے یہ عقیدہ جہم بن صفوان نے سیکھا جو خراسانی الاصل تھا۔ اس نے اس عقیدہ کی نشر و اشاعت اس زور و شور سے کی کہ فرقہ جبرہ کا نام ہی جہمیہ پڑ گیا۔ چنانچہ تاریخ میں یہ فرقہ اسی نام سے متعارف ہے۔ ہماری تاریخ میں اس

عقیدہ کے موجد کے متعلق ہی اس قسم کا ابہام نہیں، بلکہ خود اس عقیدہ کے تعارف کے سلسلہ میں بھی التبتال ہے۔ چنانچہ کبھی اس فرقہ کو جب بریدہ کہتے ہیں۔۔۔ کیونکہ وہ خدا کے قادر مطلق ہونے پر زور دیتے تھے۔۔۔ اور کبھی قدریہ۔۔۔ کیونکہ وہ انسان کی قدرت اختیار کی نفی کرتے تھے (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔

مسلمانوں میں اس عقیدہ کا موجد، معبد ہو یا جہم اور اس کا ماخذ، مجوسیت ہو، یا یہودیت اور نصاریٰ، یہ حقیقت واضح ہے کہ اسلام میں یہ یکسر غیر قرآنی عقیدہ، غیر اسلامی سرچشموں سے آیا۔ یہ عجاسیوں کے ابتدائی عہد کا واقعہ ہے۔

اس مقام پر یقیناً ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس قسم کا غیر قرآنی عقیدہ، جس کا تعلق دین کے اساسات سے ہے، مسلمانوں میں عام کس طرح ہو گیا، یہ ٹھیک ہے کہ اس کی نشر و اشاعت کرنے والے اس کی تائید میں، فلسفیانہ دلائل پیش کرتے ہوں گے، لیکن ذہن، اس چیز کو یاد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ (کم از کم) اُس زمانے کے مسلمان، محض فلسفیانہ دلائل کی رو سے اس قسم کے عقیدہ کو اپنے دین کا جزو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس غیر قرآنی عقیدہ کی "دینی سند"

ہوں گے۔۔۔ اور دین کی سند انہیں دیدی گئی!!

یہ سن کر آپ یقیناً چونک اٹھے ہوں گے کہ یہ کیسے ہو سکتا تھا! یہ کیسے ہوا۔۔۔ یہ داستان بھی بڑی تعجب انگیز اور عبرت آموز ہے۔ اس سے صرف اس ایک عقیدہ (قدسیں) ہی کی سند نہیں ملی۔

اے مجوس، نصاریٰ، یہود وغیرہ کی طرف سے ایسا کچھ بطور سازش کیا گیا یا انہوں نے اس لئے ان خیالات کو مسلمانوں میں پھیلایا کہ وہ (اپنے عقیدہ کی رو سے) انہیں معصوم اور سچا سمجھتے تھے، ہم اس سوال کا جواب حتیٰ طور پر نہیں دے سکتے کیونکہ نیتوں کا جاننے والا خدا ہے۔ لیکن تاریخ سے جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے، اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ایسا کچھ دانستہ (بطور سازش) کیا گیا تھا لیکن دانستہ کیا گیا ہو یا نادانستہ، یہ قوم تو

دین میں جس قدر غیر قرآنی تصورات کی آمیزش ہوئی، ان کی بنیاد اسی سند پر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو دین کی بنیاد قرار دیا تھا اور خود حضور نبی اکرمؐ اسی کا اتباع فرماتے اور اسی کی تعلیم دیتے تھے۔ جب تک قرآن مجید دین کی اساس رہا، اسلام میں کسی غیر اسلامی نظریہ کی آمیزش نہ ہو سکی۔ دین میں آمیزش کرنے والوں نے، سب سے پہلے، اس بنیاد کو اس کے مقام سے ہٹایا اور یہ عقیدہ عام کیا کہ دین میں سند اور حجت (دلیل آخر) صرف قرآن نہیں۔ قرآن کے ساتھ اس کی مانند (مثله معہ) ایک اور چیز بھی ہے اور وہ ہیں روایات۔ روایات

روایات

کے متعلق، پہلے نو فقط اتنا ہی کہا گیا کہ ان سے قرآن کی تشریح ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ نبی کو خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تورہ شکتب (یعنی وحی جلی یا وحی مکتوب) اور دوسری تورہ شبعلفہ (یعنی وحی خفی یا وحی غیر مکتوب)۔ وحی مکتوب تو حضرت موسیٰؑ کی کتاب میں درج ہے اور وحی غیر مکتوب ان روایات پر مشتمل ہے جو حضرت ہارونؑ کی وساطت سے قوم میں مردج ہیں۔ شریعت یہودیت کا سارا مدار انہی روایات پر ہے۔ قرآن کریم نے وحی کی ایک ہی قسم بیان کی ہے جو ساری کی ساری اس کے اندر محفوظ ہے لیکن اب مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ نبی اکرمؐ کو بھی جو وحی خدا کی طرف سے ملی تھی، اس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی مکتوب یا وحی منلو (جو قرآن کے اندر درج ہے) اور دوسری وحی غیر مکتوب، یا وحی غیر منلو، جس کا مجموعہ روایات ہیں۔ (انہی کو احادیث کہا جاتا ہے) یہ دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور ہم باہر ہیں۔

اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اگر وحی کے پیش کردہ دو نظریات یا احکام میں باہم گرتضاد پایا جائے تو ان دونوں میں سے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس عقیدہ کے منطقی نتیجہ کے طور پر یہ کہا گیا کہ اگر قرآن اور حدیث میں کہیں تضاد پایا جائے، تو یہ سمجھنا چاہیے کہ حدیث نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ یعنی احادیث، قرآن کی ناسخ قرار پا گئیں۔ بالفاظ دیگر، دین میں سند اور حجت

لے وحی میں تضاد! یا للعجب۔ قرآن کریم نے اپنے منزل من اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں لیکن بعد میں عقیدہ عام کیا گیا کہ وحی میں تضادات عام ہوتے ہیں۔

روایات قرار پا گئیں اور قرآن مجید کی خاطر تلاوت کے لئے رہ گیا۔

نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا۔ حضورؐ نے صرف قرآن (مکمل اور مرتب شکل میں) امت کو دیا تھا جو حرفاً ہمارے پاس موجود ہے۔ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین حتیٰ کہ دیگر صحابہ کبارؓ نے بھی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے تو احادیث کے بکھرنے اور بیان کرنے تک کی بھی سخت ممانعت کر دی تھی تاکہ دین میں کوئی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لیکن جب حدیث کے متعلق مذکورہ بالا عقیدہ وضع کیا گیا تو پھر احادیث کے مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ احادیث کے جس مجموعے کو سب سے زیادہ صحیح قرار دیا جاتا ہے (یعنی امام بخاریؒ کا مجموعہ) وہ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوا تھا۔ (امام بخاریؒ نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی تھی)۔ باقی مجموعے ان کے بعد مرتب ہوئے تھے۔ صرف امام مالکؒ کا مجموعہ (موطا) اس سے پہلے مرتب ہوا تھا لیکن اس میں بہت کم احادیث تھیں۔ احادیث کے یہ تمام مجموعے کسی پہلے سے موجود تحریری مواد (WRITTEN RECORD) سے مرتب نہیں کئے گئے تھے۔ لوگوں سے زبانی سُن کر مرتب کئے گئے تھے۔ آپ سوچتے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد محض لوگوں کی زبانی روایات کی بنا پر جو احادیث جمع کی جا رہی تھیں ان کی (یعنی تو ایک طرف) علمی اور تاریخی حیثیت کیا ہوگی! لیکن ان احادیث کو (جو زیادہ سے زیادہ منسوب الی الرسولؐ تھیں۔ یعنی زبانی روایت بیان کرنے والوں نے جن کی صرف نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی تھی، انہیں) خود رسول اللہؐ کی صحیح ترین احادیث قرار دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ ان میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی کفر لازم آ جاتا ہے۔ اس طرح احادیث بیان کرنے میں راویوں سے جو سہو اور زبانی ہو سکتا ہے اُسے تو ایک طرف رکھتے، اس سے جھوٹی حدیثیں وضع کر کے انہیں ذات رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کرنے کی جو گنجائش پیدا ہو گئی، اس پر غور کیجئے۔ یہ وضعی احادیث کس وسعت سے پھیلانی گئیں اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگائیے کہ امام بخاریؒ نے کھلے کہ انہوں نے جب احادیث جمع کرنے کا کام شروع کیا تو انہیں چھ لاکھ حدیثیں ملیں۔ ان میں سے انہوں نے قریب سات ہزار حدیثوں کو اس قابل سمجھا کہ انہیں اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا جائے۔ باقی (قریب پانچ لاکھ تیرانوے ہزار روایات) کو انہوں نے مسترد کر دیا۔ جن احادیث کو انہوں نے اپنے مجموعہ میں داخل کیا ان کے صحیح ہونے کی سند بھی ان کی اپنی بصیرت اور

قباس نھئا۔ انہیں خود رسول اللہ کی تصدیق اور توثیق حاصل نہیں تھی۔

آپ یقیناً تعجب کریں گے کہ اس قدر کمزور معیاروں کے مطابق جمع کردہ روایات کو احادیث رسول اللہ کس طرح تسلیم کر لیا گیا! اس کی بنیاد جذباتی تھی۔ یعنی اُمت کو حضور رسالت مآب کی ذات اقدس عظیم کے ساتھ بے پناہ محبت ہے۔ (اور ہونی بھی چاہیے بشرطیکہ اسے قرآن کی حدود کے اندر رکھا جائے)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس چیز یا جس بات کو بھی حضور کی طرف منسوب کر دیا جائے اسے اُمت سرانگھوں پر اٹھاتی ہے۔ ان روایات کو تو پھر بھی حضور کے ارشادات گرامی کہا جاتا ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ دنیا میں بشر مقامات پر بعض پتھر رکھے ہیں جن پر قدم کے نشانات منقوش ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ حضور کے قدم مبارک کے نقوش ہیں۔ لوگ جا جا کر ان پتھروں کو بھی سجدے کرتے ہیں۔ یہی وہ جذبہ تھا جسے جعلی روایات وضع کرنے والوں نے (EXPLOIT) کیا اور جو جی میں آیا اسے حضور کی طرف منسوب کر کے احادیث رسول اللہ کے طور پر اُمت میں پھیلاتے چلے گئے۔ یہ تھا وہ دروازہ جس سے

غیر اسلامی نظریات اور معتقدات دین کا جزو بننے

عقیدہ جبر کی تائید میں روایات

چلے گئے۔ تقدیر کے مسئلہ کے متعلق کس قسم کی روایات وضع کی گئیں ان کا اندازہ دو چار مثالوں سے لگائیے جنہیں ہم (احادیث کے نہایت معتبر مجموعہ) مشکوٰۃ (باب التقدير) سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہ نے خداوند تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی تقدیروں کو نکھا ہے جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(۲) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ نے ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔ (بحوالہ مسلم)

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کا ٹھکانا نہ

لے ان تمام امور کی تفصیل آپ کو "احادیث طلع اسلام" لاہور کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" میں ملے گی۔

لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانہ آگ میں ہو گیا یا جنت میں۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)۔ نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا۔ پھر اس کی پشت پر اپنا دامن ہاتھ پھیرا۔ پھر اس میں سے (یعنی آدمؑ کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی اور فرمایا، پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے۔ یہ جنتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدمؑ کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی۔ اور پھر فرمایا کہ — پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے۔ یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ رسول اللہؐ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں ہی کے کام کراتا ہے..... اور خدا اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے..... اور خدا اس کو اسکے کاموں کے سبب دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ (بحوالہ مالک، ترمذی، ابو داؤد)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں جنتیوں کے نام ہیں..... اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جاسکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپ نے الٹے ہاتھ کی کتاب..... کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب بھی پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جاسکتا ہے نہ کم۔ (بحوالہ ترمذی)

(۵) حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کر لی ہے۔ یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدت (عمر)۔ اس کا نیک و پید عمل۔ اس کے رہنے کی جگہ۔ اس کی واپسی اور رزقی۔ (بحوالہ احمد)

اس قسم کی بے شمار روایات کتب احادیث میں مروی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ان روایات پر قرآن کریم اور علم و بصیرت کی رو سے غور کرے گا، اس کے دل میں قسم قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ ان پر اعتراضات کرے گا اور مزید وضاحت کے لئے سوالات بھی کرے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے، ایسی صورت حال سے بچنے کی خاطر پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دی تھیں۔ مثلاً — حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ رسول خدا تشریف لے گئے اور ہماری گفتگو کو سن کر آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

ان پر بحث اور گفتگو کی منعت اتنا سرخ ہو گیا کہ انار کے دانوں کا پانی آپ کے رخسار

میں پھڑپھڑا گیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں۔ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں، جب انہوں نے اس مسئلہ پر مناقشہ کیا تو ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں اور مکرر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ میں جھگڑا نہ کرنا اور کوئی بحث و گفتگو نہ کرنا۔ (بحوالہ ترمذی)۔

آپ نے غور فرمایا کہ تقدیر کے متعلق خلاف قرآن روایات وضع کرنے والوں نے کس طرح پیش بندی کر دی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ تم سے (تقدیر سے متعلق جو احادیث بیان کی جائیں، تم انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم کرو۔ جس شخص نے ان کے متعلق کسی قسم کی بحث یا گفتگو کی وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ان وضعی روایات پر تنقید اور اعتراضات کا دروازہ بند کر دینے کے بعد یہ لوگ ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اور یہ مقام پھر بڑا غور طلب ہے۔

قرآن کریم میں بعض حقائق کو تشبیہات کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ (انہیں آیات متشابہات کہا جاتا ہے)۔ انہیں ارباب علم و بصیرت اپنی اپنی فکر کے مطابق سمجھ سکتے ہیں اور اس قسم کے اختلافِ فہم سے ”اصل دین پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً

آیات متشابہات و محکمات قرآن کریم میں خدا کے متعلق ہے شَرُّ السَّوْءِ عَلٰی الْعَرْشِ۔ وہ عرش پر متمکن ہو گیا۔ بعض نے لفظ عرش کے حقیقی معانی لے کر کہا کہ آسمانوں پر

پہنچ کا ایک تخت ہے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ دوسروں نے عرش کے مجازی معانی لے کر کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جملہ کائنات پر اقتدار و اختیار — کنٹرول — خدا کا ہے۔ ان ہر دو مفاہیم کے موافق یا مخالف دلائل دیئے جاسکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس اختلاف سے انسان کے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک طرح سے مانا جائے تو انسان مومن قرار پائے اور دوسری طرح سے مانا جائے تو وہ کافر ہو جائے۔

لیکن بعض امور ایسے ہیں جنہیں اصولی طور پر اسی طرح ماننا ہوتا ہے، جس طرح وہ قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے۔ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ (کہہ دے کہ اللہ ایک ہے، خدا کا واحد ماننا اصل دین سے متعلق ہے۔ اس میں اس کی گنجائش نہیں کہ ایک شخص چاہے تو خدا کو ایک مان لے، اور دوسرا چاہے تو اسے (معاذ اللہ) دو یا تین تسلیم کر لے۔ خدا کا ایک ماننا ایمان ہے، اور ایک سے زیادہ ماننا کفر۔

کن باتوں کے ماننے سے ایک شخص مسلمان ہو سکتا ہے اور کن امور کے انکار کرنے سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی صراحت کر دی ہے۔ انہیں اجزائے ایمان کہا جاتا ہے اور یہ پانچ ہیں، یعنی مَنْ ۱ مَنْ ۲ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ الْكِتَابِ وَ النَّبِيِّينَ (۲/۱۷۷)۔ اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب، اور آخرت پر ایمان، دوسری جگہ ہے وَ مَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ (۲/۱۳۶)۔ جس نے انکار کیا اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت سے، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا — سارے قرآن کریم میں ایمان کے ہی پانچ اجزا بتائے گئے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب کسی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے اس سے کس قسم کا اقرار لیا جاتا ہے؟ اس سے کہا جاتا ہے (اور شاید آپ سے بھی یہ کہا گیا ہو) کہ کہو

أَشْهَدُ بِاللَّهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْقَدْرِ خَيْرٌ ۝ وَ شَرٌّ ۝ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

میں ایمان لایا اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، موت کے

بعد دوبارہ جی اٹھنے پر اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی، برائی اور بھلائی، نفع نقصان، خیر اور شر، سب خدا کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزاء تو خدا نے مقرر کئے تھے، اب اس میں چھٹے جزو کا اضافہ کیا گیا۔ یعنی تقدیر چھٹے جزو کا اضافہ **تقدیر پر ایمان** پر ایمان کا اضافہ۔ اب کوئی شخص

خدا، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت کے علاوہ تقدیر پر بھی ایمان لالائے۔ اور یہ اضافہ ہوا روایات کی رو سے۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ بنو اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر یقین نہ رکھے (۱) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت کو حق جلنے۔ (۳) مرنے کے بعد جی اٹھنے کو سچ مانے۔ اور (۴) تقدیر پر ایمان رکھے۔ (بحوالہ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(۲) حضرت ابن دینارؓ کہتے ہیں کہ (حضرت) ابن ابی کعبؓ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ تم کوئی حدیث بیان کرو تاکہ اس کو سُنکر شاید میرے شبہات دور ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر خداوند تعالیٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کر دے تو وہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ ان پر رحم کرے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہر حال بہتر و برتر ہوگی۔ اگر تو اُحد پہاڑ کے برابر بھی خدا کی راہ میں سونا خرچ کرے تو تیرا یہ عمل خیر اس وقت تک خدا کے ہاں قبول نہ ہوگا جب تک تو تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھے اور تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ نہ لے کہ جو کچھ تجھ کو پہنچا ہے وہ رکنے والا اور خطا کرنے والا نہیں تھا۔ (یعنی تجھے اس سے دو چار ہونا تھا)۔ اور جو چیز تجھ کو نہ پہنچنے والی تھی وہ ہرگز ہرگز تجھ کو نہ پہنچتی (یعنی جو کچھ تجھ کو حاصل ہوا وہ تیری سعی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ مقدر میں اسی طرح تھا اور جو چیز تجھ کو نہیں ملی وہ تیری کوشش سے بھی تجھے نہ ملتی) اس لئے کہ تقدیر الہی یونہی تھی (اگر تو اس اعتقاد کے خلاف اعتقاد رکھے گا) (یعنی تقدیر الہی پر تبرا کامل اعتقاد نہ ہوگا) اور اسی حالت میں تو مرجائے گا تو یقیناً دوزخ میں جاے گا۔ ابن دینارؓ کہتے ہیں کہ ابی ابن کعبؓ کا یہ بیان سُنکر میں عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی

یہی کیا۔ پھر حذیفہ بن الیمان کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر میں زید ابن ثابتؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی اسی قسم کی حدیث کو رسول اللہ سے روایت کیا۔ (بحوالہ احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

یوں تقدیر کا یہ نظریہ جسے مجوسیوں، نصرانیوں اور یہودیوں سے مستعار لیا گیا تھا ہمارے ہاں جزو ایمان بن گیا۔ ہمارے مذہبی حلقہ میں اس نظریہ نے کس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصریح | نے سیرت النبیؐ پر سلسلہ وار مجلدات شائع کی ہیں۔

اس سلسلہ کی چوتھی جلد میں انہوں نے عقائد سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت پر گفتگو کرنے کے بعد "قضا و قدر" کے عنوان سے ایک مستقل باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی ابتدا وہ یوں کرتے ہیں۔

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار دی گئی ہے۔ (صفحہ ۸۶)

کسی نظریہ کے "جزو ایمان" قرار پا جانے کے عملی عواقب کیا ہوتے ہیں، آپ آج اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ اس وقت لگ سکتا ہے، جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہو۔ ان حضرات کا فتوے یہ ہے کہ جو مسلمان، اجزائے ایمان میں سے کسی جزو کا منکر ہو (یعنی وہ اسے اس طرح نہ ماننا ہو جس طرح یہ حضرات کہیں) وہ مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہماری مذہبی پیشوائیت ذی اقتدار تھی، مسئلہ تقدیر کے ضمن میں، خونِ مسلم کی جس قدر آرزائی ہوئی اور جو قتل و غارت گری، اس "فتنہ ارتداد" کو دبانے کے لئے روار کھی گئی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

اس مقام پر آپ کے ذہن میں یقیناً یہ سوال بار بار ابھرتا ہو گا کہ جب اس قسم کے خلاف قرآن نظریہ کی عام اشاعت ہو رہی تھی، تو کیا امت میں کسی گوشے سے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج

بلند نہ ہوئی؟ کیا مسلمانوں میں ایسے لوگ باقی ہی نہیں رہے تھے جو قرآنی نقطہ نگاہ پیش کر کے اس عجی تصور

اس کے خلاف صد احتجاج

کی تردید کرتے! ایسے لوگ موجود تھے اور انہوں نے اس کے خلاف پوری شدت سے آواز بھی بلند کی تھی ان طرف سے پیش کردہ دلائل یہ تھے کہ

(۱) دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے جسے عقل و فکر اور علم و بصیرت کی رُخ سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(۲) قانونِ مکافاتِ عمل قرآن کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس کی رُو سے انسان اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے اور ان کے اچھے یا بُرے نتائج کا سزا دار۔ سلسلہ رشد و ہدایتِ رسولِ کتب اور جزا و سزا (آخرت) سب اسی مقصد کے لئے ہیں۔ اگر انسان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ مجبور ہے۔ یعنی وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔ تو ان میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جمادات، نباتات، حیوانات، مجبور ہیں۔ ان کی طرف نہ کوئی نبی بھیجا گیا نہ ہی وہ جزا اور سزا کے مکلف ہیں۔

اس پر آپ پوچھیں گے کہ نظریہ حبس کے حامیوں کی طرف سے ان دلائل کا جواب کیا دیا گیا۔ بحث کی خاطر تو ان کی طرف سے جواب دیا گیا۔ اور جواب دہی احادیث تھیں جن میں سے چند ایک پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن درحقیقت ان حضرات کو دلائل کا جواب، دلائل کی رُو سے دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس کے لئے ان کی ٹیکنک ہی اور ہوتی ہے۔ وہ جس مخالف کے دلائل کا جواب نہیں دے سکتے، اس کے لئے ایک لیبل تراش لیتے ہیں، اور پھر سلسل پر اپیگنڈہ سے، اس لیبل کو اس قدر گھناؤنا بنا دیتے ہیں

بس لیبل لگا دینا کافی ہے

کہ جس پر اسے چپا کر دیا جائے، عوام (بلا سوچے سمجھے) ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ پرانے زمانے کی باتوں کو چھوڑیے۔ ہمارے دور میں سرسیدؒ نے کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے قدامت پرست طبقہ کو اختلاف تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس کے اعتراضات کا جواب دلائل سے دیتے، انہوں نے اس کے خلاف ایک لیبل تراشا۔ سرسیدؒ نے کہا تھا کہ اقوامِ مغرب کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے فطرت کی قوتوں کو سخر

سریڈ کے خلاف لیبل کیا ہے اور ان سے قسم قسم کے کام لے رہے ہیں۔ ہم بھی جب تک "نیچرل سائنس" کی تعلیم حاصل نہیں کرتے، مصداق

زندگی میں ان اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان حضرات نے "نیچر" (NATURE) کا لفظ پکڑ لیا اور مشہور کر دیا کہ "سریڈ" "نیچری" ہے، اور پھر "نیچری" کو وہ معنی پہنائے کہ یہ لیبل، دہریہ، ملحد، بے دین کے مرادف ہو گیا۔ سریڈ جو بات بھی کہتا، اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا کہ یہ شخص نیچری ہے اس لئے کوئی شخص اس کی بات نہ سنے، ورنہ وہ بھی نیچری ہو جائے گا۔ اور کوئی شخص اتنا بھی نہ پوچھتا کہ صاحب! نیچری کہتے کسے ہیں اور اس میں دہرائی کیا ہوتی ہے۔ یہ ہوتی ہے لیبل تراشی کی ٹیکنک۔ اس سلسلہ میں آپ نے وہ مشہور حکایت بھی سنی ہوگی کہ سرحد کے ایک گاؤں میں بنیا (ہندو) رہتا تھا گاؤں کا ملا کسی بات پر اس سے خفا ہوا تو مسجد میں جا کر اعلان کر دیا کہ لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے گاؤں کا بنیا وہابی ہو گیا ہے۔ یہ سن کر گاؤں کے لوگ، اس "وہابی" کے خلاف اُمنڈ پڑے اور جب تک اس نے ملا سے جا کر معافی نہیں مانگی (یعنی یہ نہیں کہا کہ وہ وہابی نہیں، ہندو ہے) اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ ہوتی ہے لیبل تراشی!

نظر یہ تقدیر کے مؤیدین نے بھی اپنے مخالفین کے خلاف اسی قسم کے لیبل تراش لئے تھے کہیں انہیں معتزلہ کہا گیا، کہیں قادیانیہ کہہ کر پکارا گیا، پھر قدریہ کے متعلق اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

الْقَدَرِيَّةُ فُجُوسٌ هَذِهِ الْأُمَّةُ
قدریہ، اس اُمت کے فوجوس ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جس شخص (یا فقیہ) کو مجوس قرار دے دیا جائے اس کے مرتد، فلہذا واجب القتل ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے (بادنی تدبیر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ روایت وضعی ہے اور محض پراپیگنڈہ کی تخلیق۔ اس لئے کہ عہد رسالت مآبؐ میں نہ جبر و قدر کی بحثیں چھڑی تھیں اور نہ ہی اُس وقت اُمت میں کسی فتنہ کا وجود تھا۔ لیکن پراپیگنڈہ سے متاثر فضا میں ان باتوں پر غور کون کرتا ہے؟)۔ بہر حال، تقدیر کا قرآنی نظریہ پیش کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر نہ صرف یہ کہ انہیں حوالہ دار و رسن کیا گیا بلکہ ستم بالائے ستم کہ ان کی تصانیف کو ڈھونڈ کر نذرِ آتش کر دیا

گیا، اور اس طرح انسانیت اس قدر گراں بہا علمی متاع محروم ہو گئی۔ معتزلہ (یا قدریہ) تو نوں ختم ہو گئے، لیکن اس کے بعد یہ روش عام ہو گئی کہ یوں ہی کسی نے عقل و فکر کے مطابق کوئی بات کی، بارگاہ پیشوائیت سے اس پر اعتراض نہ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ یوں، اُمت میں فکر کی سمعیں گل ہوتی اور عقل کے چراغ بجھتے چلے گئے۔ چنانچہ سرسید کو بھی معتزلہ قرار دیا گیا تھا اور اقسام الحدود کے خلاف ایک ہزار "علمائے کرام" نے جو کفر کا فتوے صادر فرمایا تھا، اس میں بھی جرم ہی تھی کہ اس شخص کے خیالات میں اعتزال کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ کچھ سمجھ بوجھ کی باتیں کرتا ہے، ظاہر ہے کہ پیشوائیت کی عدالت میں اس سے بڑا جرم اور کون سا ہو سکتا ہے؟ بہر حال، یہ نفا نظریہ تقدیر کے خلاف آواز اٹھانے کا نتیجہ۔ اس بحث و نظر کے سلسلہ میں عقیدہ جبر کے مؤدین کی طرف سے قرآن کریم کی اس قسم کی آیات بھی پیش کی گئیں جن میں (مثلاً) یہ کہا گیا ہے کہ یُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ۔ اور جس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ یا يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ۔ وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے۔ آئندہ ابواب میں ہم اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ واضح رہے کہ اگر عقیدہ جبر کے مؤدین کی طرف سے یہ آیات نہ بھی پیش کی جاتیں، تو بھی ہمارے لئے ضروری تھا کہ ان کا صحیح مفہوم سامنے لایا جائے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر مسئلہ تقدیر کا حلقہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم ان آیات قرآنی تک پہنچیں، فہم قرآن کے سلسلہ میں دو ایک اصولی باتیں

فہم قرآن کے سلسلہ میں بنیادی اصول تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآن کریم نے اپنے مخاطبین

ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا ہے کہ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ - وَ تَوَكَّأَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ تَوَكَّدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲)۔ کیا

یہ لوگ قرآن میں تدبیر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلافات پاتے۔ لہذا پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ سارے قرآن میں متضاد باتیں کہیں نہیں ملیں گی۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ہو گا کہ ایک جگہ تو وہ یہ کہہ دے کہ جس کا جی چاہے سیدھی راہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے گمراہ ہو جائے۔ اور دوسری جگہ کہہ دے کہ تم اپنی مرضی سے کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے ہم جسے چاہیں صحیح راستے پر لگا دیں اور جسے چاہیں گمراہ کر دیں۔

دوسری بات یہ کہ اگر قرآن کریم میں ایسی آیات ملیں جن میں بادی النظر میں تضاد دکھائی دیتا ہو تو نہ تو انہیں سطحی نظر سے دیکھنا چاہیئے اور نہ ہی آنکھیں بند کر کے ان سے آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ قرآن نے اس مقصد کے لئے تدبیر کو شرط قرار دیا ہے۔ ان آیات پر تدبیر و تفکر سے ان کا حقیقی مفہوم سامنے آ جاتا ہے اور تضاد باقی نہیں رہتا۔

تدبیر فی القرآن کے سلسلہ میں دو اہم نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن کی کسی ایک آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مضمون کی جتنی آیات قرآن میں جا بجا بکھری ہوئی ہوں ان سب کو سامنے رکھا جائے۔ اس طرح قرآن کا صحیح مفہوم نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ”تصریف آیات“ سے اپنا مفہوم واضح کرتا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے۔ قرآن فہمی کے لئے یہ شرط لاینفک ہے۔

اور دوسرا نکتہ یہ کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم صحیح نہیں سمجھا جا سکتا جو اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہو۔ مثلاً قرآن کی مجموعی تعلیم یہ ہے کہ خدا واحد لا شریک ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کو اَخْلَاق کہا گیا ہے (تخلیق کرنے والا)۔ اور دوسری جگہ اَحْسَنُ الْخَالِقِینَ کہا گیا ہے، یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حسین اور متوازن تخلیق کرنے والا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن، خدا کے علاوہ اور بھی خالق تسلیم کرتا ہے، جیسی تو اس نے اُسے خَالِقِینَ میں کا احسن قرار دیا ہے۔ اس سے (نظر بظاہر) شرک کا پہلو متبادر ہوتا ہے۔ یہ تضاد، قرآن کریم کی دیگر آیات کو سامنے لانے سے رفع ہو جاتا ہے۔ اس نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یَا بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ یعنی وہ ایسا خالق ہے جو کائنات کو عدم (NOTHINGNESS) سے وجود (EXISTENCE) میں لایا ہے۔ ایسا کوئی اور نہیں

کر سکتا۔ لہذا، خدا کے خالق ہونے اور انسان کے خالق ہونے میں فرق یہ ہے کہ خدا، اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور انسان صرف اتنا کر سکتا ہے کہ جو سالہ موجود ہے اس سے مختلف قسم کی چیزیں تخلیق کر لے۔ اس سے، نہ تو شرک کا شائبہ باقی رہا اور نہ ہی ان دو آیات میں کوئی تضاد پیدا ہوا۔

یہ ہے قرآن فہمی کا صحیح طریق۔ اس کے مطابق ہم آئندہ ابواب میں ان آیات کو سامنے لائیں گے جن کو عرف عامہ میں آیاتِ مشیت کہا جاتا ہے۔ یعنی مَا يَشَاءُ۔ مَنْ يَشَاءُ۔ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ کے قبیل کی آیات۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعْتَب۔

لیکن اس سلسلہ میں بھی ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ان آیات کے متعلق، آئندہ صفحات میں، آپ کے سامنے اس قسم کے الفاظ اکثر آئیں گے کہ ”اس آیت کا عام طور پر مفہوم یہ لیا جاتا ہے“ یا ”اس آیت کا مروجہ ترجمہ یہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا مفہوم یوں ہے“ ”عام مفہوم“ یا ”مروجہ ترجمہ“ سے مراد یہ نہیں کہ عوام الناس میں ایسا مشہور ہے۔ یہ مفاہیم ہماری کتب تفاسیر میں دیئے گئے ہیں جو علماء کی ٹکھی ہوئی ہیں اور قرآن کریم کے ترجمے بھی جہلا کے کئے ہوئے نہیں۔ اس مقام پر پھر یہ سوال آپ کے دل میں پیدا ہو گا کہ مفسرین کرام نے ان کا ایسا مفہوم کیوں بیان کیا اور ان کا ایسا ترجمہ کس طرح کر دیا گیا۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے۔ جس طرح ہماری پہلی تاریخ امام طبری نے قریب چوتھی صدی ہجری میں مرتب کی، اسی طرح انہی (امام طبری) نے

ہماری سب سے پہلی مبسوط تفسیر القرآن بھی لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے **قرآن کریم کی تفسیریں** ہر آیت کی تشریح میں روایات نقل کر دیں اور اس طرح یہ خیال قائم کر دیا کہ

وہ تشریح ان کی اپنی یا کسی اور عالم کی نہیں بلکہ وہ خود ذاتِ رسالت کی بیان فرمودہ تفسیر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس تفسیر کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ ارشادِ رسول اللہ ہے، کون مسلمان اس سے انکار کر سکتا، یا یہ کہنے کی مجال اور جرأت کر سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) وہ تفسیر صحیح نہیں، میری بیان کردہ تفسیر صحیح ہے چنانچہ اس کے بعد آج تک جتنی تفاسیر لکھی گئیں، ان کی بنیاد امام طبری کی تفسیر پر ہے۔ اگر کسی نے اس سے اختلاف کیا ہے تو صرف اس حد تک کہ امام طبری کی بیان کردہ فلاں روایت کمزور ہے۔ اس کی جگہ یہ روایت صحیح ہے، یعنی تفسیر پھر روایات ہی کی بنیاد پر کی گئی۔ اس کے بعد جب تراجم کی باری آئی، تو ظاہر ہے کہ اس بات کا التزام کیا گیا کہ ترجمہ کے الفاظ اس تفسیر سے مختلف نہ ہوں جو روایات کی رو سے متواتر چلی آ رہی ہے۔

روایات کے ساتھ یہ عقیدہ بھی ہمارے ہاں متواتر چلا آ رہا ہے کہ اسلاف کی روش سے ذرا سا اختلاف

بھی سخت گناہ کا موجب ہے۔ اگر روایات کے متعلق یہ سمجھا جاتا کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر حضور نبی اکرم کے ارشادات نہیں بلکہ آپ کی طرف منسوب کردہ اقوال افعال میں اور اسلاف بھی بہر حال ہماری طرح کے انسان تھے، تو علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے، قرآنی آیات کا ان تفاسیر سے جداگانہ مفہوم لیا جاسکتا تھا۔ ایسا نہ سمجھے جانے کا نتیجہ تھا کہ قرآن فہمی جلد ہو کر رہ گئی۔ اگر قرآن کریم کا مفہوم خود قرآن سے متعین کیا جاتا اور اسے اپنے اپنے زمانے تک کے علم انسانی کی روشنی میں سمجھا جاتا تو قرآنی تفاسیر کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ میں نے قرآن کریم کو اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی آیات کا مفہوم اسی طرح متعین کیا ہے باقی رہا ترجمہ، سو جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں واضح کیا جا چکا ہے، قرآن کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ قرآنی الفاظ کے مرادفات کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔ اس لئے قرآن کریم کا مفہوم تو بیان کیا جاسکتا ہے، ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمہ کے الفاظ سے اس کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ وجہ ہے کہ میں نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کی بجائے اس کا مفہوم ہی مرتب کیا ہے یہی مفہوم آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا اور اس کی سند خود قرآنی آیات ہوں گی۔



دسواں باب

قانونِ مشیت

عربی زبان میں ایک مادہ (ROOT) ہے — ش۔ ح۔ ع۔ — اس سے شَاءَ۔ يَشَاءُ۔ شَيْئًا — مَشِيئَةً جیسے الفاظ بنے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ ”چاہنا“ کیا جاتا ہے۔ یہی ترجمہ یایوں کیلئے کہ ”مشیت“ کا غیر واضح مفہوم ہے جو مسئلہ تقدیر کے ضمن میں بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن گیا ہے۔ اس لئے اسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

مشیت کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ بعض متکلمین نے ارادہ اور مشیت میں کوئی فرق نہیں کہا

لیکن لغت کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق ہے۔

ارادہ اور مشیت میں فرق | ارادہ تو فقط کسی بات کے چاہنے کو کہتے ہیں اور جب اس

ارادہ کے مطابق وہ بات وجود میں آجائے تو اسے مشیت کہا جاتا ہے۔ اس لئے شئی کسی

ارادہ کی وجود پذیر شکل کا نام ہے۔ جب ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے تو ارادہ اور مشیت

کے اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اگرچہ عام استعمال میں دونوں کے معنی ”چاہنے“ کے لئے

جائے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ اِنَّمَا اَمْرٌ اِذَا اَمَرَ اَدَّ شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهُ

كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۳۶/۸۲)۔ خدا کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے

کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے یہاں سے واضح ہے کہ جب ارادہ خداوندی، فَيَكُونُ (وجود میں

آجانے) کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اسے مشیت کہا جاتا ہے۔

دوسرے باب میں بالتفصیل بتایا جا چکا ہے کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کے دو حصے ہیں۔ ایک

عالمِ امسرا اور دوسرا عالمِ خلق۔ عالمِ امسرا کے سلسلہ میں، میں نے اپنی کتاب: لغات القرآن میں لکھا ہے۔

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ایسا ضرور آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور وہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک معلول (EFFECT) بغیر کسی سابقہ علت (CAUSE) کے ظہور میں آ گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے کائنات کا سلسلہ خدا کی مرضی، منشاء، ارادہ اور اس کی پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنانا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا۔ اس مقام پر مشیتِ خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی۔

(مادہ۔ ش۔ ص۔ ۱ صفحہ ۹۸۸)

یہ خدا کا عالمِ امسرا ہے، جہاں ہر شے اس کی اسکیم کے مطابق وجود میں آئی ہے۔ یعنی اس کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے لئے قوانین مقرر ہوتے ہیں۔ یہ سب خدا کے اقتدارِ مطلق کی رُو سے ہوتا ہے۔ یہی قوانین، عالمِ خلق میں کار فرما ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ پانی شیب کی طرف کیوں بہتا ہے، آگ حرارت کیوں پہنچاتی ہے، سکھیا مہلک کیوں ہے، تو اس کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکے گا کہ ”خدا کی مشیت“ ہی ایسی تھی۔ یعنی یہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو مشیتِ خداوندی کی رُو سے، عالمِ امسرا میں، مقرر ہوئے تھے۔ طبعی کائنات میں جو قوانین فطرت کار فرما ہیں، قرآنی نقطہ نگاہ سے وہ بھی قوانینِ مشیت ہیں اور انسانی زندگی سے متعلق جو قوانین بذریعہ وحی عطا ہوئے ہیں، انہیں بھی قوانینِ مشیت کہا جائے گا۔ یعنی یہ حقیقت کہ انسانی جسم کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ کھاتا پیتا ہے، قانونِ مشیت ہے اور یہ بات کہ انسانی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیتا ہے، یہ بھی قانونِ مشیت ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں خدا کے متعلق شَاءَ - یَشَاءُ - جیسے الفاظ آئیں، ان کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ ”خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے“ ان کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے کہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ترجمہ کے اتنے سے فرق سے، قرآن کریم کے وہ مقامات کس طرح واضح ہو جاتے ہیں جو پہلے ترجمہ کی رُو سے، وجہ ہزار پریشانی بنے رہتے ہیں اور جنہیں سلجھانے کے لئے ہزار قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ان کے باوجود یہ مقامات سلجھنے کے بجائے اور اُبھرتے چلے جاتے ہیں۔ طبعی کائنات میں یہ قوانین، علوم سائنس کی رُو سے سمجھ میں آئیں گے اور انسانی دنیا میں، قرآن کریم میں غور و تدبر سے، زیرِ نظر باب میں انہی مقامات کو سامنے لایا جائیگا۔

(۱) لَوْ شَاءَ اللّٰهُ

قرآن کریم میں یہ ترکیب، متعدد مقامات میں آئی ہے۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو.....“ اس کا صحیح ترجمہ یوں کرنا چاہیئے کہ ”اگر اللہ اس قسم کا قانون مشیت مقرر کر دیتا تو ایسا ہو جاتا۔“ مثلاً اگر کہا جائے کہ نمک، نمکین کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ نمک نمکین ہو۔ اگر اس کا قانون مشیت یہ ہوتا کہ نمک میٹھا ہو، تو نمک میٹھا ہو جاتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ۔۔۔ اگر خدا چاہے تو اب بھی نمک، میٹھا ہو سکتا ہے یا نہیں، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر وہ چاہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ ایسا چاہے گا نہیں، کیونکہ اس نے قوانین مشیت مقرر کر دینے کے بعد خود ہی کہہ دیا ہے کہ وہ ان قوانین میں

لَوْ كَا مَفْهُوم تبدیلی نہیں کرے گا۔ (تفصیل ان امور کی پہلے گزر چکی ہے)۔ اس ترکیب (لَوْ شَاءَ)

میں (عربی زبان کی رُو سے) لَوْ کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ سیوطی نے اتقان میں کہا ہے کہ

ابن ابی حاتم نے ضحاک کے طریق پر ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ

قرآن شریف میں جس جگہ بھی نوآیا ہے اس کے معنی ہیں کہ یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔

(آفاق حصہ اول - چالیسویں نوع)

قرآنی مثالیں | امام ابن حزم نے بھی السمل و النحل میں یہی کہا ہے اور پھر اس کی بڑی تفصیلی تشریح کی ہے۔ قرآن کریم میں اس کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) اشیائے کائنات (یعنی انسان کو چھوڑ کر باقی تمام مخلوق، جمادات، نباتات، حیوانات، وغیرہ) کے متعلق خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ جس روش پر چلنے کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے، وہ اس پر از خود چلی جاتی ہیں۔ انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ جس کا جی چاہے اس روش پر چلے اور جس کا جی چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کر لے۔ یہ ہدایت (کہ کس نوع کو کس روش کے مطابق چلنا ہے) ہر نوع کے ہر فرد کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اسے جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں اور قرآن کریم نے اسے 'ان چیزوں کی طرف' "وحی" سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو ان چیزوں کی فطرت کہا جاتا ہے۔ پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ بکری کی یہ فطرت ہے کہ وہ گھاس کھائے، گوشت نہ کھائے۔ شیر فطرۃً گوشت خور ہے۔ وہ گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔

اس اصول کے مطابق، تمام دنیا کی بکریوں کی ایک ہی فطرت ہے۔ تمام شیروں کی ایک ہی روش ہے۔ بالف لظہر، ان میں سے ہر نوع، امت واحدہ ہے۔ ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔

ان کے برعکس، انسان ہے کہ اس کی نہ کوئی فطرت ہے جس کے مطابق چلنے کے لئے اسے مجبور پیدا کیا گیا ہو اور اس لئے نہ ہی نوع انسانی کے ہر فرد (ہر انسانی بچے) کے اندر از خود

لے انسانی فطرت (HUMAN NATURE) کا تصور، اس قدر عالمگیر ہونے کے باوجود، یکسر خلاف واقعہ اور خلاف قرآن ہے۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے، صاحب اختیار کی نہیں۔ خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی فطرت انسانی کا تصور عام ہے۔ بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور اسلام دین فطرت ہے۔ یہ تصورات قرآن کے خلاف ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے لغات القرآن عنوان (ف۔ ط۔ م)۔

کوئی ہدایت موجود ہے۔ انسان کو یہ ہدایت خارج سے (ہدایہ دہی) ملتی ہے اور اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے اس ہدایت کے مطابق چلے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر کے دوسری روش اختیار کر لے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام نوع انسان از خود "اُمت واحدہ" نہیں ہے۔ ان میں اختلافات ہیں۔ کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی نیک ہے کوئی بد، کوئی آج بد ہے کل نیک ہو سکتا ہے۔

دنیا میں شر اور فساد، ظلم و استبداد، کو عام دیکھ کر سطح میں لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے ایسا کیوں نہ کیا کہ سب تمام انسانوں کو نیک ہی کیوں نہ پیدا کر دیا گیا۔ انسان نیک ہی ہوتے۔ کوئی برائی کر ہی نہ سکتا۔ اس نے ہر ایک کو مومن ہی کہوں نہ بنا دیا۔ خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ ساری نوع انسان کو اُمت واحدہ ایک روش پر چلنے والے بنا دیتا تاکہ نہ ان میں باہمی اختلافات ہوتے، نہ جھگڑا اور فساد برپا ہوتا۔

قرآن نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہوتا تو وہ انسان کو بھی دوسری مخلوقات کی طرح مجبور پیدا کر دیتا اور اس طرح پوری نوع انسان (بھیدوں، بکریوں کی طرح) اُمت واحدہ ہوتی۔ ان میں کوئی اختلاف ہوتا ہی نہ۔ لیکن اس کی مشیت ایسی نہیں تھی۔ اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اب کوئی ایسا طریق، انداز یا نظام جس سے اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر کے اسے کسی خاص روش پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا جائے، خلاف قانون مشیت ہوگا۔ نہ تو اب خدا ہی ایسا کرے گا اور نہ ہی کسی انسان کو ایسا کرنا چاہیے۔ حضور نبی اکرمؐ ایک طبیب مشفق کی طرح بدل و جان چاہتے تھے کہ لوگ، غلط روش چھوڑ کر، صحیح راستہ اختیار کر لیں اور اس طرح ہلاکت سے بچ جائیں۔ قلب نبویؐ کی ہی شدتِ آرزو تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، خدا نے کہا کہ لَعَلَّكَ بَارِئٌ نَفْسًا ۖ اَلَّا يَكُوْنُ فِیْ مُؤْمِنِيْنَ ۝۲۶ (۲۶/۳)۔ تم اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے، اپنی جان گھلا لو گے! (نیز ۱۸/۶)۔

اب دیکھئے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے قرآن کریم اسے کس انداز میں پیش کرتا ہے۔ سورہ یونس میں ہے۔ وَ کُوْنْ شَاۡءَ رَبُّکَ لَاۤ اَمِّنْ مِّنْ فِی الْاَوْنٰیضِ کُلُّہُمْ جَمِیْعًا۔ اگر مشیت خداوندی

میں ایسا ہوتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسا کر دیتا کہ وہ سب ایمان لے آتے۔ وہ، انہیں بھی، دیگر شیئاً کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیتا لیکن اس کی مشیت ایسی نہیں تھی۔ اس نے انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا۔ اَفَاَنْتَ تُكْفِرُكَ النَّاسُ حَتَّىٰ يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۹۹)۔ تو اسے رسول! کیا تو لوگوں کو جبراً مسلمان کرنا چاہتا ہے؟ یہ تو خدا کے قانون مشیت کے خلاف ہوگا۔ انسان کو جبراً مومن بنانا مقصود مشیت ہوتا تو ہر انسانی بچے کی فطرت میں یہ راہ نمائی رکھ دی جاتی اور اس طرح وہ دیگر حیوانات کی طرح، اپنے جبلی تقاضوں کے ماتحت ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتے۔ وَ يَشْعُنَا لِذٰلِكَ نَا كُلَّ نَفْسٍ هٰذَا هٰذَا..... (۳۲/۱۳)۔ اگر ہماری مشیت کا تقاضا ہوتا کہ تمام انسان مجبوراً ایک ہی راہ پر چلیں تو ہم ان کے اندر ایسی جبلت رکھ دیتے۔ لیکن ہمارا قانون مشیت یہ نہیں۔ انسانوں کے لئے قانون یہ ہے کہ ہم نے رسول کی وساطت سے انہیں بتا دیا ہے کہ ان کے لئے صحیح راستہ کون سا ہے اور اس کے بعد کہہ دیا کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ مِّنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی اور اس بات کی ہر رکھ کہ وہ اپنے اختیارِ ارادہ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں (۲۸ - ۵/۲۹)۔ وہ اپنے اختیارِ ارادہ سے صحیح راہ کا انتخاب کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ہم فکر و ہم عمل ہو جائیں۔ اس طرح ان کے اختلافات مٹ سکیں گے۔ انہیں جبراً نہیں مٹایا جائے گا۔ (۱۱۸ - ۱۱/۱۱۹)۔ ایسی صورت میں (یعنی اگر انسان کو مجبور، پیدا کیا جاتا تو) نہ کوئی کافر ہوتا نہ مشرک (۶/۱۰۸؛ ۶/۱۳۸) لیکن پھر انسان، انسان نہ رہتے، پتھر کی چٹائی یا حیوانات کا گلہ بن کر رہ جاتے۔

پیدائشی طور پر صاحبِ اختیار و ارادہ، انسان سے، کسی بات کو جبراً منوانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے سر پر تلوار رکھ دی جائے۔ اور دوسرا طریقہ (جو پہلے طریقہ سے کہیں زیادہ مؤثر اور کامیاب ہے)، یہ کہ کسی طرح اس کے اختیار و ارادہ کی قوت کو سلب کر دیا جائے۔ نشتہ ہلا کر — کلوروفارم سنگھا کر، یا (اب) ہیناٹرم کے ذریعہ مسح کر کے۔ مسلکِ خانقاہیت میں یہ مقصد کرامات دکھا کر حاصل کیا جاتا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت، یہ روش ساری دنیا میں عام تھی۔ اس کے پیشِ نظر کفارِ عرب، حضورؐ سے بار بار فرمائشیں اور تقاضا کرتے تھے کہ وہ کوئی فوقِ الفطرت کام کر کے دکھائیں۔ عام اصطلاح میں

معجزہ کا مطالبہ | اُسے معجزہ کا کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ آپ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس کے جواب میں خدا اپنے رسول سے کہتا تھا کہ ان سے کہو کہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے انسانوں کی طرح غلط اور صحیح کے متعلق خود فیصلہ کرو اور تم چاہتے ہو کہ معجزات دکھا کر تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر دیا جائے اور اس طرح تم سے جبراً بات منوالی جائے۔ اگر تم سے جبراً ہی بات منوانی ہوتی تو تمہیں اختیار کی استعداد کیوں دی جاتی۔ یہ خدا کے شایان شان نہیں کہ تمہیں اختیار کی صلاحیت دے کر اسے پھر سلب کر لے۔ (اقبال کے الفاظ میں)۔

جانے کہ بخشنہ دیگر نہ گیرند
آدم ہمیں د، از بے یقینی

سورہ یونس کی مذکورہ صدر آیت میں، جہاں رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ کیا تو چاہتا ہے کہ انہیں مجبوراً مومن بنا دیا جائے، تو اس سے کفار کے اسی مطالبہ کی طرف اشارہ ہے۔ سورہ انعام میں ہے۔
وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ - یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا اپنے رسول کو کوئی معجزہ کیوں نہیں دیتا۔ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنْزِلَ آيَةً وَلَٰكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ | **اس کا جواب**
(۶/۳۷)۔ ان سے کہو کہ معجزات کا رونا کر دینا خدا کے لئے ناممکن نہیں۔ لیکن انہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر صحیح اور غلط فیصلہ کرو۔ وہ تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے حقیقت منوانا نہیں چاہتا۔ اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے کہہ دیا گیا کہ ”اگر تم ایسا کر سکو کہ زمین میں کوئی سرنگ لگا کر (پاتاں تک جا پہنچو)۔ یا آسمان میں سیڑھی لگا کر عالم بالا تک پہنچ جاؤ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے ان کی تسلی ہو جائے تو یہ اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ یہ لوگ اس طرح مبہوت ہو کر تمہارے سامنے سپردالیں“

لہ قرآن کریم کی جن آیات کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان میں انبیائے سابقہ کے معجزات کا ذکر آیا ہے ان کے صحیح مفہوم کے لئے ”مفہوم القرآن“ (از مصنف) کے متعلقہ مقامات دیکھئے۔

لیکن اُسے ایمان تو نہیں کہا جائے گا۔ ایمان تو، دل اور دماغ کی کامل رضا مندی اور اطمینان کے بعد صداقت تسلیم کرنے کو کہتے ہیں۔ جبراً مسلمان ہو جانے سے (خواہ اس جبر کی نوعیت کیسی ہی ہو) کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ لہذا، تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ، جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو بنک اور مومن کیوں نہ بنا دیا۔ (۱۶/۳۵۱) ایمان اسی کا ہو گا جو بات کو دل کے کانوں سے سنکر اس پر لبیک کہے گا۔ (۶/۳۶)۔

دوسری جگہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے جو معجزات کا مطالبہ ہوتا ہے (۱۳/۲۷۱) تو اس سے خود ہماری جماعت کے بعض افراد کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو یہ ایمان لے آئیں اور یہ بہت اچھا ہو۔ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگ جاتے اور زمین کی دور دراز کی مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ اس مردے بھی بولنے لگ جاتے، تو بھی یہ لوگ مومن نہ بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے تمام امور کو اپنے قوانین کے تابع رکھا ہے۔ (۱۳/۳۱۱)۔ اور اس باب میں اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل فکری سے کام نہیں لیتے ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔ (۱۰/۱۰۰) اس کے بعد کہا کہ کیا اب بھی ہماری جماعت کے لوگ اس بات کو نہیں سمجھے کہ اَنْ تَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَهْدٰى النَّاسَ جَمِيعًا (۱۳/۳۱)۔ اگر خدا کی مشیت کا تقاضا ہوتا تو اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ وہ سب راہِ راست پر چلتے۔

(۲) دنیا میں جنگ و جدال اور قتل و غارت دیکھ کر بھی اکثر لوگوں کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے

یہ قتل و غارت گری کیوں؟ کہ خدا ایسا کیوں نہیں کرتا کہ لوگ باہمی خونریزیاں نہ کریں (فقہ آدم کے مثیلی انداز میں، ملائکہ نے جو اعتراض کیا تھا کہ ہیں

اس کے پیکر میں خونریزیوں اور فساد انیگزریوں کی چنگاریاں نظر آتی ہیں، تو اس سے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ اس کے جواب میں سورہ بقرہ میں ہے، کہ ہم نے انبیاء کی دسالت سے جو راہ نمائی بھیجی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ لوگ باہمی جنگ و قتال نہ کریں۔ لیکن انبیاء کے چلے جانے کے بعد ان کے نام لیوا پھر آپس میں لڑائی جھگڑے شروع کر دیتے۔ وَ تَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ مَا اقْتُلْنَ (۲/۲۵۳)۔ اگر مقصود مشیت یہ ہوتا کہ انسانوں میں اختلاف اور قتال کو جبراً روک دیا جائے،

تو خدا انہیں پیدا ہی مجبور کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انہیں صاحب اختیار پیدا کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَ مِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۝ (۲/۲۵۳)۔ ان میں کچھ لوگ ایمان لے آتے ہیں، کچھ انکار کر دیتے ہیں۔

لَوْ شَاءَ اللَّهُ کا جو مطلب ہمارے ہاں عام طور پر لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کو منظور ہی ایسا ہے کہ دنیا میں یہ خرابیاں رہیں۔ اگر اسے ایسا منظور نہ ہوتا تو کس کی مجال تھی کہ دنیا میں فتنہ و فساد برپا کر سکتا اور جب خدا کو منظور ہی ایسا ہے تو پھر کسی کو فتنہ و فساد پر مطعون کرنا، اور یہ کوشش کرنا کہ ایسا نہ ہو، خلافِ منشاءِ خداوندی ہے۔ شاید آپ کہیں کہ آجکل تو کوئی ایسا نہیں کہتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب عقل و بصیرت کی روشنی کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ ایسا نہیں کہتے، لیکن اگر آپ تققیر سے متعلق اپنے ہاں کے اسلاف کا لٹریچر اٹھا کر دیکھیں، بالخصوص مدعیانِ تصوف کا، تو اس میں آپ کو بھی خیالات ملیں گے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت مشرکین اور کفار لَوْ شَاءَ اللَّهُ سے ہی مراد لیتے تھے۔ سورۃ انعام میں ہے کہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا..... (۶/۱۳۹)۔ اگر اللہ کو ایسا منظور نہ ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے۔ (نیز ۱۶/۳۵) (۴۳/۲۰)۔ سورۃ یٰسین میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھوکوں اور ناداروں کی مدد کرو تو کفار یہ کہتے ہیں کہ أَنْطَعِمُهُمْ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ (۳۶/۲۷)۔ کیا ہم ان لوگوں کی روٹی کا انتظام کریں؟ جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اُسے انہیں بھوکا رکھنا منظور نہ ہوتا تو وہ انہیں امیر کیوں نہ بنا دیتا۔ اس نے جو انہیں غریب رکھا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ انہیں روٹی دینا ہی نہیں چاہتا۔ اگر ہم انہیں روٹی دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خدا کی مشیت سے جنگ کریں!

قرآن نے یہ ذہنیت مشرکین اور کفار کی بتائی ہے اور اسے سخت جہالت اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔ لَوْ شَاءَ اللَّهُ کا قرآنی مفہوم وہی ہے جسے پہلے بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ

ہمارے ہاں مَا شَاءَ اللّٰهُ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔۔۔ جو اللہ چاہے گا۔۔۔ اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہم جو جی میں آئے کر لیں، ہو گا وہی جو خدا چاہے گا۔ یعنی جو خدا کو منظور ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم، تقدیر کے اس تصور سے پیدا ہوتا ہے جس کی رو سے انسان کو مجبور قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے (تقدیر کا یہ تصور خلافِ قرآن ہے، اس لئے مَا شَاءَ اللّٰهُ کا مذکورہ صدر مفہوم بھی صحیح نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ جو شخص ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ اس کا خمیازہ بھگتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَ لَا يُجِزُّونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (۲/۲۵۵)۔ انسان علمِ خداوندی میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا، بجز اس طریق کے، اور اسی حد تک، جو اس کے قانونِ مشیت نے مقرر کر رکھا ہے۔ یعنی عقل و بصیرت کی رو سے یا وحی کے ذریعے یہی دونوں طریق ہیں جو قانونِ مشیت نے حصولِ علم کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان کے ذریعے بھی انسان کو علمِ خداوندی کے مقابلہ میں، محدود علم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآنی مثالیں

(۲) سورۃ کہف میں، دو باغ والوں کا قصہ مثیلاً بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ایک، صحیح نگاہ رکھتا تھا اور دوسرے کے متعلق کہا ہے وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ (۱۸/۳۵)۔ وہ اپنے آپ پر ظلم دہا دیتی کرتا تھا۔ وہ خدا کا بھی منکر تھا اور اس کے قانونِ مکافات کا بھی۔ قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار (یعنی اس حقیقت سے انکار کہ انسان جو کچھ ہوتا ہے وہی کچھ کاٹتا ہے) کا نتیجہ یہ ہوا کہ (اس نے کھیتی کی طرف سے غفلت برتی اور) وہ تباہ ہو گئی۔ اس پر اس کے ساتھی نے (جو ان امور پر ایمان رکھتا تھا) اس سے کہا کہ تجھے چاہیئے تھا کہ اپنی کھیتی اور باغات کو دیکھ کر ہمیشہ یہ کہتا کہ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ (۱۸/۳۹)۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی میں ایسی قوت و اقتدار نہیں کہ انہیں پیدا کر سکے اور پروان

چڑھا سکے۔

(۳) ”نخی و شس“ کے عنوان میں، نفع اور نقصان کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق عمل کرنے سے نفع ہوتا ہے، اس کی خلاف ورزی سے نقصان۔

سورہ یونس میں ہے کہ اے رسول! یہ مخالفین تجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ اگر ہم غلط روش پر چلتے رہے تو ہماری تباہی آجائے گی، تو ہمیں بتاؤ کہ وہ تباہی کب آئے گی۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے کہو کہ تم مجھ سے اس طرح پوچھتے ہو،

نفع اور نقصان | گویا اس انقلاب کا لانا میرے اپنے اختیار میں ہے، لہذا میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کب آئے گا۔ یہاں سب کچھ خدا کے قانون مشیت کی رُو سے ہوتا ہے۔ وہ انقلاب تو ایک طرف لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (۱۰/۴۹) میں تو خود اپنی ذات کے لئے بھی، خدا کے قانون مشیت کے خلاف، نفع نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی مرضی سے اپنے لئے سکھیا کو ممد حیات بناؤں یا پانی میں زہر کی خاصیت پیدا کروں۔ یا ایسا کر سکوں کہ میرے کھیت میں گندم، دو ماہ کے بعد فصل دے دے اور فربق مخالف کے کھیت میں سال بھر کے بعد۔ یہاں ہر بات کے لئے ایک قانون ہدایت مقرر ہے۔ بِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ۔ اِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ (۱۰/۴۹) جب ہدایت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ایک ثانیہ کی بھی دیر سویر نہیں ہوتی۔ لہذا، یہ انقلاب بھی اسی قانون ہدایت کے مطابق واقع ہوگا۔

یہاں سے لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ کا مفہوم واضح

ہو گیا۔

قوموں کی موت و حیات کے اس قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورہ الرعد میں کہا

گیا کہ بِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ كِتَابٌ۔ ہر ميعاد کے لئے ایک قانون

مہلت کا قانون | مقرر ہے۔ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُمْسِكُ مَا يَشَاءُ۔ جسے ثابت و مستحکم رہنا ہوتا ہے، وہ بھی اس قانون کے مطابق ثابت اور باقی رہتا ہے۔ جسے مٹنا ہوتا ہے وہ بھی

اس کے مطابق مٹا ہے۔ یہاں نہ کسی قوم کو ثبات یونہی حاصل ہو جاتا ہے، نہ ہی وہ ظلم اور دھاندلی سے مٹا دی جاتی ہے۔ یہاں بھی مَا يَشَاءُ کا مفہوم واضح ہے۔ اس کے بعد ہے وَعِنْدَكَ أُمْرٌ الْكِتَابِ (۱۳/۳۹)۔ یہ تو تم سمجھ سکتے ہو کہ قانونِ محوِ ثبات کہا ہے۔ یعنی وہ کون سے اسباب ہیں جن کے مطابق ایک قوم کو عروج حاصل ہوتا ہے اور وہ کون سی وجوہات جن کی بنا پر قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ ان وجوہ و اسباب کا تو تمہیں علم ہو سکتا ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ قوانین ایسے کیوں بنائے گئے ہیں۔ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے کیونکہ اس کا تعلق اس کے عالمِ امر سے ہے۔ قانون کی اس اصل کو أُمْرٌ الْكِتَابِ کہا گیا ہے۔ یعنی قانون کا سرچشمہ، اس کی جڑ، قانونِ مشیت، محسوس شکل میں کائنات میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی اصل، علمِ خداوندی میں ہوتی ہے۔

(۳) قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر، اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ آتا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعلیٰ میں ہے

اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ کا مفہوم | کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ (۶۱-۸۴/۷)۔ اسے رسول! ہم نے تجھے قرآن کو

اس انداز سے دیا ہے کہ تو اس میں سے کچھ بھی بھول نہیں سکتا۔ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تو اس میں سے صرف اتنا بھلا سکتا ہے جتنا خدا چاہے۔ اس سے زیادہ نہیں بھلا سکتا۔ خدا کی طرف سے حضور کو جو وحی عطا ہوئی تھی اس کا ایک حرف بھی بھلایا نہیں جاسکتا تھا۔ (۱۶/۸۶)۔ صاحب المنار مفتی محمد عبدہ (مرحوم) نے لکھا ہے کہ ”استثنا بالمشیت قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے۔ یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَاءَ اللّٰهُ وغیرہ الفاظ آئیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ ان مقامات میں اِلَّا کہنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ ان امور کا ثابوت اور دائم رہنا خدا کی مشیت کی رو سے ہے۔ اگر اس کی مشیت اس کے خلاف ہوتی تو وہ انہیں ویسا ہی بنا دیتا۔ لہذا، فَلَا تَنسَىٰ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ کے معنی یہ ہیں کہ تو اسے ہرگز ہرگز نہیں بھلا سکے گا۔“

۱۔ تفصیل ان امور کی اس باب میں ملے گی جس میں قوموں کی تقدیر کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

اسی ضمن میں، سورۃ ہود کی وہ آیات ہیں جن میں جہنم اور جنت میں خلود (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنے) کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ خَلِيدِينَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ اَلْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ (۱۱/۱۰۸ ذ ۱۱/۱۰۹ ذ ۱۱/۱۲۹ ذ ۱۱/۱۳۰ ذ)۔ وہ اس میں رہیں گے جب تک سلسلہ کائنات باقی رہے۔ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ۔ اس کے معنی (مفتی محمد عبده کی تشریح کے مطابق) یہ ہیں کہ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ان میں خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق رہیں گے۔ اس قانون کی تشریح قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں موجود ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ مَا شَاءَ اللہ کے معنی یہ نہیں کہ جیسا خدا چاہے گا ویسا ہوگا۔ اس لئے کہ انسان کے لئے تو خود خدا نے کہا ہے اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ جس طرح تمہارا جی چاہے کرو۔ خدا کی ”مشیت“ قانونِ مقرر کرنے تک تھی۔ جب اس نے غیر متبدل قوانین بنا دیئے تو اس کے بعد انسان کی ”مشیت“ کا فرما ہوگی۔ یعنی اس کا جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق کام کرے، جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کر لے۔ البتہ اس بات کو ذہن میں رکھے کہ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۱/۴۰)۔ خدا کا قانونِ مکافات دیکھتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ تمہارے کاموں کا نتیجہ اس کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوگا۔ نتیجہ کو بدل دینا تمہاری ”مشیت“ میں نہیں۔ یہ خدا کی ”مشیت“ کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔

۳۔ اِنْشَاءَ اللہ

”اِنْشَاءَ اللہ“ (جس کے معنی کئے جاتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو.....) ہمارے ہاں اس کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ یہ گویا ہمارا تمیجہ کلام بن گیا ہے۔ یہ کن معانی میں استعمال ہوتا ہے

لے خلودِ جنت و جہنم سے کیا مراد ہے، اس کے لئے دیکھئے میری کتاب ”جہانِ فردا“

اس کا اندازہ ذیل کی (تمثیلی) گفتگو سے لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دوست ! تم چار بچے پہنچ جاؤ گے ناں !

دوسرا دوست ! انشاء اللہ ۔

پہلا دوست ! بھائی معاملہ بڑا اہم ہے۔ انشاء اللہ کو چھوڑو۔ بات پچی کرو کہ

چار بچے پہنچ جاؤ گے یا نہیں۔

یعنی ہمارے ہاں اِنْشَاءُ اللہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بات یقینی نہ ہو۔ انشاء اللہ کا یہ استعمال

بظاہر عامیانہ سا نظر آتا ہے لیکن بنظر تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ مفہوم عامیانہ نہیں۔

جب عقیدہ یہ ہو کہ انسان لاکھ کوشش کرے، ہوتا دہی ہے جو خدا کو منظور ہو، تو پھر آپ کوئی بات بھی

تیقن سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ میں خود اعتمادی پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ آپ حتمی طور پر کہہ سکیں کہ

میں ایسا ضرور کروں گا۔ آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میں چار بچے پہنچ جاؤں گا۔ چونکہ

عقیدہ جسے ہمارا جزو ایمان بن چکا ہے، اس لئے اس کا (شعوری یا غیر شعوری طور پر) نتیجہ یہ ہے کہ

اگر کوئی بات یقینی طور پر (بغیر اِنْشَاءِ اللہ کے کہی جائے) تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی

گناہ کر رہے ہیں۔ پاکستان کی ہوائی جہاز کی سروس

پنی۔ آئی۔ اے کے حادثات (پی۔ آئی۔ اے) بڑی پُر وثوق اور قابلِ اعتماد شمار

کی جاتی تھی۔ اتفاق (یعنی عدم تدبیر) سے ایک دو جہازوں کو کچھ حادثات پیش آ گئے جس کی وجہ سے ملک

میں بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ ان حادثوں کے اسباب و وجوہ معلوم کرنے اور نقائص کو دُور کرنے کے

لئے تحقیقات شروع ہوئی تو ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے کہا گیا کہ ان حادثات کا حقیقی

سبب یہ ہے کہ جہاز کی پرداز کے وقت، کپتان اعلان یہ کرتا ہے کہ ہم اتنے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے

پرواز کر کے اتنے بجے فلاں مقام پر پہنچ جائیں گے۔ وہ اس کے ساتھ ”اِنْشَاءُ اللہ“ نہیں

کہتا، خدا کے ہاں اس قسم کی تعلی پسند نہیں کی جاتی۔ چنانچہ اس پر طے کیا گیا کہ جہاز کا کپتان انشاء اللہ

ضرور کہہ کرے۔

اور اس کے باوجود حادثے ہوتے رہتے ہیں !

اِنْ شَاءَ اللہ میں شَاءَ کا مفہوم ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی خدا کا قانونِ مشیت۔ باقی رہا

حرف اِنْ کے معانی | حرف اِنْ تو اس کے معنی عام طور پر ”اگر“ کہے جاتے ہیں لیکن اس کے ایک اور معنی بھی ہیں۔

جنہیں (بد قسمتی سے) ہمارے ہاں کے قرآن کریم کے تراجم میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عربی گرامر کی روش سے لیا جائے گا کہ یہ حرف تعلیل یا سبب بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یعنی جس مفہوم کے لئے ہم اردو زبان میں ”چونکہ“ استعمال کرتے ہیں عربی زبان میں اِنْ کے لئے اِنْ بھی آتا ہے۔ سیوطی نے (اتقان) میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ اِنْ کے ان معانی کی روش سے دیکھئے کہ اِنْ شَاءَ اللہ کا مفہوم کیا مرتب ہوتا ہے۔ اسے بھی ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ بھائی! مجھے جلدی جانا ہے۔ چلئے کا تکلف چھوڑو۔ اس میں بہت وقت لگ جائے گا۔ وہ دوست دیکھی چو لھے پر چڑھا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چائے میں کیا دیر لگے گی۔ آگ جل رہی ہے۔ پانی میں نے رکھ دیا ہے۔ اب دس منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ — دس منٹ میں؟ — وہ کہتا ہے کہ اِنْ شَاءَ اللہ۔ یعنی جو کچھ میں کر رہا ہوں چونکہ یہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہے

ایسا ضرور ہوگا | اس لئے اس کا نتیجہ ایسا مرتب ہو کر رہے گا۔ یا، بالفاظ دیگر، جو کچھ میں کر رہا ہوں، جب یہ قانون مشیت کے مطابق ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کا نتیجہ

ایسا نہ نکلے۔ لہذا، ایسا ہو کر رہے گا۔ اکتب لغت میں ہے اِنْ بمعنی اِذْ بھی آتا ہے۔ جس کا ترجمہ ”جب“ ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ وہی ”انشاء اللہ“ جو فقدان یقین اور عدم خود اعتمادی کے لئے بولا جاتا تھا، اب ”حتم و یقین اور کامل خود اعتمادی کا آئینہ دار ہو گیا۔ یہ ہے اِنْ شَاءَ اللہ کا قرآنی مفہوم۔ سیوطی نے اِنْ بمعنی ”چونکہ“ یا ”جب“ کے سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ بڑی واضح ہیں۔ مثلاً سورۃ آل عمران کی مشہور آیت وَ اَنْتُمْ الْاَوْفٰیُونَ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْعِدِیْنَ ۝ (۳۸/۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ تم مومن ہو، اس لئے تم دنیا میں سب سے بلند مقام پر ہو گے یا، جب تم مومن ہو تو ہو نہیں سکتا کہ تم بلند ترین مقام پر فائز نہ ہو۔

سورۃ فتح میں ہے۔ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللہ اٰمِنِیْنَ

..... (۲۴/۲۸)۔ چونکہ تمہارا تمام پروگرام خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہے اس لئے تم ضرور امن

عاقبت سب کچھ (یا مکہ) میں داخل ہو گئے۔ یا، بالفاظِ دیگر، جب تمہارا پروگرام خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مسجدِ حرام میں داخل نہ ہو۔ تم داخل ہو گے اور بالضرور داخل ہو گے۔

جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور دیگر اہلِ خاندان مصر میں آئے تو آپ نے ان سے کہا۔ قَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اِمْنِیْن (۱۲/۹۹)۔ چونکہ یہ ب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کی مطابق ہو رہا ہے اس لئے تم مصر میں امن و آرام سے رہو گے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے خسر نے (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ تھے) حضرت موسیٰؑ سے کارندگی کا معاملہ طے کیا تو ان سے کہا کہ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۸/۲۷)۔ چونکہ میں خدا کے قوانین کا پابند ہوں اس لئے تم مجھے اچھے لوگوں میں سے پاؤ گے۔ (نیز ۱۸/۹۹ و ۳۷/۱۰۲)۔

جنگِ احزاب میں منافقین نے بڑی غداری کی تھی۔ بعد میں یہ سوال سامنے آیا کہ ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے۔ مجرمین کے سلسلہ میں خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر کسی میں اصلاح کا امکان نظر آئے اور وہ اپنے کئے پر نادم ہو تو اسے معاف کر دیا جائے۔ اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو جرم کی سزا دی جائے۔ اس قانون کے پیشِ نظر ان (منافقین) کے متعلق بھی کہا گیا کہ وَ یُعَذِّبُ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَاءَ اَوْ یَتُوبَ عَلَیْهِمْ (۳۳/۲۴)۔ انہیں سزا دی جائے، یا معاف کر دیا جائے، اس کا فیصلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوگا (جسکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے)۔

سورہ لقمان میں ہے کہ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ عِنْدَ (۳۱/۲۴)۔ کوئی شخص یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ یہ اس لئے کہ واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے سلسلہ میں، بعض ایسی کڑیاں بھی رونما اور موثر ہو جاتی ہیں جن کا انسان کو قبل از وقت علم نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ کڑیاں ہیں جنہیں غیب کہہ کر یہ مت کہو کہ میں کل ایسا ضرور کروں گا پکارا جاتا ہے اور جن کے متعلق کہا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ مستقبل کے جو امور ایسے ہوں جن کے

اسباب (CAUSES) کی تمام کڑیوں کا تمہیں قبل از وقت علم نہ ہو، ان کے متعلق تم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً یہ تو تم کہہ سکتے ہو کہ آج سے سو سال بعد سورج گہن کس وقت لگے گا، لیکن یہ تم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکھی اس جگہ سے اڑ کر کس جگہ بیٹھے گی۔ ایسے معاملات کے سلسلہ میں کہا کہ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ۔ تم یہ مت کہو کہ میں کل یقینی طور پر ایسا کروں گا۔ جو کچھ تم نے کرنا ہے اس کے لئے قانون خداوندی کے مطابق ضروری اسباب مہیا کرتے جاؤ اور یہ کہو کہ اگر اس کے قانون کے مطابق جملہ اسباب مہیا ہو گئے تو پھر یقیناً ایسا ہوگا۔ لیکن اگر اس میں ایسی کڑیاں آگئیں جن کا مجھے قبل از وقت علم نہ ہو، تو پھر ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ان اسباب و ذرائع کے متعلق سوچنے اور انہیں مہیا کرنے کے سلسلہ میں کہا کہ تم خوب دیکھ بھال کر ضروری تدابیر اختیار کرتے جاؤ۔ وَ اذْكُرْ مَا بَلَكَ إِذَا نَسِيتَ۔ اور اگر کوئی بات بھول جاؤ اور اس طرح تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکے تو مایوس ہو کر مت بیٹھ جاؤ یاد کرو کہ تم کون سی بات بھول گئے تھے۔ وَ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَهْدِيَنَا رَبِّي لِقُرْبٍ مِنْ هَٰذَا كَرِهْنَا۔ (۲۳-۱۸/۲۴)۔ بلکہ کہو کہ مجھے یقین ہے کہ اب مجھے ایسا راستہ نظر آجائے گا جو منزل مقصود تک پہنچنے میں پہلے سے بھی زیادہ قریب کا ہوگا۔

اب وہ مقامات سامنے لائیے جہاں اِنْ شَاءَ اللَّهُ میں اِنْ بمعنی لو (اگر) آیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ لَوْ شَاءَ اللَّهُ کے عنوان پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے کہ سکیمیا موجب ہلاکت نہ ہو، تو ہم **اِنْ بِمَعْنَى اِگر** اس قسم کا قانون بنا دیتے، لیکن چونکہ ہم ایسا چاہتے نہیں تھے۔ ہماری مشیت یہی تھی کہ سکیمیا باعث ہلاکت ہو۔ اس لئے ہم نے ویسا قانون نہیں بنایا، بلکہ ایسا قانون بنایا ہے۔ یہی مفہوم ان آیات کا ہے جن میں اِنْ بِمَعْنَى ”اگر“ آیا ہے۔ مثلاً

(۱) سورۃ یسین میں ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس قدر وزن لادنے کے باوجود کس طرح سطح آب پر بٹ کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ یہ ہمارے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ وَ اِنْ نَّشَأْ فُخِّرُوا فَهُمْ..... (۳۶/۴۳)۔ اگر ہمارا قانون مشیت ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ کبھی تیر

نہ سکتیں، پانی میں ڈوب جاتیں۔ تم سوچو کہ لوہے کی ایک سوئی پانی میں جھٹ ڈوب جاتی ہے۔ لیکن ہزاروں ٹن وزنی لوہے کا جہاز اس قدر سامان اور سواریاں لا دکر کس طرح تیرنا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے قانون مشیت کی کار فرمائی جس کی رو سے طے کر دیا گیا ہے کہ کس جسامت اور وزن کی چیز پانی پر تیرتی رہے گی اور کونسی شے اس میں ڈوب جائے گی۔ یہی بات ان ہواؤں کے سلسلہ میں کہی جن کے زور پر ہادیانی کشتیاں چلتی ہیں۔ (۴۲/۲۳)۔

(۲) حضرت نوحؑ اپنی قوم کو تنبیہ کرتے کہ اگر تم اپنی غلط روش سے باز نہ آتے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے کہ تم جو ہمیں اس طرح ڈراتے رہتے ہو تو وہ تباہی تم لے ہی کیوں نہیں لے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے کہ **إِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنِ شَاءَ.....** (۱۱/۲۳)۔ یہ تباہی خدا کے قانون مشیت کے مطابق (مہلت کے وقفہ کے بعد) آیا کرتی ہے۔ اُسی قانون کے مطابق تم پر آجائے گی۔

(۳) خدا نے قرآن نازل کیا، اسے مکمل کیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لے لیا۔ لہذا یہ تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ **وَلَقَدْ نَزَّلْنَا كَذَٰلِكَ هَبْنِیْ بِآلِیِّنِیْ اَوْ حِیْنَآ اَیُّدِیْ.....** (۱۷/۸۶)۔ اگر ہماری مشیت میں ایسا ہوتا تو ہم قرآن کا کچھ حصہ لے جاتے۔ لیکن ہماری مشیت میں ایسا نہیں تھا۔ اسی لئے ہم نے اسے مکمل کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوگا۔

بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ **فَاِنْ یَّشَآءِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلَیْ قَلْبِیْ.....** (۴۲/۲۴)۔ اگر اس کی مشیت میں ہوتا تو (اے رسولؐ) وہ تیرے دل پر مہر لگا دیتا اور اس طرح یہ قرآنی پیغام تیرے قلب میں داخل ہی نہ ہو سکتا۔ لیکن خدا کی مشیت ایسی نہیں تھی۔

(۴) خدا نے انسان کو زمین پر پیدا کر کے کہہ دیا کہ **وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مَسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ.....** (۲/۲۶)۔ یہ تمہاری قرار گاہ ہے اور اس میں تمہیں ایک مدت تک رہنا ہے۔ یہ خدا کا قانون مشیت ہے۔ یہ سلسلہ کائنات، ارض و سما، کب تک علیٰ حالہ رہے گا، یا یہ زمین کتنے انسان کا مسکن بننے کے قابل رہے گی، یا خود نسل انسانی کا سلسلہ کب تک علیٰ حالہ جاری رہے گا، ان امور کا تعلق، خدا کی مشیت سے ہے جس کا انسان کو کچھ علم نہیں۔ اس لئے کہا کہ **اِنْ یَّشَآءِ**

يُذْهِبُكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِي بِالْآخِرِينَ (۴/۳۳)۔ اسے نوع انسانی! اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہو تو وہ تم سب کو یہاں سے لے جائے اور تمہاری جگہ کوئی دوسری مخلوق لے آئے۔ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكِ قَدِيرًا (۴/۱۳۳)۔ خدا نے اس کے لئے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اس حقیقت کو دیگر مقامات میں بھی دہرایا گیا ہے۔ مثلاً (۱۲/۱۹ و ۳۵/۱۶) میں۔

قوموں کے استخلاف و استبدال (یعنی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آجانے) کے متعلق بھی قوانین مشیت مقرر ہیں، ان کا محدود ثبات انہی قوانین کی رو سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی اِنْ يَشَأْ کے الفاظ آئے ہیں۔ (۹/۱۳۴)

چونکہ ہم، ہدایت و ضلالت، عزت و ذلت، حکومت و اقتدار، غریبی اور امیری وغیرہ سے متعلق قوانین مشیت کی بحث آئندہ ابواب میں کر رہے ہیں، اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں البتہ ایک مقام ایسا ہے جو نہایت اہم اور تشریح طلب ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ اسی جگہ ضروری ہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے انسانوں سے کہا ہے کہ اِعْمَلُوا مَا يَشَاءُ اللَّهُ

جیسا تم چاہو کرو۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے۔ كَذَٰلِكَ إِنَّمَا تَذَكَّرُونَ ۝ آگاہ رہو کہ یہ ان صداقتوں کی یاد دہانی ہے جنہیں فراہوش کر دیا گیا ہے۔ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ (۱۱-۸۰/۱۳)۔ سو جس کا جی چاہے اس سے تجدید یادداشت کر لے۔ اس سے نصیحت حاصل کر لے لیکن قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بھی ہیں۔

(۱) اِنْ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝
وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۖ (۲۹-۴۶/۳۰)

(۲) اِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ۖ وَ مَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ

الْعُلَمَاءُ ۵ (۲۴/۲۹-۸۱) - (نیز ۵۶/۷۴)۔

پہلی آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

یہ تو نصیحت ہے۔ پھر جو کوئی چاہے کر رکھے اپنے رب تک راہ۔ اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ (ترجمہ مولانا محسن الحسن مرحوم)

اور دوسری آیت کا یوں۔

نہیں یہ نصیحت مگر واسطے عالموں (تمام جہانوں) کے واسطے اس شخص کے نم میں سے کہ بدھی راہ چلے۔ اور نہیں چاہتے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ۔ پروردگار عالموں کا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

آپ غور کیجئے کہ ان معانی کی رو سے صورت کیا سامنے آتی ہے؟ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے یہ ضابطہ ہدایت نازل کر دیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اس سے سیدھی راہ اختیار کر لے۔ جو ایسا نہ چاہے، غلط راستوں پر چل کر تباہ ہو جائے۔ لیکن اسی سانس میں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم اپنی مرضی اور اختیار و ارادہ سے کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہاری خواہش، آرزو، مرضی، ارادہ، تمہارا چاہنا یا نہ چاہنا، تمہارے اپنے اختیار کی بات نہیں۔ تم وہی چاہ سکتے ہو جو خدا چاہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کو تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ تمہارا فیصلہ ہوتا ہی نہیں۔ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرا لیتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک عقیدہ جبر وضع کر دینے سے، خود قرآن اور قرآن کے نازل کرنے والے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ اگر بات یہی تھی کہ انسان کا عمل تو ایک طرف، اس کی آرزو اور فیصلہ بھی اس کے اپنے اختیار میں نہیں۔ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے اس سے کرا لیتا ہے۔ انسان کو وہی چاہنا پڑتا ہے جو خدا چاہتا ہے، تو پھر پہلے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ کتاب ہم نے نازل کر دی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے۔ (معاف بفرماید) اس قسم کی بات کرنا، فی نسد و خدا سے را۔

ان آیات میں مَا تَشَاءُ وُفِّیَ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تم نہیں چاہتے۔ اس میں مَا نَفَعِی (نہیں) کے لئے ہے اور تَشَاءُ وُفِّیَ مضارع ہے۔ عربی گرامر کی رو سے، نفی مضارع کے معنی۔ نہیں، یعنی مت کرو۔ بھی ہوتے ہیں۔ گرامر کی اصطلاح میں اُسے

کہتے ہیں، خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا۔ یہ ایک فنی بحث ہے جسے ہم نے لغات القرآن میں مستند کتب لغت اور گرامر کی سند سے تفصیل سے لکھا ہے۔ جو احباب اس تفصیل سے دلچسپی رکھتے ہوں، اس کا مطالعہ فرمائیں۔ ان معانی کی رو سے، وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّسْأَلَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی (ارشاد خداوندی ہے کہ) ہم نے تمہیں اختیار دے رکھا ہے کہ تم جو فیصلہ چاہو کر لو۔ لیکن تمہیں چاہیے کہ تم اپنے اختیار و ارادہ اور اپنے فیصلہ کو ہمارے قوانینِ مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ سو تم بھی ایسا ہی چلو۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے، لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ تم بطیبِ خاطر اپنے اختیار و ارادہ سے، وہی راہ اختیار کرو جو ہمارے قوانینِ مشیت کے مطابق ہو۔ ”تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔“ ہم کیا چاہتے ہیں، اسے تم جانتے ہو۔ اگر نہیں جانتے، باجھول گئے ہو تو سن لو کہ لَا يَرْضٰى رِبْعَادِهٖ الْكَفْرَ۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو وَ اِنْ تَشْكُرْ وَاِنْ يَرْضَهُ لَكُمْ۔ اگر تم ایمان کی راہ اختیار کرو گے تو وہ ہماری منشاء کے مطابق ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم کفر کی راہ اختیار نہ کرو، تو اس سے ہمیں کوئی اپنا فائدہ مقصود و مطلوب نہیں۔ اِنْ تَكْفُرْ ذٰلَا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنٰى عَنْكُمْ۔ اگر تم کفر کی راہ اختیار کر دو گے، تو کچھ اپنا ہی لگاؤ گے۔ ہم تو اس سے بے نیاز ہیں کہ تم کفر کی راہ اختیار کرتے ہو یا ایمان کی۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مِّنْ جَعَلُكُمْ فَيُنْزِلُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۹/۷)۔ ہمارا قانونِ مکافات یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ہر ایک اپنے اپنے اعمال کا، ذمہ دار ہے اور ان کے نتائج ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے سامنے آجائیں گے۔ یہ اس خدا کا قانون ہے جو تمہارے ظاہر اعمال تو ایک طرف، تمہارے دلوں کے پوشیدہ رازوں تک کا بھی علم رکھتا ہے۔ اس لئے تمہاری خواہشات اور ارادے بھی اس کے قانونِ مکافات کی رو سے نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہی آیات جن کے معانی یہ کئے جاتے ہیں کہ ”تمہارا چاہنا بھی تمہارے اختیار میں نہیں“ کس طرح اسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ قرار دے گا، اسے اس کے تمام اعمال اور ارادوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ”قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد، آں سازد نرا

یعنی اگر تم قرآن کے مطابق چلو تو یہ تمہیں ایسا بنادے گا جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ یہ ہے مفہوم، وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ کا۔ تمہیں اس کا اختیار ہے کہ تم اپنے لئے جو فیصلہ چاہو کر لیکن، جب نہیں اس کا اختیار ہے تو تم وہی کیوں نہ چاہو جو ہمارے قانونِ مشیت کا منشا ہے۔ تم اپنے اختیار کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ کہوں نہ کرو۔ اس سے تم خوشگوار یوں کی زندگی بسر کرو گے۔ اقبال کس خوبصورتی سے اس حقیقت کو بیان کرنا ہے، جب کہتا ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو تری آرزو پوری

مری دعا ہے، تری آرزو بدل جائے

اور آرزو کے بدل جانے سے، انسان کی ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ

تم اپنی آرزو کو اس طرح بدلو کہ وہ ہمارے قانونِ مشیت سے

ہم آہنگ ہو جائے۔

ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ مومن سب سے بلند اور سب پر غالب ہوتے ہیں۔ تم مومن بن جانے کی آرزو کرو تاکہ تمہیں وہ مقام حاصل ہو جائے۔

۴۔ مَنْ يَشَاءُ

عقیدہ جبر کی سند اور تائید میں جو آیات شددید سے پیش کی جاتی ہیں، وہ، وہ ہیں جن میں مَنْ يَشَاءُ کے الفاظ آتے ہیں اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے "جسے چاہے، مثلاً يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ۔ (۱۶/۹۳)۔" وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ "يَا قَيْغُفَرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (۲۸/۴)۔" وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے یا يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ (۱۴/۳۰)۔ وہ جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے۔ جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وغیرہ۔

اگر اس قسم کی آیات کے یہی معنی لئے جائیں جو ان کے عام ترجموں کی رو سے متعین ہوتے ہیں، تو

یہ، انہی مضامین سے متعلق، قرآنِ کریم کی بے شمار دیگر آیات کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً ہدایت و ضلالت کے متعلق ہے وَقُلْ اَتَحَقُّ مِنْ تِلْكَ اَنْ تَقُلُوْا فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ مِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۝ (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ عذاب و مغفرت کے متعلق بیشمار مقامات میں کہا گیا ہے کہ جَزَاءُ ۙ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ رزق کی بسط و کساد وغیرہ کے سلسلہ میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَى (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ اَلَمْ يَشَأْ سے متعلق آیات کے معنی یہ لئے جائیں کہ ”وہ جسے چاہتا ہے“ ویدیتا ہے۔ اس کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں تو قرآنِ کریم کی مختلف آیات ایک دوسرے سے متضاد ہو جائیں گی۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے اپنے من جانے اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہذا، مذکورہ صدر آیات، باہم متضاد نہیں ہو سکتیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

دو معنی | عربی زبان کے قاعدے کی رو سے، مَنْ يَشَاءُ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ”جسے اللہ چاہے“ اور دوسرے یہ کہ ”جو شخص ایسا چاہے“ مثلاً يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ کہ جو شخص ہدایت لینا چاہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے وہ گمراہ رہتا ہے۔ اسی طرح رزق سے متعلق آیت کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اسے رزق کشادہ ملے اسے کشادہ مل سکتا ہے۔ جو اپنے لئے رزق کی تنگی چاہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں معانی میں، ترجیح کن معانی کو دی جائے گی۔ سو اس کا جواب آسان ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) ان آیات کا وہ مفہوم صحیح ہوگا جو قرآنِ کریم کی دیگر آیات اور اس کی کلی تعلیم کے مطابق ہو قرآنِ کریم کی کلی تعلیم کا محور، قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ یعنی انسان کو

اس کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ لہذا، ان آیات کا وہی مفہوم قرآنی تعلیم کے مطابق ہوگا جس میں مَنْ يَشَاءُ کا فاعل انسان کو تصور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سورۃ النحل کی وہ آیت جس کا ایک حصہ

سورۃ نحل کی اہم آیت اہم نے (ایک باب میں) پہلے بھی درج کیا ہے، بڑی غور

طلب ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔ وَ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَ لَكِنْ يُخَصِّصُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَ نَسْأَلُكَ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۱۶/۹۳) اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی ڈگر پر چلنے والی نوع بنا دیتا۔ لیکن وہ جسے چاہتا، گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے تاکہ وہ تم سے پوچھے کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔

آپ دیکھئے کہ اس ترجمہ سے کیسی عجیب و غریب صورت سامنے آتی ہے۔ یعنی قرآن کریم پہلے یہ کہتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت تمہارے اپنے اختیار کی بات نہیں۔ خدا جسے چاہے ہدایت دیدے، جسے چاہے گمراہ کر دے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ تم سے پوچھیں گے کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہدایت و ضلالت انسان کے اپنے بس کی بات نہیں، اس باب میں انسان مجبور ہے، اللہ جسے چاہے ہدایت دیدے، جسے چاہے گمراہ کر دے، تو پھر لوگوں سے ان کے اعمال کی باز پرس کیسے ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ اور مفہوم صحیح نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ اگر خدا چاہتا کہ سب انسان ایک ہی راستے پر چلیں، تو وہ انہیں (حیوانات کی طرح) مجبور پیدا کر دیتا لیکن اس کی مشیت ایسی نہیں تھی۔ اس لئے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس کا قانون یہ ہے کہ جس کا جی چاہے (مَنْ يَشَاءُ) صحیح راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے اور انسان کا یہی صاحب اختیار و ارادہ ہونا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اس لئے اسے اختیار سونپنے کے بعد ہم اس سے پوچھیں گے کہ اس نے اپنے اختیار کو استعمال کس طریق سے کیا تھا!

لہذا اس قسم کی آیات کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کے سامنے دونوں قسم کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ وہ، ان میں سے جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔ جس قسم کا راستہ وہ اختیار کرے گا، اُسی قسم کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

بعض آیات میں مَنْ تَشَاءُ کے بجائے مَنْ تَشَاءُ (جسے ہم چاہیں) یا مَنْ أَشَاءُ (جسے میں

چاہوں) کے الفاظ آتے ہیں۔ لہذا ان آیات میں تو فاعل بہر حال **جسے خدا چاہے** اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ ہم اس باب کے شروع میں جو نکھ آئے ہیں اس

سے واضح ہے کہ ”خدا کے چاہنے“ سے مراد ہے ”خدا کے قانون مشیت کے مطابق“ اس سے اس قسم کی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے۔ مَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ تَشَاءُ (۶/۸۴)۔ ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق درجات بلند کرتے ہیں اور اس کا قانون مشیت یہ ہے کہ لِكُلِّ دَرَجَاتٍ رَّمًا عَمَلُوْا (۱۹/۳۶)۔ ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ یہی صورت ان قوانین مشیت کی ہے جن کا تعلق خارجی کائنات یا انسان کی طبعی زندگی سے ہے۔ مثلاً سورۃ روم میں ہے کہ خدا ہواؤں کو چلاتا ہے تو وہ سمندر سے بخارات ادا پر کو لے جاتی ہیں۔ فَيَنْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ (۳۰/۴۸)۔ پھر وہ انہیں اپنے قانون مشیت کے مطابق فضا میں پھیلا دیتا ہے۔ اسی قسم کے طبعی قوانین مشیت انسانوں کے ہاں بچوں کی پیدائش (اولاد) کے سلسلہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ (۴۹۱-۵۰/۴۲)۔

چونکہ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، ہم ہدایت و ضلالت، عزت و ذلت، رزق وغیرہ سے متعلق تفصیلی گفتگو، الگ الگ ابواب میں کر رہے ہیں، اس لئے اس مقام پر اپنی اصولی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مَنْ تَشَاءُ، وغیرہ سے متعلق مزید آیات اپنے اپنے مقام پر آئیں گی۔

۵۔ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ————— ۶۔ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ

وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ————— وہ جو ارادہ کرتا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے

آپ دوسرے باب پر نگہ باز گشت ڈالئے۔ اس میں بتایا گیا (اور اسے بعد میں بھی دہرایا گیا ہے) کہ خدا کے تخلیقی مراحل کے دو پروگرام ہیں۔ مرحلہ اول، عالمِ آمر کا ہے جس میں ”خدا“ اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا اور ان کے حفظ و بقاء، نشو و ارتقا اور محو و ثبات کے لئے قوانین مقرر

کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس کی قدرتِ مطلقہ اس طرح کار فرما ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے لئے نہ پہلے سے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر ہوتا ہے، نہ کوئی حدود و قیود عائد۔ یہاں یَخْلُقُ مَا يَشَاءُ (۴۲/۴۹)۔ کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہی ہے کہ وہ جو جی میں آئے پیدا کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (۲۲/۱۴)۔ جو کچھ اس کے ارادے میں ہوتا ہے، وہ ویسے ہی کرتا ہے۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ (۲۱/۲۳)۔ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے فلاں چیز کو ایسا کیوں بنایا ہے۔ یا جو قوانین وہ وضع کرتا اور جو احکام نافذ کرتا ہے، وہ ویسے کیوں ہیں۔ (۲/۲۵۳ و ۵/۱)۔

خدا کے تخلیقی پروگرام کا یہ مرحلہ ختم نہیں ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے اپنی تخلیقات کے لئے جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں وہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا، لیکن وہ اب سلسلہ تخلیق کی طرف سے فارغ نہیں ہو بیٹھا۔ یَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۳۵/۱۱)۔ وہ اپنی تخلیقات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جو نئی مخلوق ظہور میں آتی ہے اس کے لئے نئے قوانین بھی وضع کرتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے اپنے انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

گماں مبرکہ بہایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخودہ در رگ تاک است

اور غالبؒ نے اپنے مخصوص اسلوب میں یوں کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نطفہ آئینہ دائم نقاب میں

ہماری معلوم کائنات تو اس کے سلسلہ تخلیق میں ایسی ہی ہے، جیسے صحرائیں ذرہ، یا سمندر میں قطرہ۔ ہمیں نہ تو اس کی موجودہ جملہ مخلوق کا یقینی طور پر علم ہے اور نہ ہی اس کے لامتناہی سلسلہ تخلیقِ مزید کا کوئی اندازہ۔

اس کے تخلیقی پروگرام کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں ہر کام اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جن میں وہ کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس مرحلہ میں، یَفْعَلُ مَا يَشَاءُ کے معنی

ہوں گے۔ وہ ہر بات اپنے قانون مشیت کے مطابق کرتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ مثلاً

قانون مشیت کے مطابق | (۱) سورۃ الرعد میں ہے لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوهُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ (۳۸ - ۳۹ / ۱۳)۔ ہر عمل کے نتیجہ کے لئے ایک ميعاد ہوتی ہے اور یہ ميعاد خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ اس کے مطابق اقوام یا اشعار کا محو و ثبات (باقی رہنا یا مٹ جانا) ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں پہلے یہ کہا ہے کہ ہر بات کے لئے ایک قانون (کتاب) مقرر ہے اور اس کے بعد مَا يَشَاءُ کہا۔ ظاہر ہے کہ یہاں مَا يَشَاءُ کے معنی "خدا کے قانون مشیت کے مطابق" ہی ہو سکتے ہیں۔

(۲) محو و ثبات کے اس اصول کے متعلق سورۃ ابراہیم میں ہے کہ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ هُوَ يُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ قَدْ خَدَّاهُ لَعَلَّ يَكْفُرُوا بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۱۲ / ۲۷)۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایسا محکم قانون اور اصول بنانے کے بعد بھی "وہ جس طرح جی میں آئے" کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، جسے چاہتا ہے یونہی تباہ کر دیتا ہے!

(۳) سورۃ بنی اسرائیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ طبعی دنیا کے مفادات، اپنی اپنی کوشش کے مطابق

طبعی قوانین میں مومن و کافر کی بھی تمیز نہیں | حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس میں مومن اور کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں جو جیسی

کوشش کرتا ہے اس کے مطابق اسے پھل مل جاتا ہے۔ جو صرف دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ جو دنیاوی مفاد کے ساتھ اخروی خوشگوار باں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے دونوں مل سکتی ہیں۔ سعی و عمل کے اس میدان میں کسی کے آگے روک نہیں

کھڑی کی جاتی کہ دوسرے تو آگے جاسکتے ہیں تم نہیں جاسکتے۔ کُلُّ نُوْمِدٌ هُوَ لَدَّ وَ هُوَ لَدَّ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَخْطُوْمًا ۝ ہمارے قوانین طبعی کے مطابق کافر کو شش کرتے ہیں تو ہم انہیں بھی آگے بڑھائے جاتے ہیں، مومن ایسا کرنے ہیں تو انہیں بھی ان کی کوششوں کے مطابق بڑھائے جاتے ہیں۔ ہم کسی کے راستے میں بند نہیں لگا دیتے۔ یہ کچھ کہنے کے ساتھ کہا ہے مَا نَشَاءُ يُصْنُ سُرِيْدٌ (۱۸/۱۷۷)۔ ظاہر ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ”ہم جیسا چاہتے ہیں اور جس کے لئے جو ارادہ کرتے ہیں اسے وہی مل سکتا ہے“ اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے جنہیں ہم نے اپنی مشیت اور ارادے کے مطابق متعین کر رکھا ہے۔ اس کا ”امرادہ“ یہی تھا کہ دنیاوی مفادات کے سلسلہ میں نو کافر مومن میں کوئی فرق نہ ہو، لیکن آخرت میں کفار کا کوئی حصہ نہ ہو۔ یُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۝ (۵۱/۱۳)۔ یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے، ظلم اور دھاندلی سے نہیں ہوتی۔ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۷۱/۳)۔ ”خدا نے اقوام عالم کے لئے ظلم کا ارادہ ہی نہیں کیا۔“ یہاں اگر کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس کی اپنی ہی غلط روش کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس باب میں خدا کا ارادہ (قانون مشیت) یہی ہے (۵۹/۵)۔ خارجی کائنات میں خدا کا یہ ارادہ، قوانین طبعی کی شکل میں کار فرما ہے اور انسانی زندگی کے لئے یہ قوانین وحی کے ذریعے عطا کر دیئے گئے ہیں۔ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ اَيُّتًا بَيِّنٰتٍ ۚ وَ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝ (۱۶/۲۲)۔ ”اس طرح ہم نے یہ واضح قوانین نازل کر دیئے۔ اب سیدھا راستہ انہی کے مطابق مل سکتا ہے۔“

(۴) قرآن کریم میں داستان بنی اسرائیل بڑی شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے، اس لئے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ابدی قوانین عملی شکل میں نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں، سورہ قصص میں ہے کہ جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو گئی اور خدا کے قانون مکافات کی رو سے اہملت کا وقفہ ختم ہونے کے بعد اس کی تباہی کا وقت آپہنچا تو صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰ مقابلہ کے لئے اٹھے۔ انہوں نے، بنی اسرائیل کی مناسب تعلیم و تربیت کی اور

انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر سینا کی آزاد فضاؤں کی طرف لے گئے تاکہ وہاں انہیں جہانِ بانی کے لئے تیار کیا جائے۔ داستان کی اس کڑی کا آغاز قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے کہ جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو گئی۔ وَ شَرِیدُ اَنْ تَمُوتَ عَلٰی الَّذِیْنَ ۱ سَتَضَعُوْا فِی الْاُمْنِضِ... (۲۸/۵)۔ تو ہم نے "املحہ کیا" کہ جس قوم کو اس نے کچل کر رکھ دیا تھا، اسے نوازا جائے 'فرعون اور ہمارا کو تباہ کیا جائے اور بنی اسرائیل کو ان کا جانشین بنایا جائے۔

خدا نے اس کا "ارادہ کیا" لیکن اس کا یہ ارادہ اُس طرح عمل میں نہیں آگیا جس طرح عالمِ امر

خدا کا ارادہ کس طرح برے کار آتا ہے | میں آیا کرتا ہے کہ "جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا" اور وہ ہو جاتی

ہے۔ اس ارادے کو عملی شکل میں لانے کے لئے اس نے بنی اسرائیل کو ایک تفصیلی پروگرام دیا اور کہہ دیا کہ اگر وہ اس کے مطابق چلتے رہے تو انہیں تمکن حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اس قوم نے خدائی راہ نمائی کا پورا پورا اتباع نہ کیا۔ وہ اس میں کٹ جھٹیاں کرنے لگے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی خطہ زمین جس کے متعلق کہا گیا تھا۔ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ (۵/۲۱)۔ "خدا نے اسے ان کے نام لکھ دیا تھا" اس کے متعلق کہہ دیا کہ فَاَنْتُمْ مُّحَرَّرَاتٌ عَلَیْہُمْ اَمَّا بَعِیْنُ سَنَۃٌ (۵/۲۴) وہ چالیس سال تک ان پر حرام قرار دے دی گئی۔ اس دوران میں اس قوم کی پرانی نسل ختم ہو گئی اور نئی پود، جس کی تربیت ان آزاد فضاؤں میں ہوئی تھی، ابھری اور اس نے ایک ہی جھپٹے میں اس زمین پر قبضہ کر لیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ عالمِ خلق میں خدا کے ارادے کس طرح، قوانینِ خداوندی کے مطابق پورے ہوتے ہیں؟ یہاں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ "وہ سرزمین جو ان کے لئے بکھ دی گئی تھی" تو اس سے مراد کیا ہے؟ "بکھ دی گئی" کے یہ معنی نہیں کہ وہ آرام سے بیٹھے رہیں، اس کا قبضہ انہیں خود بخود مل جائے گا۔ جیسا کہ ایک باب میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربی زبان اور قرآن کریم میں "کتاب" کے معنی قانون کے ہیں، اس لئے کَتَبَ کے معنی ہوں گے قانون کے مطابق بنی اسرائیل سے کہا یہ گیا تھا کہ اگر انہوں نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو انہیں یہ سرزمین مل جائے گی۔ اُن کی اُس وقت کی موجودہ نسل نے ان قوانین کا اتباع نہ کیا تو وہ اس سرزمین سے محروم رہ گئی۔ ان کے بعد دوسری نسل نے ان کا اتباع کیا تو وہ اس پر قابض ہو گئے۔ تفصیل ان امور کی کسی آئندہ باب

میں ملے گی۔

(۵) سورہ حج میں ہے وَ مَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَالَهُ مِنْ مُكْرِمٍ - إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۲۲/۱۸)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ”جسے اللہ ذلیل کر دے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ یقیناً اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

عزت اور ذلت سے متعلق قانون

اس ترجمہ کی رو سے ظاہر ہوتا ہے کہ عزت اور ذلت کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ خدا جسے چاہتا ہے عزت دے دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تصور صحیح نہیں۔ خدا نے عزت اور ذلت کے لئے قوانین اور اصول مقرر کر رکھے ہیں۔ (اس نقطہ کے متعلق تفصیلی بحث تو آئندہ چل کر سامنے آئے گی۔ اس مقام پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔ سورہ انفجس میں ہے کہ جب کوئی شخص (یا قوم) ذلیل ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیْ اَہَاسُنِ - دیکھو! مجھے خدا نے یوں ہی ذلیل کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یاد رکھو! خدا کسی کو یوں ہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ اس کی وجوہات ہوتی ہیں۔ تم اس لئے ذلیل ہوئے ہو کہ کَلَّا بَلْ لَّوْ شِئْتُمْ مُؤْتًا اَلَيْسَ لَکُمْ..... (۱۶ - ۸۹/۱۷)۔ تم اس شخص کی عزت نہیں کرتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہتا تھا۔ تم نے ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس میں انسان کی عزت، انسان ہونے کی جہت سے نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے لئے تم نے اور ہی معیار وضع کر رکھے تھے۔ تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اس کی یہ وجہ ہے۔ خدا یوں ہی کسی کو ذلیل نہیں کیا کرتا۔

آپ نے دیکھا کہ سورہ حج کی مذکورہ بالا آیت (۲۲/۱۸) میں، مَا يَشَاءُ کا مفہوم کیا ہے، یعنی ”خدا

کے قانون مشیت کے مطابق“

(۶) اسی سورہ (حج) میں ہے کہ وَ نُقِرْ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَحْبَبِ

مُسَامَحَةٍ (۲۲/۵)۔ ہم جنین کو ایک مدت تک کے لئے رحم مادر میں رکھتے ہیں اور اس کے بعد

اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ یہ مدت مَا نَشَاءُ کے مطابق ہوتی ہے۔

جنین کی حالت

ظاہر ہے کہ یہاں بھی مَا نَشَاءُ کے یہ معنی نہیں کہ ہم ہر جنین کے متعلق یہ

فصلہ کرتے ہیں کہ اسے اتنی مدت تک رحم مادر میں رہنا چاہیئے اور اسے اتنی مدت کے لئے صل

کا زمانہ خدا کے قانون طبعی کے مطابق متعین ہے۔ اگر کسی کیس میں اس مدت میں کمی بیشی ہوتی

ہے تو وہ بھی طبعی قانون کے مطابق ہوتی ہے اور میڈیکل سائنس کی رو سے اس کے متعلق بتایا جاسکتا ہے۔

اولاد کی پیدائش کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور وہ ہے حضرت زکریا کے ہاں حضرت یحییٰ کی پیدائش۔ حضرت زکریا بوڑھے ہو رہے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھی۔ اس لئے انہیں اولاد کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ انہیں جب **حضرت زکریا کے ہاں اولاد** ایک لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا گیا تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ ان حالات میں، میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ

كَذٰلِكَ اَفْعَلُ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۳/۳۹)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ”جس طرح خدا چاہتا ہے کر دیتا ہے“۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ خدا نے خود ہی دوسری جگہ بتا دیا ہے کہ ان کے ہاں بچہ عام قانونِ طبعی (قانونِ مشیت) کے مطابق پیدا ہوا تھا۔ وہ اس طرح کہ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجًا (۲۱/۹۰)۔ حضرت زکریا میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی لیکن ان کی بیوی میں کوئی نقص تھا۔ وہ نقص دور ہو گیا اور اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نمودار ہو گئی۔ لہذا، اس بچے کی پیدائش عام قانونِ طبعی کے مطابق ہوئی۔ اس قسم کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں کہ عورت یا کثرت تک عقیم (بانجھ) رہی اور منسلح علاج سے آخری عمر میں ان کے ہاں اولاد پیدا ہو گئی۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ جہاں تک عالمِ آسمان کا تعلق ہے یَفْعَلُ مَا يَشَآءُ اَوْ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ کے معنی یہی ہیں کہ وہاں سب کچھ خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ لیکن یہی الفاظ جب عالمِ خلق سے متعلق ہوں، تو ان کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ایسا کچھ خدا کے قانونِ مشیت کی رو سے ہوتا ہے جس کا علم انسان کو دے دیا گیا ہے۔ علومِ فطرت کی رو سے یا وحی کے ذریعے۔ اس سلسلہ میں ایک ایسی اہم بات سامنے آتی ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح و جد میں آجاتی ہے۔

لے حضرت یحییٰ اور حضرت یسے کی پیدائش کے سلسلہ میں تفصیلی بحث میری کتاب ”شعلہ مستقیم“ میں ملے گی۔

عالمِ آسمان میں خدا کے فیصلوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ۝ (۲۳/۲۱)۔ خدا سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے اور سب سے پوچھا جاسکتا ہے۔ یعنی وہاں خدا کسی قانون کا پابند نہیں ہے۔

لیکن عالمِ خلق کے سلسلہ میں خدا نے کچھ اور کہا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہدایت و وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اگر تم اس قسم کے کام کرو گے تو ان کے نتیجے میں تمہیں جنت مل جائے گی۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ (اس کو حتمی اور یقینی قانون کہا جاتا ہے)۔ سورۃ فرقان میں ہے کہ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ لَكُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ۔ اہل جنت اس میں ہمیشہ رہیں گے اور اس میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں

خدا بھی پوچھا جاسکے گا

کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟

گے۔ اس کے بعد ہے۔ كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَفْدًا مِّنْهُمْ لَوْ (۲۵/۱۶)۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور وعدہ ایسا ہے کہ (بفرضِ محال) اگر یہ پورا نہ ہو تو اس سے پوچھا جاسکے گا کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اللہ اکبر! وہی خدا جس نے (عالمِ امر کے سلسلہ میں) کہا تھا کہ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ۔ خدا سے پوچھا نہیں جاسکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے، اب یہ کہتا ہے کہ اگر میرا کوئی وعدہ پورا نہ ہو تو تم مجھ سے بھی پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔ اور میں تمہیں اس کا جواب دوں گا۔ تمہیں بتاؤں گا کہ یہ وعدہ (قانون) فلاں فلاں شرائط کے ساتھ مشروط تھا۔ تم نے چونکہ وہ شرائط پوری نہیں کیں اس لئے ہمارا وعدہ پورا نہیں ہوا۔ قانون اسی کو کہتے ہیں نا، کہ اگر یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا! ایک مستبد، ڈکٹیٹر اور ایسے حاکم میں جس کی مملکت میں قانون کی عملداری ہو، یہی فرق ہوتا ہے۔ ”ڈکٹیٹر“ جو اس کے جی میں آئے ”کرتا ہے اور اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ قانون کی عملداری میں ہر بات کا فیصلہ قانون کے مطابق ہوتا ہے اور ہر فیصلہ کے متعلق پوچھا جاسکتا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ خدا کی مملکت میں ایک مستبد ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں، قانون کی حکمرانی ہے اور قانون بھی ایسا کہ جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ذرا سوچئے کہ خدا کے متعلق، کسی مذہب میں بھی ایسا تصور ملتا ہے؛ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا، تو ان کے ہاں بھی خدا کا تصور ایک مطلق العنان، ڈکٹیٹر کا سا پیدا ہو گیا کہ جن

کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔

ہمارے دور ملکیت کا تراشا ہوا خدا کا تصور

وہ جو جی میں آئے کرتا ہے اور

اس کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک اُمت میں قانون کی حکمرانی رہی (اسے خلافت راشدہ کہا جاتا ہے) اس وقت تک خدا کے متعلق قرآنی تصور قائم رہا۔ لیکن جب اس کے بعد خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی تو خدا کے متعلق بھی تصور بدل گیا۔ ہمارے ہاں کہنے کو تو یوں کہا جاتا ہے کہ السلطان ظل اللہ علی الارض بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت ہم نے خدا کو زمین کے بادشاہوں کے قالب میں ڈھال رکھا ہے۔ یعنی ایک مستبد آمر مطلق، جو نہ کسی قاعدے کا پابند ہے نہ قانون کا۔ جو اس کے جی میں آئے کرے، اس کے حضور کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کر دے، جسے چاہے جاگیر بخش دے، جس سے چاہے سب کچھ چھین لے۔ اس کا مزاج (سعدی کے الفاظ میں) ”مزاج شاہاں“ کے مطابق ہے کہ گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند۔ اگر موڈ خراب ہو تو سلام کے جواب میں پھٹڑ رسید کر دیا۔ موڈ اچھا ہوا تو گالی دینے والے کو جاگیر بخش دی۔ سُبْحَانَ اللَّهِ تَعَالَى عَمَّا يَصِفُونَ۔ قرآن کا خدا انسانوں کے ان خود ساختہ تصورات سے بہت بلند ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اُمت میں جب تک قانون کی حکمرانی رہی، خدا کا تصور بھی ایک، قانونی حکمران کا سا رہا۔ جب ان میں شاہنشاہیت آگئی تو اس کا تصور ایک آمر مطلق کا سا ہو گیا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بالفاظ صحیح کہنا یوں چاہیے کہ اُمت میں جب تک خدا کا تصور یہ رہا

کہ اس کا ہر فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے ہمارے نظام کی بنیاد قانون کی حکمرانی پر ہی جب

خدا کا تصور بدل جانے سے

عقیدہ جبر کی رو سے خدا کا تصور ایک آمر مطلق کا سا ہو گیا، ہمارا نظام حکومت (فیصلہ کسریٰ کی طرح) خود مختار

اجتماعی نظام بدل گیا

شاہنشاہیت میں بدل گیا۔ اور چونکہ یہ نظام شاہنشاہوں کو خوب اس آتا تھا، اس لئے ہمارے سلاطین نے عقیدہ جبر کی خوب خوب پشت پناہی کی حتیٰ کہ اُسے مسلمانوں کے ایمان

کا جنرہ بنادیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کا تصور بدلنے سے، کس طرح نظام معاشرہ بدل جاتا ہے۔ یہ ہے انسانی زندگی میں ایمان کی اہمیت۔ غالباً کامت (COMTE) نے کہا ہے کہ تم مجھے یہ بتادو کہ کسی قوم کے ہاں خدا کا تصور کس قسم کا ہے، اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن اور سیاست و معاشرہ کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔

قرآن خدا کے متعلق صحیح تصور دیتا ہی اس لئے ہے کہ انسانی معاشرہ، اس تصور کا عکس بناتا ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق خدا پر ایمان رکھنے والی قوم میں شاہنشاہیت اور ڈکٹیٹر شپ کبھی بار نہیں پاسکتی۔ اس میں ہمیشہ قانون کی حکمرانی کارفرما ہوگی۔ جس نظام کی بنیاد اس ابدی اور غیر متبدل اصول پر ہو کہ هُمْ يَسْئَلُونَ — ہر انسان سے باز پرس کی جاسکتی، ہر ایک سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور ویسا کیوں کیا ہے — کیا اس میں ڈکٹیٹر شپ (ملوکیت) کی ذرا سی بھی گنجائش ہو سکتی ہے! "هُمْ يَسْئَلُونَ" میں چھوٹے بڑے سب آجاتے ہیں، اس میں کسی کی بھی استثناء نہیں۔

اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے معنی ہوتے ہیں وہ اتھارٹی جسے آخری اختیار حاصل ہو، جس کے فیصلے کی کہیں اپیل نہ ہو جس سے پوچھا نہ جاسکے کہ اس نے ایسا فیصلہ کیوں دیا ہے۔ اسلامی نظام میں یہ حیثیت صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے۔ لَا يُسْئَلُ صَافِ اس کے لئے ہے، کسی اور کے لئے نہیں۔ اس ایک اصول کے مطابق، ملوکیت، آمریت، مذہبی پیشوائیت اور روحانی آقاویت، سب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔ یہی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا عملی مفہوم ہے۔

اور اب آپ نے اس کا بھی اندازہ لگالیا ہوگا کہ ایک عقیدہ تقدیر کے بدل دینے سے امت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا!

”کتنی گہری تھی یہ سازش — اور کیسے تباہ کُن تھے اس کے نتائج!!“

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

یہ الفاظ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں آئے ہیں۔ ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے — بیشک اللہ تمام چیزوں پر قادر ہے — اور اس کے قدامت ہونے سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اس کے ہاں کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ وہ جو جی میں آئے کرتا ہے۔

آپ دوسرے باب کو ایک بار دیکھئے، جس میں 'قدر'، 'تقدیر'، 'قادر'، 'قدیر' وغیرہ الفاظ کے معانی بیان کئے گئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ 'قدیر' کے معنی ہیں 'پہلے مقرر کرنے والا' لہذا 'إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ' کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ہر چیز کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق وہ سرگرم عمل رہتی ہیں۔ یہی وہ خدا کا کنٹرول

قدیر کے معنی

ہے جس کے باہر کائنات کی کوئی شے جا نہیں سکتی۔ وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)۔ اس نے ارض و سما کی ہر چیز کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ خدا کا یہ اقتدار ساری کائنات کو محیط ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، وہ اپنے ارادہ اور انتخاب میں صاحب اختیار ہے لیکن اس کے ہر ارادہ اور ہر عمل کا نتیجہ بھی خدا ہی کے مقرر کردہ پیمانوں (قوانین) کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے سلسلہ میں خدا کے قدیر ہونے سے یہی مراد ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے۔ لَهَا مَّا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهِمَا مَّا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ انسان جو اچھے کام کرتا ہے ان کا فائدہ بھی اسی کو ہوتا ہے اور جو بُرے کام کرتا ہے، اس کا نقصان بھی وہی اٹھاتا ہے اور اس سے دو ہی آیات پہلے ہے۔ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲/۲۸۴)۔ جو شخص چاہے خدا سے سامانِ حفاظت لے لے، جو چاہے تباہی خرید لے۔ بیشک خدا نے ہر بات کے لئے پہلے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ "ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر

کرد، اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اسے ارض و سما کی ہر چیز کا علم ہوتا ہے۔ ۛ اللہ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ظہور نتائج کے وقت ہر شخص کے صحیح اور غلط اعمال کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ (۲۸-۲۹/۳) نیز (۵/۴۰ : ۱۱۹ - ۵/۱۲۰)۔ خدا کا یہی قانون ہے۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ ”جو لوگ اپنی غلط روئس پر اترانے رہتے ہیں اور جانتے یہ ہیں کہ جو کام وہ سرانجام نہیں دیتے ان کی وجہ سے ان کی تعریف کی جائے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ خدا کی گرفت سے چھوٹ نہیں سکتے۔ کائنات کی وسیع و عریض مملکت خدا ہی کی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ اور اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، جن کے مطابق نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان کس طرح اس کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر جاسکتا ہے؟ (۱۸۷-۱۸۸/۳)۔

اسی سورۃ میں، دوسرے مقام پر، یہ بات اور بھی واضح ہو گئی ہے۔ جماعتِ مومنین کو ایک جنگ (احد) میں کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قُلْتُمْ اَنَّا هٰذَا اَمْ نَبُوحِنَا لَکَ کہ ہمیں یہ نقصان کیوں ہوا ہے۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنفُسِکُمْ۔ اسے رسول اللہ ان سے کہہ دو کہ یہ تمہاری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔

.. .. . اس کے ذمہ دار تم خود ہو اور اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (۱۶۴/۳)۔ خدا نے ہر معاملہ کے متعلق قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ جو ان کے مطابق چلتا ہے، کامیاب ہوتا ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، نقصان اٹھاتا ہے۔

سورۃ توبہ میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ ”اگر تم جہاد کے لئے باہر نہیں نکلو گے تو تم سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے اور خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لئے آئے گا۔“ اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (۹/۳۹)۔ قوموں کے عروج و زوال کا فیصلہ اُسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے دوسری جگہ کہا کہ یہ لوگ جو نظامِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں، ان سے کہو کہ تم مختلف مقامات میں آتے جاتے ہو اور وہاں اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات

کو دیکھتے ہو۔ وہ قومیں تم سے بھی زیادہ طاقت ور تھیں۔ تو کیا تم اس سے بھی یہ بات نہیں سمجھتے کہ جب وہ قومیں اپنی رؤس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ نہ رہ سکیں تو تم کس طرح بچ جاؤ گے۔ اس کے بعد ہے اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ۝ (۲۵/۴۴)۔

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر قانونِ مکافاتِ عمل کو کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کھیتی، خدا کے مقرر کردہ قوانینِ زراعت کے مطابق ہوتی ہے۔ بارش ہر قسم کی زمین پر برتی ہے۔ جو زمین فصل بونے کے لئے تیار کر لی گئی ہو، اس سے روئید کی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بنجر رہ گئی ہو، اس میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی اس کا

کھیتی کی مثال

قانون ہے کہ، گندم از گندم، برودید جو ز جو — یہی موت اور حیات کا اصول ہے۔ سورہ روم میں ہے: فَاَنْظُرْ اِلٰی اَثَارِ مَا خَسِفَ اللّٰهُ كَيْفَ يُخْرِجُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا۔ تم خدا کی رحمت (بارش) کے اثرات پر غور کرو۔ وہ کس طرح زمین مُردہ کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحِی الْمَوْتِ۔ اس طرح خدا، مرووں کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہے وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۵۰/۳۰ ذ ۴۵/۱۸ ذ ۴۱/۳۹)۔ اس دنیا میں قوموں کی موت و حیات کے لئے بھی یہی اصول مقرر ہیں اور حیات بعد الممات کے متعلق بھی ہے۔

بنی اسرائیل، اپنی غلط رؤس کے تباہ کن نتائج کی وجہ سے اہل بابل کی غلامی کی ذلت آمیز زنجیروں میں جکڑے گئے، اور قریب سو سال کی محکومی کے بعد انہیں دوبارہ آزادی نصیب ہوئی قرآنِ کریم نے، ان کی حیاتِ قومی کے اس حادثہ کو تمثیلی رنگ میں بیان کرنے کے بعد کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲/۲۵۹)۔ قوموں کی موت اور حیات کا فیصلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل میں، مہلت کے وقفہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیج کے درخت بن کر پھل لانے (عمل کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آنے) میں ایک وقفہ ہوتا ہے اور (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)۔ یہ وقفہ، مدت یا ميعاد، خدا کے قانون کے مطابق مقرر ہے۔ قرآنِ کریم

میں اس نکتہ کو (ایک مقام پر) بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حضور نبی اکرم کے سامنے، عالم انسانیت میں انقلاب برپا کرنے کا ایک عظیم پروگرام تھا۔ اس **حضور کی آرزو** مقصد کے حصول کے لئے حضور کی ساری عمر نہایت حوصلہ آزا جدوجہد میں بسر ہوئی جس میں مخالفتوں کے جھوم کا مسلسل مقابلہ کرنا پڑا۔ عمر کے آخری مراحل میں حضور کے دل میں اس قسم کی آرزو کا بیدار ہو جانا فطری امر تھا کہ ان کوششوں کا نتیجہ میری زندگی میں میرے سامنے آ سکے گا، یا میری تمام عمر مشکلات کا مقابلہ کرنے ہی میں گزر جائے گی! اس کے جواب میں کہا گیا کہ **وَإِنَّا عَلَىٰ أَنْ نُمِيتَكَ مَا نَعْلَمُ لَهُمْ لَقَدْ مُؤْتُونَ** (۲۳/۹۵)۔ ہم بے شک اس پر قادر ہیں کہ تمہارے مخالفین کو جس تباہی کی بابت متنبہ کیا جاتا ہے، اس کا ظہور تمہارے سامنے ہی ہو جائے، لیکن عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان وقفہ کے متعلق ہمارا ایک قانون مقرر ہے جس میں کسی کی خاطر کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ **فَلِهَذَا، عَلَيْنَا أَنْ نَبْلَغُكَ وَهَلَيْنَا الْحَسَنَاتُ** (۱۳/۴۰)۔ تمہارا فرض ہے یہ ہے کہ تم اس پیغام کو لوگوں کو تک پہنچاتے جاؤ۔ تمہاری کوششوں کا نتیجہ کب برآمد ہوگا، اس کا ”حساب کرنا“ ہمارے ذمہ ہے۔

آپ سوچئے کہ جو خدا، اپنے رسول کی خاطر بھی، اپنے مقرر کردہ ”حساب“ میں کمی بیشی نہیں کرتا، اس کے متعلق یہ تصور کس طرح صحیح ہوگا کہ وہ جب جی چاہے اور جیسا جی میں آئے، کرتا رہتا ہے۔ یہ ساری کائنات ”حساب“ کے زور پر چل رہی ہے۔ اگر اس حساب میں ذرا سی کمی بیشی ہو جائے تو سارا سلسلہ کائنات ایک ٹائیز میں تھس تھس ہو جائے۔ انسان اگر زمین سے اڑ کر چاند پر جا پہنچتا ہے اور جن چیزوں کو وہاں بھیجتا ہے، ان کا کنٹرول زمین پر بیٹھے کرتا رہتا ہے، تو یہ حساب کی رُسے ہوتا ہے۔

چاند پر جانے کا ذکر آیا، تو قرآن کریم کی ایک عظیم آیت سامنے آگئی۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے **وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ مَا بَيْنَ خِلْمَا مِنْ دَابَّةٍ** خدا کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور اجرام فلکی کو پیدا کیا اور ان دونوں میں، ذی حیات مخلوق کو پھیلادیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اجرام فلکی میں بھی بعض ایسے کُتے ہیں جن میں،

”زندگی“ موجود ہے۔ اس کے بعد ہے وَ هُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (۲۹۱/۴۲)۔ اس وقت تو ان مختلف کڑوں میں آبادیاں (جیسی شکل میں بھی وہ ہیں) الگ الگ ہیں لیکن جب خدا کے قانونِ مشیت کا کف اضافہ ہوگا تو یہ آبادیاں آپس میں مل جائیں گی۔ انسان نے آسمانی کڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ابھی ابتدا کی ہے۔ کیا معلوم کہ اس کے بعد یہ جن کڑوں سے رابطہ قائم کرے ان میں زندگی موجود ہو۔ یہ رابطہ کس طرح خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق قائم ہوتا ہے، اس کے متعلق پوچھئے ان خلا نوردوں سے، جو چاند پر ہو آئے ہیں! یا جن کا آج بھی چاند سے رابطہ قائم ہے۔

سورہ حج کی پانچویں اور چھٹی آیت میں، إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کا مفہوم، نہایت حسین انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ اسے ہم نے ”مفہوم القرآن“ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان سے کہو کہ اگر تم مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں اس لئے شک و شبہات میں ہو کہ تمہیں ایسا ہونا بظاہر محال نظر آتا ہے، تو ذرا اس حقیقت پر غور کرو کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ (INORGANIC MATTER) سے کی۔ (اس میں پانی کے امتزاج سے زندگی کے اولین جراثیم کی نمود ہوئی) پھر یہ کاروانِ حیات، مختلف منازل طے کرتا، اس منزل میں آپہنچا جہاں، افزائشِ نسل بذریعہ تولید (PROCREATION) ہوتی ہے۔ رحمِ ماور میں حمل قرار پاتا ہے۔ پھر وہ ایک جنک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ان مراحل میں سے اس لئے گزرتا ہے کہ نطفہ میں جس قدر امکانات مضمر طور پر موجود تھے، وہ بتدریج نشوونما پاتے ہوئے ظہور میں آجائیں۔

وہ جنین، ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق، کچھ وقت کے لئے رحم کے اندر رہتا ہے۔ پھر تم ایک جینے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آ جاتے ہو۔ پھر رفتہ رفتہ اپنی جوانی کی حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ (۱۶/۷۰)۔ تم میں سے بعض جوانی کے عالم ہی میں انتقال کر جاتے ہیں اور بعض بوڑھے ہو کر، عسر کی نکتی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس

میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد پھر بے سمجھی کی طرف چلا جاتا ہے۔

یہ تو خود تمہارے اپنے تخلیقی مراحل کی مثال ہے۔ اس کے بعد تم اپنے سے باہر کی دنیا کی طرف دیکھو اور زمین کی حالت پر غور کرو۔ وہ کس طرح خشک اور ویران پڑی ہوئی ہے کہ اس میں زندگی اور نمو کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو وہ اچانک ہلہلانے لگتی ہے اور اس کی روئیدگی روز بروز ابھرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس زمین پر وہ سے خوشنما مناظر کی ایک دنیا ظہور میں آجاتی ہے۔

یہ سب اس لئے ہے کہ خدا کی ہستی بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس کا قانون بھی ہمیشہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے۔ وہ بے جان اشیاء کو جاندار بناتا ہے اس لئے مردوں کو زندگی عطا کر دینا اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں۔

(مفہوم القرآن صفحہ ۷۵۱ - ۷۵۲)

اور اس کے بعد ہے ذٰلِکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۲/۶۱)۔ یعنی یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

یہ ہیں وہ تقدیرات الہی (خدا کے مقرر کردہ پیمانے) جن کے مطابق چلنے کے لئے خارجی کائنات کی اشیاء مجبور ہیں لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو ان سے سرکشی اختیار کر لے۔ اس کا تو اسے اختیار ہے لیکن اس کا اسے اختیار نہیں کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھی اپنی مرضی کے مطابق برآمد کر لے۔ اس کے

تقدیرات الہی اعمال کے نتائج خدا ہی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوں گے۔ ان معانی میں خود انسان پر بھی خدا کے قانون مکافات کا کنٹرول ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ آیا ہے۔ یعنی ان آیات میں "اشیا" کہا گیا ہے۔ انسان نہیں کہا۔ اس سے یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ اشیائے کائنات تو خدا کے پیمانوں (قوانین) کے مطابق چلنے کے لئے مجبور ہیں

لیکن انسان مجبور نہیں۔ انسان کو خدا "تقدیرات" کی زنجیروں میں جکڑتا نہیں۔ اُسے صرف حکم دیتا ہے کہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ خدا کے اس حکم کو مانے یا اس سے سرتابی برتے۔ غالباً ہی وہ نکتہ ہے جسے ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال نے کہا ہے کہ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الہی کا ہے پابند



گیارھواں باب

ہدایت و ضلالت

آپ نے، جمعہ، عیدین اور نکاح کے خطبات، بلکہ ہر وعظ کے آغاز میں یہ الفاظ سنے ہونگے

مَنْ يَهْدِي اللَّهُ فَلَأ مُضِلَّ لَهُ دَ مَنْ يُضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ۔

اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

جس شخص کو خدا ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور جسے خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

آپ ان الفاظ کو اپنے ذہن میں رکھئے اور پھر حسب ذیل حقائق پر غور کیجئے۔

(۱) قصہ ہبوطِ آدم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح انسان کو مخاطب کر کے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ

مِنْهُ هُدًى فَمَنْ تَبَعَ هَذَاى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ہ
ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آتی رہیں گی۔ جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اُولَٰئِكَ اَمْحَجَ النَّارُ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲۸-۲۹)۔ اور جو لوگ ہمارے قوانین سے انکار کریں گے اور انکی تکذیب کریں گے، وہ جہنم میں جائیں گے اور وہیں رہیں گے۔

(۲) خدا نے اپنے اس وعدے مطابق 'نوع انسان کی طرف انبیاء کرام کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا اور دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول بھیجے جو ان تک خدا کی ہدایت پہنچاتے تھے۔
(۳) وہ انبیاء انسانوں تک خدا کی وحی پہنچاتے تھے اور ان سے کہہ دیتے کہ یہ حق و صداقت پر مبنی تعلیم تم تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفَرْ (۱۸/۲۹)

تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔
یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے لیکن اتنا سمجھ لو کہ جو شخص اس راہ نمائی کا اتباع کریگا، وہ خوف و حزن سے مامون رہے گا۔ جو اس کے خلاف چلے گا، تباہ و برباد ہو جائے گا۔

آپ ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر ان الفاظ کو دوبارہ سامنے لائیے جن سے اس باب کا آغاز کیا گیا ہے اور سوچئے کہ اگر بات یہی ہو کہ "جسے خدا ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا" تو پھر یہ تمام سلسلہ رشد و ہدایت، انبیاء کرام کی بعثت، نزول وحی، تبلیغ رسالت، اور جزا و سزا سے متعلق قانون مکافات، بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیا آپ سوچ بھی سکتے ہیں کہ ایک طرف تو خدا یہ کہے کہ "حق و صداقت پر مبنی تعلیم تمہارے پاس پہنچ چکی ہے۔ اب تم میں سے جو چاہے اسے قبول کر لے، جو چاہے اس سے انکار کر دے" اور دوسری طرف وہی خدا یہ بھی کہے کہ "جسے ہم راہ راست پر لے آئیں اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے ہم گمراہ کر دیں اسے کوئی صحیح راستے پر نہیں لاسکتا۔" خدا کی شان تو بہت بلند و بالا ہے، کوئی عام عقل و فکر کا انسان بھی اس قسم کی متضاد باتیں نہیں کرے گا۔

لیکن چونکہ یہ الفاظ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ فَلَا يُضِلُّهُ لَهُ وَمَنْ يُضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ (مفہوم کے اعتبار سے، قرآن کریم ہی کے بعض مقامات سے اخذ کردہ ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان کے صحیح مفہوم کے لئے قرآن ہی کی طرف رجوع کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ خدا، وحی راست آخرت پر ایمان، ہدایت و ضلالت کی بنیادوں پر مبنی ہے، لہذا ضروری ہے کہ اس کا قرآنی مفہوم ہمارے سامنے آجائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قصہ بہبوط آدم میں یہ کہا گیا ہے کہ فَاِمَّا يَنْتَشِرُكُمْ وَاِنِّي هَدِي
(۲/۳۸)۔ تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان سے کہہ دیا گیا
تھا کہ کائنات کے طبعی قوانین کا علم تو تم (مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے) خود حاصل کر لو گے، لیکن جہاننگ
ہماری انسانی زندگی کا تعلق ہے، اس کی راہ نمائی کے لئے قوانین و اقدار، نہ تو کوئی انسان اپنے ذہن
سے وضع کر سکے گا اور نہ ہی، خدا کی طرف سے عطا کردہ
سرچشمہ ہدایت خدا ہی ہے | وحی کے علاوہ کہیں اور سے پاسکے گا۔ اس حقیقت کو قرآن

کریم نے متعدد مقامات پر واضح کیا ہے مثلاً

(۱) سورۃ طہ میں ہے۔ رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ
(۲۰/۵۰)۔ ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اسے (اس کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے)
ہدایت (راہ نمائی) دی۔

(۲) سورۃ الاعلیٰ میں، خدا کے تخلیقی پروگرام کے چار مدارج بتائے گئے ہیں۔ الَّذِي خَلَقَ
فَسَوَّاهُ ۖ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۖ (۲۱-۲۲/۸۷)۔ خدا نے ہر شے کی تخلیق کی ابتدا
کی۔ پھر اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے اس میں مناسب و توازن پیدا کیا۔ پھر اس کے لئے
پیمانے (قوانین) مقرر کئے اور ان کی طرف ان کی راہ نمائی کر دی (انہیں ان قوانین کا علم دے دیا۔ اس کو
ہدایت کہتے ہیں)۔

(۳) سورۃ التلیل میں ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ (۹۲/۱۲)۔ یقیناً ہدایت دینا
ہماری ذمہ داری ہے۔

(۴) سورۃ آل عمران میں ہے۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدٰى اللّٰهِ (۳/۷۲)۔ ان
سے کہہ دو کہ ہدایت وہی ہدایت ہے جو خدا کی طرف سے ملے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہدایت کسی
کو اس کی منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ صحیح راہ نمائی صرف خدا کی طرف سے مل سکتی ہے۔ (نیز
۶/۱۲۱ تا ۶/۱۲۲)۔

اب آگے بڑھئے۔ اشیائے کائنات کے اندر خدا کی یہ ہدایت از خود موجود ہوتی ہے۔ یعنی ان کی
طرف، کہیں خارج سے راہ نمائی نہیں بھیجی جاتی۔ ہر شے کے اندر یہ راہ نمائی موجود ہوتی ہے کہ اسے

رسولوں کی وحی سے ہدایت

انسانوں تک پہنچائی جاتی تھی

کس پنج کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے۔ (تفصیل ان امور کی پہلے گزر چکی ہے) لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، یہ راہ نمائی ان کے اندر از خود موجود نہیں ہوتی۔ اس کے لئے پروردگار یہ تھا کہ خدا کی

طرف سے یہ راہ نمائی، بذریعہ وحی، رسول کو دی جاتی تھی اور رسول اسے دوسرے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ سورۃ النساء میں، مختلف رسولوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ انہیں اس لئے بھیجا گیا تھا۔ لَعَلَّكُمْ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ مِّمَّا بَعَثَ الْفَرَسَ (۳/۱۶۵)۔ تاکہ لوگوں کو خدا کے خلاف یہ حجت نہ رہے کہ اس نے ہمیں بتایا ہی نہیں تھا کہ صحیح راستہ کونسا ہے، اس لئے اگر ہم غلط راستوں پر چلتے رہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ اَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝ (۳۹/۵۷)۔ یا لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اگر اللہ ہمیں راہ نمائی دیتا تو ہم بھی متقین میں سے ہوتے۔ رسول بھیجے ہی اس غرض کے لئے جلتے تھے۔ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (۳۲/۳)۔ تاکہ لوگ صحیح راستے پر چلیں۔ وَ يَكُنْ قَوْلُ هَٰذَا ۝ (۱۳/۷۵)۔ یہ، ہدایت دینے والے، رسول دنیا کی ہر قوم میں بھیجے گئے تھے۔

رسول بھیجا جاتا تھا اور اس سے کہا جاتا تھا کہ بَشِّرْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ مِّنَّا (۵/۶۷)۔ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا جاتا ہے، اسے لوگوں تک پہنچا دے۔ ”جو کچھ خدا کی طرف سے نازل کیا جاتا تھا“ اُسے اس رسول کی کتاب کہا جاتا ہے۔ لہذا، خدا کی ہدایت، لوگوں کو اس کتاب کے ذریعے ملتی تھی جسے رسول ان تک پہنچاتا تھا۔ خدا کی آخری مکمل اور محفوظ کتاب، قرآن مجید ہے جس میں تمام اقوام عالم کے لئے ہدایت موجود ہے۔ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ بِرِضْوَانِهِ لِيُخْرِجَهُمُ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَ يَهْدِي لَهُمُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۵/۱۶)۔ خدا اپنی کتاب (قرآن مجید) کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ خدا، اس طرح اپنا ضابطہ ہدایت لوگوں تک پہنچا دیتا اور ان سے کہہ دیتا کہ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَنفُسِهِۦٓ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَفْضِلُ

عَلَيْهَا (۱۰/۱۰۸)۔ جو شخص اس سے راہ نمائی حاصل کر کے سیدھے راستے پر چلے گا، اس کا فائدہ خود اسی کو ہوگا۔ جو اس کے باوجود غلط راستے اختیار کرے گا، اس کا نقصان بھی اس کو ہوگا۔ (نیز ۳۹/۴۱)

یہاں سے ہم نے دیکھ لیا کہ خدا انسانوں کو ہدایت کس طرح سے دیتا ہے۔ یعنی،

(۱) خدا، رسولوں پر ہدایت بذریعہ وحی نازل کرتا تھا۔ اور

(۲) رسول اسے لوگوں تک پہنچا دیتے تھے اور ان سے کہہ دیتے تھے کہ جس کا جی چاہے اسے

اختیار کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

جہاں تک اس پروگرام کے پہلے حصے کا تعلق ہے — یعنی رسول کو بذریعہ وحی ہدایت ملنے کا تعلق، اس میں اس شخص کے جسے وحی دی جاتی تھی (یعنی رسول کے) اختیار و ارادہ کا کوئی دخل نہیں

ہوتا تھا۔ خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک نبوت جسے خدا چاہتا تھا دیتا تھا

تھا۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ (۲/۱۰۵)۔ اللہ، اپنی مشیت کے مطابق جسے چاہتا اس منصب جلیلہ کے لئے مختص کر لیتا۔ (نیز ۳/۴۳)۔ اللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ

رَسُولًا (۶/۱۲۵)۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ وہ تاج رسالت کس کے سر پر رکھے گا۔ اس میں، اس ہونے والے رسول کی سچی دکاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ نبوت، وہی شے تھی، اکتسابی نہیں یہ مشیت

خداوندی کے مطابق جسے ملتی تھی احساناً ملتی تھی نہ کہ معاوضہً وَلٰكِنْ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۱۱۲/۱۱)۔ خدا اپنی مشیت کے مطابق جسے مناسب سمجھتا تھا، اسے احساناً عطا کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ

جس ممتاز ہستی کے سپرد یہ ذمہ داری کی جانے والی ہوتی تھی، اسے اس کا علم و ادراک تک نہیں ہوتا تھا کہ اس کے لئے اس کا انتخاب ہونے والا ہے۔ نہ ہی وہ اس سے پہلے وحی اور نبوت کی کنہ و ماہیت

سے واقف ہوتا تھا۔ قرآن کریم میں خود رسول اللہ کے متعلق یہی کہا گیا ہے۔ (دیکھئے ۴۲/۵۲)۔

لہ نبوت خالصہ وہی ہے اور کسی کو اس کے کسب و کمز کی بدولت نہیں ملتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ انسان اپنی ریاضت اور اطاعت سے منزل بہ منزل درجہ نبوت تک پہنچ سکتا ہے، وہ نبوت کی کنہ و حقیقت سے بے خبر ہیں تفصیل ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں تک حضرات انبیائے کرام کا خدا سے ہدایت پانے کا تعلق ہے، اس کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح اور بنی برحیقت ہے کہ خدا جسے چاہتا اسے ہدایت دے دیتا اور جسے خدا کی طرف سے یہ ہدایت نہ ملتی اس کے لئے قطعاً ممکن نہ تھا کہ وہ کہیں اور سے اسے حاصل کر لیتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک نبی اس کا اعلان کرتا تھا۔ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۷۸/۶)۔ اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں بھی اپنی میں سے ہوتا جو غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔ اور جب نبی بھی اس کا اعتراف و اعلان کرتا تھا تو دوسرے انسان ایسا کیوں نہیں کہیں گے۔ انہیں بھی یونہی کہنا پڑے گا کہ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ۔ اگر خدا ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی سیدھی راہ اختیار نہ کر سکتے۔ اس نے یہ

ہدایت کیسے دی ہے، اس کی وضاحت اگلے چار لفظوں نے یوں کر دی کہ لَقَدْ جَاءَتْ

رُسُودُنَا بِبَيِّنَاتٍ بِالْحَقِّ (۷۸/۷)۔ خدا کے رسول

اپنا مبرا حق کو لے کر ہمارے پاس آگئے اور یوں

اس طرح خدا کی طرف سے انسانوں

کو ہدایت ملتی ہے

خدا کی ہدایت ہم تک پہنچ گئی۔ یعنی اگر خدا کی وحی انسانوں تک نہ پہنچتی تو وہ تاریکیوں میں بھٹکتے پھرتے اور انہیں معلوم ہی نہ ہو سکتا کہ منزل مقصود تک پہنچنے کا سیدھا راستہ کونسا ہے۔ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِی (۷۸/۷)۔ سیدھے راستے پر چلنے والا وہی ہے جو خدا کی عطا کردہ راہ نمائی کے اتباع میں سفر حیات طے کرتا ہے۔ یعنی اس کتاب کی پیروی کرتا ہے۔ دیکھئے سورہ زمر میں اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کہا کہ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا..... اللہ نے ایک کتاب نازل کی جس میں ایسی باتیں ہیں جن سے اچھی باتیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ اس کے بعد ہے۔ ذَلِكَ هُدًى لِلَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ۔ یہ ہے خدا کی وہ ہدایت جس سے وہ ہر اس شخص کو جو ایسا کرنا چاہے، سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ وَ مَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَسَاءَ مَا يَنْهَكُ مِنْ هَادٍ (۷۸/۲۳)۔ جو شخص اپنے آپ کو اس راہ نمائی سے محروم کرے، اُسے دنیا میں کوئی بھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتا۔ وحی کا بدل کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے صحیح مفہوم یہ کہنے کا کہ جسے خدا کی طرف سے راہ نمائی مل جائے وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ اور جو اس ہدایت کے

بجائے کوئی اور راستے اختیار کر لے تو وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ خدا کی یہ راہ نمائی اس کی کتاب میں درج ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کتاب سے یہ راہ نمائی ملتی کسے ہے اور اس سے محروم کون رہتے ہیں۔ ان امور کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے۔

ہدایت کون لوگ حاصل کر سکتے ہیں

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اشیائے کائنات کو مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی یہ ان کے اختیار ہی میں نہیں کہ جس راہ پر چلنے کی ہدایت انہیں دی گئی ہے، وہ اسے چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں لیکن انسان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ہدایت خداوندی کے مطابق سفر زندگی طے کرے اور چاہے اس سے انحراف کر کے اپنے لئے دوسری راہیں تلاش کر لے۔ اُسے خدا کی طرف سے ضابطہ ہدایت دے دیا گیا اور اس سے کہہ دیا کہ وہ عقل و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے، اس پر غور کرے۔ اگر اس کا قلب و دماغ مطمئن ہو کہ وہ ہدایت حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے، تو اسے اپنے لئے بطور ضابطہ حیات منتخب کر لے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ لہذا، خدا کی کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے، اولین شرط یہ ہے کہ انسان اصل کی صداقت پر علی وجہ البصیرت ایمان لائے۔ جو شخص اس ضابطہ کو سچا ہی نہیں مانتا وہ اس سے مستفید کیسے ہو سکتا ہے۔

اس ضابطہ حیات کو بطور قندیل راہ اپنے سامنے رکھنے کے بعد، انسان سفر حیات شروع کرے۔ اب یہ شمع ہدایت اسے زندگی کے ہر دور اپنے پر بتاتی جائے گی کہ اسے کس طرف مڑنا چاہیے۔ یہ اس کے سامنے کشاویں راہیں کھولتی جائے گی۔ یہ مطلب ہوگا، ایمان کے بعد، کتاب اللہ سے ہدایت (راہ نمائی) حاصل کرنے کا۔ اسی لئے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کرنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاٰيٰتِنَا نِهْمُ (۱۰/۹)۔ ان کا رب، ان کے ایمان کی وجہ سے، ان کے سامنے زندگی کی راہیں کشادہ کئے چلا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعلان، سورہ فاتحہ کے بعد، قرآن کریم کی ابتدا میں ان الفاظ میں کر دیا گیا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲/۲)۔

یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک و
ہُدٰی لِّلْمُتَّقِیْنَ پر ایک اعتراض

کام دیتی ہے۔ یہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔
 وہ تو پہلے ہی ہدایت پر ہیں۔ اسی لئے وہ متقی ہیں۔ یہ اعتراض متقی کا قرآنی مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے
 پیدا ہوتا ہے۔

جو شخص دنیا میں آیا ہے، اسے سفر حیات بہر حال طے کرنا ہے۔ بعض لوگ اس سفر کو یوں طے
 کرتے ہیں کہ نہ کوئی متعین منزل سامنے ہے نہ مقصود پیش نظر۔ انفرادی مفاد کی کشمکش انہیں آگے
 سے کھینچ رہی ہوتی ہے اور پست جذبات کی قوت محرکہ پیچھے سے دھکیل رہی۔ اس طرح وہ آنکھیں بند
مُتَّقِیْ کے معنی

یا نا ہموار۔ نہ اس کی فکر کہ آگے گڑھا ہے یا کنواں۔ دوسرے لوگ اس سفر کو یوں
 طے کرتے ہیں کہ ایک متعین منزل سامنے ہے اور ان کا ہر قدم اس کی طرف اٹھتا ہے اور وہ چاہتے ہیں
 کہ راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلیں۔ جو اس طرح راستہ طے کرنے کے آرزو مند ہوں انہیں
 مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ راہ نمائی کی ضرورت انہی لوگوں کو ہوگی، نہ کہ اول الذکر کو۔ لہذا،
ہُدٰی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضابطہ ہدایت ان لوگوں کی راہ نمائی کرتا ہے جو راستے کی خطرناک
 گھاٹیوں اور پُر خار وادیوں سے بچ کر چلنا چاہیں۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ جو لوگ، ضابطہ خداوندی کی صداقت پر علی وجہ البصیرت ایمان
 لائیں اور زندگی کے پُر از خطرات راستے کو محفوظ طریق پر طے کرنا چاہیں اس کتاب سے انہیں راہ نمائی
 ملتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم کے متعدد مقامات میں دہرایا گیا ہے، کیونکہ یہ راہ نمائی حاصل
 کرنے کی بنیادی شرائط ہیں۔ سورۃ انعام میں ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور اپنے ایمان کو ظلم کے
 ساتھ ملوث نہ ہونے دیں، تو انہیں راہ نمائی مل جاتی ہے (۶/۸۳)۔ سورۃ توبہ میں ہے کہ کسی قوم میں
 پیدا ہو کر اس کے ہاں کی مروجہ رسوم کو تقلیداً ادا کئے جانے سے جنہیں وہ قوم "نیک کام" شمار
 کرتی ہو، ہدایت نہیں مل جاتی۔ ہدایت اسے مل سکتی ہے جو خود ایمان لائے اور پھر ایسے کام کرے
 جنہیں یہ ضابطہ ہدایت "نیک" قرار دے۔ (۹/۲۰-۱۹)۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ خدا کی کتاب سے

ہدایت اس طرح ملتی ہے کہ جہاں کوئی اختلافی امور سامنے آئیں وہاں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں صحیح بات کون سی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی بات ہے (۲/۲۱۳)۔ اسی سُورت میں ذرا آگے چل کر کہا ہے کہ زندگی کے راستے میں جہاں تاریکی آجائے یہ کتاب وہاں قندیلِ راہ بن کر چلنے والوں کو محفوظ و مصُون آگے لے جاتی ہے (۲/۲۵۷)۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ مشکلات کا مقابلہ نہایت ثبات و استقامت سے کرتے ہیں، انہیں آگے بڑھنے کے لئے راہِ نمائی ملتی ہے۔ (۲/۱۵۶)۔ استقامت کے معنی یہ ہیں کہ راستے کی صعوبات خواہ کتنی ہی صبر آزما اور ہمت طلب کیوں نہ ہوں، انسان صحیح راہ کو کبھی نہ چھوڑے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "إِعْتَصَامٌ بِعَبْلِ اللَّهِ" (خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا) کہتے ہیں (۳/۱۰۱، ۳/۱۰۲، ۳/۱۰۵، ۴/۱۷۵)۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں، قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اعراض نہ برتا جائے۔ اس طرح انسان کے سامنے کشادگی رہیں گھلتی چلی جائیں گی (۴/۶۸-۶۶)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ہدایت، انسان کی اپنی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو سورہ عنکبوت میں چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جب کہا کہ
وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔
جو لوگ ہمارے باپ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے سامنے زندگی کی راہیں کشادہ کئے جاتے ہیں۔

اس

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى (۱۹/۷۶)

جو صحیح راستے پر چلتے ہیں، ان کے لئے راستے اور کشادہ ہوتے جاتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس ضمن میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۲) کون لوگ ہدایت حاصل نہیں کر سکتے

خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کے لئے منزل کا تعین کر دیا اور اس تک پہنچنے کے راستے کی

نشانہ ہی کر دی۔ اس راستے پر جہاں جہاں دورا رہا آیا، وہاں سائن پوسٹ لگا دیا کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ کونسی سمت کو۔ اگر کوئی شخص ان سائن پوسٹس کی طرف دیکھے ہی نہیں اور اگر انہیں پڑھے بھی تو ان سے بے رنجی برت کر، جدھر جی چاہے چل پڑھے، تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ (مثلاً)۔

(۱) سورۃ یونس میں ہے۔ اَفَاَنْتَ تَهْدِي اَلْعُمْيَ وَ تَوَكَّلُوْا لَا يُبْصِرُ ذُو

(۱۰/۲۳۱)۔ اے رسول! کیا تو ایسے شخص کی راہ نمائی کر سکتا

جو آنکھیں بند کر کے چلیں

ہے جو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر کے اندھا بن جائے؟

دوسری جگہ ہے کہ "اے رسول! تو نہ مردے کو سنا سکتا ہے اور نہ ہی ایسے بہرے کو جسے تو بلائے اور وہ پیٹھ پھیر کر چل دے۔ نہ ہی تو اندھے کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ تو تو اسے ہی سنا سکتا ہے جو تیری دعوت کو سچا سمجھے اور اس کے سامنے تسلیم خم کرنے کو تیار ہو۔ (۸۰ - ۸۱/۲۴)؛ (۵۲ - ۵۳/۳۰)۔ دوسرے مقام پر ہے کہ جو لوگ اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا کر بہرے بن جائیں، انہیں کس طرح بات سنائی جاسکتی ہے (۳۱/۴)۔ سورۃ فاطر میں ہے۔ نہ اندھا اور آنکھوں والا برا بڑھوسکتے ہیں اور نہ ہی تاریکی اور روشنی، نہ سایہ اور دھوپ ایک چھتے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی زندہ اور مردہ۔ اے رسول! تو مردوں کو قبر میں کچھ نہیں سنا سکتا۔ سنایا تو اسے ہی جاسکتا ہے جو سنا چاہے" (۱۹۱ - ۲۲/۳۵)۔

(۲) سورۃ نحل میں ہے۔ اِنْ تَخِرْصَنَّ عَلٰی هٰذَا هُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ

مَنْ يُّضِلُّ (۱۶/۲۴)۔ اے رسول! تیری لاکھ خواہش ہو، لیکن یہ لوگ صحیح راستہ اختیار نہیں کریں

گے۔ جو شخص خود ہی غلط راستے پر چلنا چاہے، اسے خدا کس طرح صحیح راستے پر لے آئے؟ دوسری

جگہ ہے کہ جو لوگ اس ضابطہ خداوندی کو سچا ہی نہ سمجھیں، انہیں خدا کس طرح سیدھا راستہ

دکھا دے۔ (۱۶/۱۰۴)۔ جو خود بھی اس ضابطہ کی صداقت سے انکار کریں اور دوسروں کو بھی اس طرف

آنے سے روکیں۔ (۴/۱۶۷)۔

(۳) جیسا کہ پہلے تفصیل سے بتایا جا چکا ہے، خدا نے انسان کو جس قدر قوتیں اور صلاحیتیں

عطا کی ہیں، اس میں جس قدر جذبات پیدا کئے ہیں یہ نہ فی ذاتہ نظر ہیں نہ خیر۔ یہ تو محض قوتیں ہیں۔

ان کا استعمال انہیں شریا خیر بنادیتا ہے۔ اگر قوت، مظلوم کا گلا گھونٹنے کے لئے استعمال کی جائے تو وہ شر ہے۔ اگر اسے ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صرف میں لایا جائے تو وہ خیر ہے۔ اگر انسانی

جوانے جذبات کو معبود بنالیں | جذبات کو مستقل اقدار کی حدود کے اندر رکھا جائے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے۔ اگر انہیں

سرکش و بے باک چھوڑ دیا جائے وہ تباہی پیدا کرتے ہیں۔ سورہ قصص میں ہے کہ "اے رسول! اگر یہ لوگ تیری دعوت پر ہتیک نہیں کہتے تو یہ اس لئے ہے کہ یہ اپنے پست جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں۔ تم سوچو کہ اس شخص سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے، جو خدائی راہنمائی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا جائے۔ ظالمین، خدا کی راہنمائی سے کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ (۲۸/۵۰)؛ (۱۲/۲۹)

(۴) یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنے جذبات کا اتباع کئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں (بلکہ نوع

انڈی تقلید کرنے والے | انسان کی اکثریت) کا یہ عالم ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے، ہانچیں بند کئے، دوسروں کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اب سوچو

کہ اگر اگلا آدمی غلط راستے پر چل رہا ہو تو اس کے مقلد (پیچھے چلنے والے) کس طرح سیدھے راستے پر چل سکیں گے۔ یہ بدترین قسم کی گمراہی ہے۔ سورہ انعام میں ہے کہ اگر تم اس قسم کے انبوا کا اتباع کرو گے تو وہ تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ یہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں (۱۱/۶۱)؛ (۱۲/۱۲)؛ (۵/۷۷)۔ جب تک یہ لوگ اس انڈی تقلید کی روش کو چھوڑ کر عقل و فکر سے کام نہیں لیں گے، غلط اور صحیح راستے میں تمیز نہیں کر سکیں گے۔

(۵) جن لوگوں کی روش یہ ہو کہ کبھی خدا کے تجویز کردہ راستے پر چل پڑیں اور کبھی کسی اور کے بتائے

ہوئے راستے پر، وہ منزل مقصود تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ اس روش کو قرآن کی **مشک** | اصطلاح میں مشرک کہتے ہیں اور اس کا نتیجہ صَلاٰ بَعِيْدًا (۲/۱۱۶) یعنی ایسا

شخص اپنی منزل مقصود سے بہت دُور چلا جاتا ہے۔

ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات کے فیصلے، خدا کی کتاب کے مطابق کرے یا کرائے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ زبان سے ایمان کا اقرار کیا جائے اور اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی (طاغوتی) ضوابط کی رو سے کئے جائیں تو اس سے بھی انسان صحیح منزل تک نہیں پہنچ

سکتا۔ (۴/۶۰۱)۔

مُنافق

(۶) کسی راستے کے متعلق یہ یقینِ کامل کہ وہ اسے منزلِ مقصود تک ضرور پہنچا دیگا ایمان کہلاتا ہے لیکن ایک شخص جسے راستے کی صحت پر یقین تو نہ ہو لیکن کسی خاص مصلحت کے تابع وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو لے جو صحیح راستے پر چل رہے ہوں، اور ہر قدم پر کوشش یہ کرے کہ جو نئی موقع ملے وہ کسی دوسری سمت کی طرف نکل جائے تو ایسا شخص منزلِ مقصود تک خاکِ پہنچے گا؛ قرآن کی اصطلاح میں اُسے مُنافِق کہتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کبھی راہِ راست پر نہیں آسکتے۔ (۱۲۲۱-۱۲/۱۴۳)۔

(۷) ہر پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے وہ نشوونما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے۔ اسے اس کا (PATTERN) کہہ لیجئے۔ جو پھل اپنے اس چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے

وہ پختگی تک نہیں پہنچ سکتا، گل سڑ جاتا ہے۔ پھل کا اس طرح اپنے قالب سے باہر نکل جانا فسق کہلاتا ہے، اور ایسا کرنے والا فاسق۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ

فسق

خُدائی راہ نمائی انہیں کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۱۰۸/۵)۔ اسے قرآن مجید نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ (مثلاً ۲/۲۴، ۹/۲۴، ۱۱/۲۴)۔ سورہ صف میں ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ ط جب یہ لوگ صحیح قالب کو چھوڑ کر ایک طرف کو نکل جاتے ہیں تو خدا کا قانونِ مکافات ان کے دلوں کا رُخ بھی اُسی طرف کو کر دیتا ہے اور اس کے بعد ہے وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۶۱/۵)۔

(۸) کسی پروگرام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ہر شے کو اس کے مقام پر رکھا جائے اگر کسی شے کو اس مقام پر نہ رکھا جائے جس پر اسے ہونا چاہیئے تو اُسے ظلم کہا جاتا ہے

اور ظاہر ہے کہ جس پروگرام میں یہ کیفیت ہو جائے وہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔

ظالمین

اس لئے خدا نے واضح کر دیا ہے کہ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۸)۔ ظالمین کے سامنے کشادگی راہیں واہ نہیں ہوتیں۔ اس حقیقت کا اعادہ قرآن کریم کے بے شمار مقامات میں کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم قرآن کریم کی اس آیہ جلیلہ کو سامنے لاتے ہیں جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے

کہ خدا کسے ہدایت نہیں دیتا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَ
شَهِدُوا أَنَّا الرُّسُلُ حَقٌّ وَقَدْ جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (۳/۸۵)۔

(بھلا سوچو کہ) خدا اس قوم کو کس طرح ہدایت دے دے گا جو ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی روش اختیار کر لے۔ دراصل ایکہ اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھا کہ اس کا رسول حق پر ہے اور ان کی طرف خدا کی کھلی کھلی تعلیم آگئی تھی۔ یاد رکھو! خدا اس قسم کی ظالم قوم کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف بھی نہیں کیا کرتا۔

اس ضمن میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ — ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ جب خدا یہ کہتا ہے کہ ایسی قوم کو کس طرح ہدایت مل سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم ابدی طور پر (ہمیشہ کے لئے) راندہ درگاہ ہو گئی ہے۔ اب وہ کبھی راہ راست پر نہیں سکتی۔ نہیں، اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ قوم اپنی موجودہ روش پر چلتی رہے گی اور اس روش کو صحیح سمجھتی رہے گی، اس وقت تک وہ راہ راست پر نہیں آسکیگی۔ جس وقت بھی اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ جس راستے پر وہ چل رہی ہے، وہ اسے تباہیوں کے غار میں دھکیل دے گا، اس میں صحیح راستے کی طرف مڑنے کا امکان روشن ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو رسول اللہ سے کہا گیا کہ اگرچہ دنیاوی مفاد کی چمک نے ان لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور وہ غلط راستے پر اندھا دھند چلے جا رہے ہیں، لیکن ذِکْرُ بَہِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ قَصِي (۶/۷۰)۔ تو قرآن کے ذریعے، انہیں اس امر کی یاد دہانی کرائے جا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں تباہیوں کی طرف لے جائے گا، تاکہ کوئی شخص اپنی غلط روش کی بنا پر اس لئے تباہ نہ ہو جائے کہ اسے صحیح راستہ کی طرف دعوت دینے والا کوئی نہ تھا۔ ہدایت اور ضلالت کے سلسلہ میں یہ آیت بڑی واضح ہے۔

اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور ایک اور اہم عنوان کی طرف آتے ہیں۔

(۳) خَتَمَ اللہُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ

(خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی)

یہ اور اسی قسم کی دیگر آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے، حسب ذیل امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ہدایت حاصل کرنے (خدائی رہنمائی سے مستفید ہونے) کے لئے ضروری ہے کہ انسان، پیش نظر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ حقائق کو عقل و بصیرت کی روش سے سمجھنے کی کوشش کرے۔ موافق اور مخالف دلائل کے وزن کا صحیح صحیح اندازہ کرے۔ آنکھوں پر سے پٹی اتار کر دیکھے کہ جس راستے پر وہ چلا جا رہا ہے، وہ اسے کس منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ ایسے شخص کے لئے تو اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ وہ غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کر لے۔ لیکن جو شخص عقل و فکر سے کام ہی نہ لینا چاہے، آنکھیں بند کئے اپنے راستے پر اندھا دھند چلا جائے، جو شخص اس سے کہے کہ یہ راہ غلط ہے، یا تو اس کی بات ہی نہ سنے، سنی کو ان سنی کر دے۔ یا اسے سخت و بکتر سے جھٹکے۔ تو ایسے شخص کو نہ تو خدا کی ہدایت کچھ فائدہ دے سکتی ہے اور نہ ہی اس ہدایت کی طرف دعوت دینے والے کی آواز اس کے لئے سودمند ہو سکتی ہے۔ صحیح مشورہ سے مستفید ہونے کے لئے دل کی آمادگی (RECEPTIVE MIND) بنیادی شرط ہے۔

(۲) ”جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے“ اس کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔ ”قرآن کریم اس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے مختلف انداز اختیار کرتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ جو اس طرح آنکھیں بند کر لے، وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کہتا ہے کہ جو یوں آنکھیں بند کر لے، خدا اسے اندھا کر دیتا ہے۔ اور کبھی یوں کہ جسے خدا اس طرح اندھا کر دے اسے کون روشنی دے سکتا ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے۔ اس کے اظہار کے مختلف انداز ہیں۔ (تفصیل اس اجمال کی پہلے بھی گزر چکی ہے)۔ یعنی ہر نتیجہ ہوتا تو ہے انسان کے اپنے اعمال کا، لیکن چونکہ ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی روش سے مرتب ہوتا ہے اس لئے خدا سے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص

آگ میں انگلی ڈال دے، اس کی انگلی جل جاتی ہے۔ کبھی یوں کہ آگ اس کی انگلی جلا دیتی ہے۔ کبھی یوں کہ ایسا شخص اپنی انگلی آپ جلا لیتا ہے اور کبھی یوں کہ خدا اس کی انگلی جلا دیتا ہے۔ جہاں اس (آخری) انداز کے مطابق بات کی گئی ہو، وہاں اس کا مفہوم یہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا (کا قانونِ مکافات) ایسا کر دیتا ہے۔ اس سے بات واضح ہو جائے گی اور کوئی الجھن باقی نہیں رہے گی۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد وہ آیات لیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ (خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے) یا اس جیسی دیگر آیات۔

(۱۱) سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ؕ اَمْذَنُ تَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ **کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیا گیا ہے!** وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ ۚ وَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ ۚ غَشَاوَةٌ ۚ وَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۶۱۵-۶۱۷)۔ خدا نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر

مہر لگا دی ہیں۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہیں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ اس ترجمہ سے ذہنوں میں جو شکوک ابھرتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ لیکن یہ اُسی قسم کے شکوک ہیں جو هٰذَا الَّذِیْ لَمْ یُتَّقِیْنَ کے غلط مفہوم سے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی وضاحت سابقہ عنوان میں کی جا چکی ہے۔ وہاں، یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جو پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر یہ کتاب صرف متقیوں کو راہ نمائی دیتی ہے تو غیر متقی کہاں سے ہدایت حاصل کریں؟ اور زیرِ نظر آیت سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر غیر مسلموں کے لئے برابر ہے خواہ انہیں تبلیغ کی جائے یا نہ کی جائے، تو پھر تبلیغ فائدہ کن لوگوں کو دے گی؟ اور غیر مسلم، اس لئے ہدایت نہیں حاصل کر سکیں گے کہ خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ یعنی خدا نے ان کی دیکھنے بھانپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی ہیں۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر ان کا کیا قصور ہے جو وہ راہِ راست پر نہیں آتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں سخت عذاب

دیا جائے گا۔ یہ عذاب کس جرم کی پاداش میں دیا جائے گا؟ پہلے ان پر ہدایت کی راہیں بند کر دیں اور پھر انہیں اس جرم کی پاداش میں عذابِ عظیم میں مبتلا کر دیا کہ تم صحیح راستے پر کیوں نہیں چلے تھے! آپ نے غور فرمایا کہ ان آیات کے غلط مفہوم سے بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو ہدایت نامہ (GUIDE BOOK) کہا ہے اور اس کے شروع ہی میں یہ بتا دیا ہے کہ اس سے کون لوگ ہدایت (راہنمائی) حاصل کر سکیں گے۔

(ا) وہ لوگ جو راستے کی پُر خطر گھاٹیوں سے محفوظ رہ کر منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہیں۔ یہ لوگ، عقل و فکر سے کام لے کر اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ اس کتابِ ہدایت میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ صداقت پر مبنی ہے۔ اس "ایمان" کے بعد وہ اس کتاب کی راہ نمائی میں سفر حیات پر گامزن ہوتے ہیں۔ اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّنَّا سَبِّحْهُمُ وَ اُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲/۵-۲)۔

(ب) لیکن جو لوگ شروع ہی سے یہ طے کر لیں کہ ہم نے چلنا اپنے ہی راستے پر ہے۔ کوئی لاکھ کچھ کہے، ہم نے نہ اس کی سُننی ہے، نہ ماننی۔ اسے یہ کتاب کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ جو شخص آنکھیں بند کر کے چلے، اس کے لئے یکساں ہے چاہے سڑک پر بجلی کے قمتے روشن ہوں یا گھپ اندھیرا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو "صحیح راستہ بتانے والی کتاب کو پھینک کر غلط راستے بتانے والی کتابیں خرید لیتے ہیں" (۲/۱۶)۔ اور اس کے بعد، "صَحُّكُمْ عُنًى" (۲/۱۸)۔ بہرے گونگے اندھے بن کر غلط راہوں پر چلے جاتے ہیں۔ اور کوئی مشفق راہ نما انہیں لاکھ آوازیں دے کہ تم غلط راستے پر جا رہے ہو (یہ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ فَهَمْ لَوْ يَرْجِعُونَ ۵ (۲/۱۸)۔ ایسے لوگوں کی مثال، بھیڑیوں کی سی ہے کہ جس طرف اگلی بھیڑ جا رہی ہے بھلی بھیڑیں آنکھیں بند کئے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں ہیں، بغیر یہ پوچھے یا سمجھے کہ وہ کدھر جا رہی ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے کیوں چل رہے ہیں۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتابِ ہدایت کو دیکھو، سمجھو، سوچو اور پھر راستے کا انتخاب کرو، تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بَلْ نَحْنَعُمَا اَلْفَيْنَا عَلَیْهِ اَبَاؤُنَا۔" جس راستے پر ہمارے اسلاف (باپ، دادا) چلتے رہے ہیں ہم اُسی راہ پر چلتے جائیں گے کہ یہی سلامتی کی راہ ہے۔" قرآن کہتا ہے کہ یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے خواہ ان کے اسلاف، عقل و فکر سے عاری اور غلط راستے پر گامزن ہی کیوں نہ

رہے ہوں (۲/۱۶۰)۔ ان کی مثال بھیڑوں کے گلے کی سی ہے کہ چر دہا جو آوازیں دیئے جائے گا، یہ اونڈھی ڈالے اس پر چلتے جائیں گے۔ ”صَمُّ مَبْكُمُ، عُمَىٰ فَهَمْ لَا يَعْقِلُونَ“ (۲/۱۶۱)۔ اندھے بہرے، گونگے، عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔

یہ ہیں وہ لوگ جن کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور جن کے لئے برابر ہے چاہے انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کر دیا نہ کرو۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ”وَ اِنْ تَذَعُوهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا“ وَ تَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۴/۱۹۸) تم انہیں لاکھ آوازیں دو، یہ ایک نہیں سنیں گے۔ اور اگر تمہارا ان سے کہیں آمنا سامنا ہو جائے، تو انکی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ تک تو رہے ہوں گے تمہاری طرف، لیکن دھیان ان کا ہوگا کہیں اور سوچو، کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے، دعوت و تبلیغ سے کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ”سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُنْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُونَ“ (۴/۱۹۳)۔

(۲) ان کی حالت یہ ہے کہ ایک دفعہ جب منہ سے نہ نکل گئی، تو پھر لاکھ سر پیٹھو، یہ کبھی ہاں نہیں کریں گے۔ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے۔ ”فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كُنَّا نُبَيِّنُ مِنْ قَبْلُ“ (۱۰/۷۴)۔ اور اس کے بعد کہا۔ ”كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ“ (۱۰/۷۴)۔ اس طرح ہم، اس قسم کے حد و فراموش لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیا کرتے ہیں۔ یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ”قُلُوْبُنَا غُلْفٌ“۔ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ تمہاری باتوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ”بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ رِكْفًا هَهِ“ (۴/۱۵۵)۔ ان کے دل غلافوں میں نہیں بلکہ، انکی اس ذہنیت کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں، اس لئے، جب تک یہ اس روش کو نہیں چھوڑتے، ان کے صحیح راستے کی طرف آنے کا کوئی امکان نہیں۔

(۳) بعض لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان سے کوئی بات کرو تو وہ کسی دلیل اور برہان کی بنا پر اس کی مخالفت نہیں کرتے، بس، بلا دلیل و حجت، یونہی مخالفت کئے چلے جاتے ہیں اور دوسرے کی ایک نہیں سنتے۔ ”وَالَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتَمُّهُمْ“ اس کے بعد ہے ”كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبٍ مُّتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ“ (۴/۲۵)۔ یہ وہ نخوت و تکبر کے پتلے ہیں، جن کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ تکبر کا یہ عالم کہ عقل میں بھی

ہیں داعی الخیر (صحیح راستے کی طرف دعوت دینے والا) بات سمجھا رہا ہے لیکن یہ بیٹھے کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں۔ جب محفل درخواست ہوتی ہے اور لوگ باہر نکلتے ہیں تو یہ دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ یہ شخص کیا کہہ رہا تھا؟ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا مہریں لگا دیتا ہے۔ وَاسْتَبَعُواْ اَهْوَاءَهُمْ (۱۴۱/۴)۔ اس لئے کہ یہ اپنے جذبات کے نشے میں بہمست، آنکھیں بند کئے چلتے رہتے ہیں۔ اور نوح کا یہ عالم کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا اس کی ہنسی اڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيرُ الْاَوَّلٰیْنَ۔ یہ وہی پرانے قصے کہانیاں ہیں جسے یہ بیٹھا دہراتا رہتا ہے۔ کہاں کا عذاب اور کیسی تباہی! یہ ہیں وہ جن کے متعلق کہا کہ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَفْقَهُوْهُ دَیْنٰۤی اِذَا رَٰیہُمْ دَٰخِرًا ۝ (۶/۲۵)۔ ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں کہ یہ کچھ سمجھ سونچ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں جس سے صحیح بات ان کے کانوں کے اندر جا ہی نہیں سکتی۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان سے ان کی خیر خواہی کی بات کرو تو یہ منہ موڑ کر چل دیتے ہیں اور بڑی رعونت سے کہتے ہیں کہ ہم سے یہ باتیں کرنے کا کچھ نتیجہ نہیں۔ قُلُوْبُنَا رِیۡۤیۡۤ اَکِنَّۃً مِّمَّا تَدْعُوْنَۤ اِلَیْہِ دَیْنٰۤی اِذَا رَٰیۡنَا دَٰخِرًا ۝ وَ مِنْۢ بَیۡنِنَا وَ بَیۡنَکَ حِجَابٌ۔ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان ایسا دبیز پردہ ہے جس کے آ رہا کوئی بات نہیں جاسکتی۔ فَاَعْمَلْ اِنۡنَا عَلٰیۡکُمْ ۝ (۴/۵)۔ تم اپنا کام کئے جاؤ۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ تم خواہ مخواہ ہماری ہمدردی میں کیوں گھلے جا رہے ہو۔ جب تباہی آئے گی تو ہم خود بھگت لیں گے! کہا کہ جو شخص خیر خواہی کی باتوں سے یوں اعراض برت لے، بے رخی اختیار کر لے اور اس کی قطعاً پروا نہ کرے کہ اس کے غلط اعمال کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا، وہ راہِ راست پر کیسے آسکتا ہے اس کے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور اس کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں۔ (۱۸/۵۷)۔ یہ لوگ، حق کی دعوت کی طرف سے اعراض ہی نہیں برتتے بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ دھوکے باز ہیں۔ ان کے فریب نہ آجانا۔ کَذٰلِکَ یُطَبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیۡنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۵۸۱-۵۸۲)۔ یوں ان لوگوں کے دلوں پر جو علم و عقل سے کام نہیں لیتے، خدا مہریں لگا دیتا ہے۔ اس طرح

ان لوگوں کے اور قرآن کے درمیان ایک غیر مرئی، غیر محسوس پردہ حائل ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ (۴۵۶ - ۱۴/۴۶)

(۴) یہ تو ان لوگوں کی حالت کا بیان تھا جو سکر سے صداقت کا اقرار ہی نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ، وہ لوگ بھی ہیں جو زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن جب اس کے مطابق کام کرنا وقت آتا ہے تو گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ (انہیں قرآن کی اصطلاح میں منافقین کہا جاتا ہے۔) سورۃ توبہ میں ہے کہ جب ان لوگوں کو میدان جنگ منافقین کے دلوں پر مہر لگا دیا جائے (قتال فی سبیل اللہ) کے لئے کہا جاتا ہے تو یہ عجیب بہانوں سے چھپے رہ جانے کی اجازت طلب کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ ذَٰطَبَعٍ ۚ اَللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۹۳/۹ - ۸۶ - ۹۸/۹ - ۲۰ - ۲۳/۲۴)۔

یاد رہے کہ یہ صرف اسلام کے صدرِ اوّل ہی کی بات نہیں کہ اُس وقت منافقین کا کوئی خاص گروہ تھا جس کی بابت یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ جس دعوے کی صداقت کا ثبوت، انسان کی سیرت و کردار سے نہیں ملتا، وہ دعوے ایمان نہیں کہلا سکتا۔ زبان سے اس کا اقرار کرنے والے اور عمل سے اس کی تکذیب کرنے والے، منافق ہیں، خواہ وہ کسی زمانے میں ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایتِ خداوندی کا اتباع کرنے کے بجائے، اپنے جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف اس دنیاوی زندگی کے مفاوہ ہوتے ہیں۔ آخرت پر ان کا ایمان ہوتا ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اَفْزَعُ عَیْنَتْ مِّنْ اَتَّخَذَ الْاِلٰهُ هَٰؤُلَاءِ کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خود اپنے جذبات (پست خواہشات) ہی کو اپنا خدا بنالیا۔ ذَٰ اَضَلُّهُ ۙ اَللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ - یہ وہ لوگ ہیں جو علم و عقل رکھنے کے باوجود تباہ ہو جاتے ہیں۔ ذَٰ خَلَمَ عَلٰی سَنَدِیْہِ وَ قَلْبِہِ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِہِ غِشْوَةً - جذبات کے نشے میں مدہوش ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل پر اور کانوں پر مہر لگ جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنْ یَّهْدِیْہِ مَنْ یُّعْبِدِ ۙ اَللّٰہِ (۵۵/۳۳) - کہو کہ جو شخص ہدایتِ خداوندی سے اس طرح منہ موڑ کر غلط راستوں پر چل نکلے، اسے کون راہِ راست پر لاسکتا ہے! یہ لوگ دنیاوی زندگی کے مفادات ہی کو اپنا مطلوب و منتهی قرار دے لیتے ہیں اور مستقبل کی

طرف سے یکسر آنکھیں بند کر لیتے ہیں دنیاوی زندگی کے جھوٹے نگوں کی صنّاعی ان کی نگاہوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دیتی ہے کہ یہ پھر کچھ دیکھ سکے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ یوں ان کے دلوں، کالوں اور آنکھوں پر مہر لگ جاتی ہیں۔ (۱۰۶-۱۰۸/۱۶)۔

(۵) سورۃ یٰسّٰس میں ہے۔ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ..... لَا يُؤْمِنُونَ ۵ (۱۰۶-۱۰۸/۱۶)۔

ان آیات کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

ان میں سے بہتوں پر خدا کی بات پوری ہو گئی، یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور وہ ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں جن سے ان کے سراپے پر اٹھتے رہ جاتے ہیں۔ اور ہم نے ان کے سامنے بھی رک رکھ دی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور ان کے اوپر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لہذا، ان کے لئے برابر ہے چاہے لوڈا ان کو یا نہ ڈالے ان کو یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

ان آیات میں سے باقی حصّہ کی وضاحت تو پہلے ہو چکی ہے، اس لئے ان کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن پہلی آیت (لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ) کے متعلق یہ کہہ کر بہت بڑا شبہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ دیکھئے! یہاں کہا گیا ہے کہ ان کی بات خدا کی بات پوری ہو گئی کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ان کے متعلق (ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی) یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، لہذا وہ بات پوری ہو گئی۔ یہ ایمان نہیں لائے، نہ ہی یہ ایمان لائیں گے۔ ”ایمان لانا ان کے مقدّر میں ہی نہیں۔“

یہ اسی عقیدہ جبر کا پیدا کردہ تصور ہے جس سے اس قسم کے شکوک ابھرتے ہیں، ورنہ بات بالکل واضح ہے۔ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیں گے، ان پر حقیقت مشتبہ رہے گی، لہذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وَ يَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۵ (۱۰۶/۱۰۷)۔ ”جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ البتہ (CONFUSION) میں رہتے ہیں۔“ یہ لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے، اس لئے خدا کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ان کی حالت، خدا کے اس قانون کی صداقت کی زندہ شہادت ہے

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ - یوں خدا کی بات (اس کا قانون) سچا ثابت ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ لہذا ایسے لوگوں کو تذکر و تنذیر کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ اِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ (۳۶/۱۱)۔ تذکر و تنذیر تو اسے فائدہ دے سکتی ہے جو خدا کی نصیحت (ہدایت) کی پیروی کرتا ہے اور انسانی اعمال کے ان نادیدہ نتائج سے ڈرتا ہے جو خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوتے ہیں۔

یہی اندازِ بیان سورۃ اعراف کی آیت (۷/۱۷۹) میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس آیت کا پہلا حصہ یہ ہے۔

جہنم کے لئے پیدا کیا ہے | **وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ**

وَالْإِنسِ۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا۔ یقیناً ہم نے جہنم کے جن و انس کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس ترجمہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے انہیں پیدا ہی جہنم کے لئے کیا ہے تو یہ اپنے مقدر کو بدل کر نیک کیسے بن سکتے ہیں؛ لیکن جب ہم آیت کے باقی حصہ کو دیکھتے ہیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے لَّهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَ لَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْإِنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷/۱۷۹)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ یہ اپنے مقام اور مقصدِ حیات سے غافل رہتے ہیں۔ مطلب واضح ہے کہ جو لوگ دیکھنے، سننے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود اندھے بہرے، گونگے بنے رہتے اور بلا سوچے سمجھے غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں ان کی یہ روش زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ یہ لوگ سیدھے جہنم میں جائیں گے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ ہیں ہی جہنمی۔ اسی مفہوم کو قرآن نے دوسرے مقام پر یوں واضح کیا ہے کہ جب اس قسم کے لوگ جہنم میں داخل ہونگے

لے جن و انس سے مراد شہری آبادیاں اور غار بدوشوں کی صحرائی آبادیاں ہیں۔ تفصیل کے لئے میری کتاب "ایسٹ آدم یا لغات القرآن" دیکھئے۔

تو وہاں کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جو تم جہنم میں داخل کئے جا رہے ہو؟ تمہارا جرم کیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ زیادہ تفصیل میں کیا جائیں۔ **لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ** (۱۰/۶۷)۔ جو لوگ ہمیں غلط روش پر چلنے کے عواقب سے متنبہ کرتے تھے اگر ہم ان کی بات سنتے یا عقل و فکر سے کام لیتے تو کبھی اہل جہنم میں سے نہ ہوتے۔ لہذا جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ جہنم کے کندے ہیں۔ یہی ہیں جن کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہیں۔ سورہ محمد میں ہے۔ **أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا** (۲۴/۴۷)۔ کیا یہ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ ضمناً اس آیت میں **أَقْفَالُهَا** کی ہا بڑی معنی خیز ہے جس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے دلوں پر کہیں خارج سے تالے نہیں ڈالے گئے۔ ان کے دلوں ان کے دل اپنے تالے اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں نے خود اپنے تالے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں۔ دل اپنے اوپر خود ہی تالے ڈال لیتا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو ان تالوں کو کوئی بیرونی طاقت کیسے کھول سکتی ہے۔ انہیں اسے خود ہی کھولنا ہو گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص اپنے کمرے میں بیٹھا ہے اور اس نے اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے۔ خود ہی کنڈی لگا رکھی ہے اور خود ہی روتا ہے کہ میں باہر کیسے نکلوں؟ اس سے کہا جائے گا کہ میاں! تم نے خود ہی اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے۔ اسے تم خود ہی کھول سکتے ہو۔ باہر سے تمہاری مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ کنڈی کھولو اور باہر نکل آؤ۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ **فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ** (۵/۶۱ نیز ۹/۵۱ و ۹/۲۷)۔ جب انہوں نے ٹیڑھی روش اختیار کر لی تو خدا (کے قانون مکافات) نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ جب انہوں نے دروازہ بند کر لیا تو باہر نکلنے کا راستہ ان پر مسدود ہو گیا۔

اپنے اعمال ہی ننگ بن جاتے ہیں اور اس باب میں حرف آخر سورہ التطفیف کی وہ آیت جلیلہ ہے جس نے ختمہ اللہ علیٰ قلوبہم کے

نکتے کو واضح گاف کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

كَلَّا بَلْ نَرَانِ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۱۳/۱۳)۔

نہیں! بات یوں نہیں جس طرح یہ لوگ سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کے اپنے اعمال ہی

ان کے دلوں پر زنگ بن کر جم جاتے ہیں۔
دلوں پر جو مہر بن گئی ہیں وہ انسان کے اپنے ہی غلط اعمال ہوتے ہیں۔



(۴۱) مِزْنَاءَ قُلُوبِهِمْ وَمِزْنَاءَ فُلُكِهِمْ

جس کا جی چاہے ایمان لائے جب کا جی چاہے اس سے انکار کر دے
انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق اس سے پہلے ایک الگ باب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے لیکن
ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے اسے
خصوصیت سے سامنے لے آئیں تاکہ اس باب میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

(۱) قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ

لَا إِلَهَ إِلَّا فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ
فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمَرْ بِإِلَهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقَىٰ ۚ لَا انفصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط راستے نکلے اور ابھر کر الگ
الگ ہو کر سامنے آچکے ہیں۔ اب جو شخص غیر خداوندی راہوں سے منہ موڑ کر خدائی راہ نمائی اختیار
کر لے گا وہ ایک ایسا سہارا تھا م لے گا جو اسے کبھی دغا نہیں دے گا۔ یہ سہارا رشتہ ٹوٹے
گا نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب دین کے معاملہ میں جو ر و اکراہ نہیں، کوئی زبردستی نہیں، اسے انسان کے اختیار و
انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے، تو سب سے پہلے ضروری ہے کہ خود خدا کی طرف سے بھی اس باب میں کوئی
زبردستی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کی بھی وضاحت کر دی۔ حضور نبی اکرم، ایک مشفق و ناصح کی طرح دل و
جان سے چاہتے تھے کہ لوگ بتا ہی سے بچ جائیں اور کسی طرح ایمان لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور
کو مخاطب کر کے فرمایا، کہ اگر ہماری مشیت ایسی ہوتی کہ لوگ طوعاً و کرہاً ایک ہی راستے پر چلتے، کوئی حق و
صداقت سے انکار نہ کرتا، تو ہمارے لئے ایسا کرنا کونسا مشکل تھا۔ ہم نہیں (دیگر اشیائے کائنات

کی طرح) مجبور پیدا کر دیتے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ جب ہم نے ایسا نہیں کیا تو اسے رسول! کیا تو چاہتا ہے کہ تو انہیں کسی نہ کسی طرح مجبور کر دے کہ یہ ایمان لے آئیں۔ دین میں اکراہ کا کوئی دخل نہیں۔ وہ ایمان ہی نہیں جو جبراً لایا جائے (۱۱۰/۹۹)۔ ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے حق تمہارے پاس آچکا ہے۔ اب تم میں سے جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا جو غلط راستے پر چلے گا اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔ تو ان پر واروغہ مقرر نہیں کیا گیا کہ ان سے زبردستی اعترافِ حقیقت کرا لے۔ (۱۱۰/۱۰۸)۔ یہ وہ حقیقت ہے یعنی یہ کہ اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہوتا کہ تمام نوع انسان مجبوراً ایک ہی راہ پر چلیں، تو وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا جس کا علم ہر مومن کو ہونا چاہیے۔ (۱۱۸/۱۱)۔ (۱۱۳/۳۱)۔ (۱۱۹/۹)۔ (۱۱۹/۹۳)۔ (۱۱۹/۱۳)۔ (۱۱۹/۱۳)۔ حتیٰ کہ حضورؐ سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جسے تو بہت ہی عزیز رکھے اور ول سے چاہے کہ وہ ایمان لے آئے، وہ ایمان لے ہی آئے (۱۱۸/۵۶)۔ ہم نے اس معاملہ میں انسان کو آزادی دی ہے لہذا تو بھی ان تک پیغامِ حق پہنچا دے اور پھر کہہ دے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۱۸/۲۹)۔ جس کا جی چاہے ایمان لے آئے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سورہ الدھھر میں ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے سماعت و بصر عطا کر دی۔ پھر اسے راستہ دکھایا۔ اب ان میں سے جو چاہے اسے قبول کر لے۔ جس کا جی چاہے اسے مسترد کر دے۔ (۱۱۹/۳)۔ سورہ عبس میں ہے کہ قرآن ایک تذکرہ ہے۔ یعنی اس صداقت اور حقیقت کی یاد دہانی جسے انسان بار بار بھلا دیتا ہے۔ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ (۱۱۹/۱۳)۔ سو جس کا جی چاہے اس سے فریاد کر دے صدقوں کو پھر سے اپنے سامنے لائے۔ سورہ بلدہ میں ہے کہ وَ هَذَيْنِ لُتَلَكِّذْنِي ۖ هَٰٓؤُلَآءِ نَسِيتُ ۖ وَ هُم لَمْ يَشْعُرْ (۱۱۹/۱۰)۔ ہم نے اسے دونوں راستے واضح طور پر دکھا دیئے ہیں۔ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۚ (۱۱۹/۳)۔ سو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف لے جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ (نیز ۱۱۹/۵۴)۔

خدا نے انسان کو آنکھیں دے دیں۔ باہر روشنی کا انتظام کر دیا۔ غلط اور صحیح دونوں راستے متمیز طور پر اس کے سامنے رکھ دیئے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا کہ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَ مَنْ عَمِيَٰ فَعَلَيْهَا (۱۱۹/۵)۔ جو کوئی آنکھیں کھول کر چلے گا اس کا فائدہ اس کو ہوگا۔ جو اندھا بن کر چلیگا وہ خود نقصان اٹھائے گا۔ وَ لَا تَنصُرْهُ ۚ وَ إِنَّا لَنَرَاهُ ۚ فَمَنْ أُوخِيَٰ (۱۱۹/۵)۔ یہاں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ تم میں سے جو بھی صحیح راستے پر چلے گا وہ خوف و حزن سے

محفوظ رہے گا۔ (۲/۳۸ و ۲۰/۱۲۳)۔ اور اسے بھی سمجھ لو کہ اگر تم صحیح راستے پر چلو گے تو غلط راستے پر چلنے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ وہ خود اپنا ہی نقصان کریں گے (۵/۱۰۵)۔

مشرکین یہ کہتے تھے کہ ہم اپنے شرک کے لئے مورد الزام نہیں۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی کہ ہم شرک کرتے۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو ہم کس طرح شرک کر سکتے تھے۔ اس کے جواب میں کہا کہ یہ غلط کہتے ہیں۔ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ (۶/۱۴۹) (۳۵-۳۶/۱۶ و ۲۰/۴۳)۔ قَدْ ضَلُّوا وَاَمَّا كَاثِرٌ مِّنْهُمْ فَيَقُولُ اِنْ كُنَّا لَنَرٰهُ سَوَیًّا وَّجْہًا لِّمَنْ شَاءَ لَّوْ كُنَّا نَعْلَمُ سِرَّ رَبِّ لَآ یَفْهَمُیْ مَنْ یُّضِلُّ (۱۶/۳۷)۔ ”جو گمراہ رہنا چاہے خدا سے ہدایت نہیں دیتا۔

خدا تو کسی کو گمراہ نہیں کرتا، البتہ مذہبی پیشوا، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں..... قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوا كَثِیْرًا (۵/۷۷)۔ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے

ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ (نیز ۶/۱۴۵)۔ اس طرح غلط روش پر چلنے والوں کا ایک جتھہ یا قافلہ بن جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے غلط معقولات کو

مذہبی پیشوا

اور مضبوط اور محکم کرتے چلے جاتے ہیں۔ (۷/۲۰۲)۔ اور یوں اس غلط رو قافلہ کا کاروں سالار انہیں اس منڈی میں جاتا رہتا ہے جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا یعنی جہنم میں۔ (۲۸-۲۹/۱۴)۔ بہر حال یہ سب کچھ انسان ہی کرتے ہیں۔ خدا نہ زبردستی کسی کو گمراہ کرتا ہے اور نہ ہی زبردستی کسی کو

راہِ راست پر لاتا ہے۔ اس کے ہاں قانون یہ ہے کہ

اَلْحَقُّ مِنْ تَرَبُّكُمُ قَفْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُوعِمْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۹/۷۹)

تمہارے رب کی طرف سے حق آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی

چاہے اس سے انکار کر دے۔

اور اسی ”مَنْ شَاءَ“ سے ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔

مَنْ يَشَاءُ

جسے چاہے — یا — جو چاہے؛ —

قرآن کریم میں جہاں عمومی طور پر مَنْ يَشَاءُ آیا ہے، اس کے متعلق اصولی گفتگو اس سے پہلے کی جا چکی ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں جہاں مَنْ يَشَاءُ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ

(۱) ہدایت اور ضلالت انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ یعنی جس کا جی چاہے سیدھا راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے غلط راستے پر چلتا جائے۔

(۲) سیدھا راستہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اس طرح کہ انسان آنکھیں کھول کر چلے، عقل و بصیرت سے کام لے، سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے۔ زندگی کے ہر دور اہم پرل چھی طرح دیکھ لے کہ سیدھا راستہ کونسا ہے اور ٹیڑھا کونسا۔ آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے نہ چلتا جائے۔ یہ ہے وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق انسان صحیح راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ ان تصریحات کے بعد متعلقہ قرآنی آیات کو دیکھئے۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ ابتداءً انسان ایک برادری (امت واحدہ) کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات رونما ہوئے جن کے رفع کرنے کے لئے خدا نے سلسلہِ رشدِ ہدایت جاری کیا۔ انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کیں جو لوگ ان کی صداقت پر ایمان لے آئے، اللہ نے انہیں ہدایت دے دی۔ اس کے بعد ہے۔ وَ اللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۲/۲۱۳)۔ جو شخص بھی ہدایت لینا چاہے اُسے خدا کے سلسلہِ ہدایت کی رُو سے ہدایت مل جاتی ہے۔ ان رسولوں کے ذمے پیغاماتِ خداوندی کا پہنچا دینا ہوتا تھا۔ (۵۹/۹۹؛ ۱۹/۳) انہیں راہِ راست پر لگا دینا نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ سے کہا گیا کہ لَيْسَ عَلَيْكَ هٰذَا وَلٰكِنْ اللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۝ (۲/۲۴۲)۔ تیرے ذمے یہ نہیں کہ تو انہیں صحیح راستے پر چلائے۔ خدا صحیح راستے پر اسے ہی چلائے گا جو خود اس راستے پر چلنا چاہے۔ (۵۶/۲۸)۔ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۰/۲۵)۔

خدا سلامتی کے راستے کی طرف آنے کے لئے دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد جو شخص بطیب خاطر صحیح راستہ اختیار کرنا چاہے اسے اس کی طرف راہ نمائی مل جاتی ہے۔ یہ دعوت (من جانب اللہ) رسولوں کی دست سے ملتی تھی۔ جو شخص ان کی دعوت پر لبیک کہتا تھا اسے صحیح راستے کی طرف راہ نمائی مل جاتی تھی۔ (۱۲/۴)۔ رسول اللہ دعوت خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی (آیات) کی بنا پر دیتے تھے۔ کَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ۭ ؕ اَنَّ اللّٰہَ یَهْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ۝ (۲۳/۱۶)۔ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے واضح قوانین نازل ہوتے تھے۔ یوں خدا ہر اس شخص کو ہدایت دیدیتا ہے جو ہدایت لینے کا ارادہ کرے۔ اسی کو دوسری جگہ قرآن کہہ کر پکارا ہے (۲۳/۲۵) ۭ ۚ ۲۳/۲۰ ۚ۔ سورۃ زمر میں اُسے

کتاب منزل من اللہ کہا گیا ہے۔ (۳۹/۲۳)۔ سورۃ فاطر میں ہے کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی یا دھوپ اور سایہ یکساں ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی مردہ اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ اسے رسول! تو مردوں کو سنا نہیں سکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ یَسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ ۝ (۱۹-۲۳/۳۵)۔ خدا بھی انہی کو سنا تا ہے جو سنا چاہیں۔ ”جو سنا چاہیں“ کا مطلب ہے وَ یَهْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ اَنْابَ (۱۳/۲۷)۔ جو اس مقصد کے لئے خدا کی طرف رجوع کرے۔ اس کے برعکس جو اس طرف توجہ ہی نہ دے، وہ ہدایت خداوندی سے کس طرح مستفید ہو سکتا ہے؟

یہ ہے خدا کا قانونِ مشیت جس کے مطابق جس کا جی چاہے ہدایت حاصل کرے۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا اسے ہدایت نہیں مل سکے گی۔ سورۃ انعام میں ہے وَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِآٰیٰتِنَا صُمْ ۭ ؕ وَ بُکْمٌ ۭ فِی الظُّلُمٰتِ ۭ ؕ مَنْ یَّشَآءِ اللّٰہُ یُضِلُّہٗ ۭ ؕ وَ مَنْ یَّشَآءُ یَجْعَلْہٗ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۶/۳۹)۔ جو لوگ قوانین خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں، وہ ہرے گونگے بن کر اندھیروں میں ٹامک ٹوٹیاں مارتے رہتے ہیں۔ انہیں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ رہنمائی اُسے ملتی ہے جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق راہ نمائی لینا چاہے۔

سورۃ ابراہیم میں، غلط اور صحیح نظریہ زندگی کو شجرِ خبیث اور شجرِ طیب کی مثال سے سمجھایا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ صحیح نظریہ زندگی پر ایمان لاتے ہیں انہیں دنیا اور آخرت میں ثبات و استقامت نصیب ہوتی ہے۔ وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ۔ اور ظالمین کو خدا کی راہ نمائی نہیں ملتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جو لوگ ظلم و استبداد کی روش نہ چھوڑنا چاہیں، ان پر کامیابی کی راہیں کیوں نہیں

کشادہ ہوں؟ کہا کہ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ (۱۳/۲۴)۔ یہ خدا کا قانونِ مشیت ہے جسے اس نے اپنے اختیارِ مطلق سے بنایا ہے۔ تم یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ قانون ایسا کیوں ہے؟ یہ قانون ایسا ہے تم اس کے مطابق چلو گے تو نجات و سعادت کی راہیں تم پر کشادہ ہوتی جائیں گی۔ اس کی خلاف ورزی کرو گے تو یہ راستے بند ہو جائیں گے۔

سورۃ فاطر میں ہے کہ جو شخص غلط کام کرے اور وہ اسے سہانے بن کر دکھا دیں۔ وہ اس فریب میں مبتلا رہے کہ میں بہت اچھے کام کر رہا ہوں اس لئے اس راستے کو چھوڑنا نہ چاہے تو اس پر بھی کامیابی کی راہیں کشادہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ بھی خدا کا قانونِ مشیت ہے۔ حضورؐ سے کہا گیا کہ جو لوگ اس طرح فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر تباہ ہونا چاہیں۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ ط تو ان کی حالت پر تأسف کر کے اپنی جان مت گھلا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلَيْهِمْ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ (۳۵/۸) خدا ان کے اس مصنوعی کاؤبار کی حقیقت سے باخبر ہے۔

(جیسا کہ ایک مقام پر پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) ظہورِ اسلام کے وقت بعض دلوں میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ اگر ان مخالفین کو معجزات دکھامیے جائیں تو یہ ایمان لے آئیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ خدا کا قانونِ مشیت یہ نہیں۔ اس کا قانونِ مشیت یہی ہے کہ لوگ عقل و فکر اور علم و بصیرت کی روش سے قلب و دماغ کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ صداقت کو تسلیم کریں جسے ایمان لانا ہو گا وہ اس قانون کے مطابق ایمان لائے گا۔ مَا كَاذُ الْيَوْمِ مِثْلُ آيَاتِ اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ يَجْهَلُونَ ۝ (۶/۱۱۲)۔ جہالت کی رو سے ایمان نہیں لایا جاسکتا۔

اسی طرح سورۃ مدثر میں کہا کہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق کامرانی و شاد کامی کی راہیں اس پر کشادہ ہوتی ہیں جو اس کے قانون کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھے۔ جو شکوک و شبہات سے منافقت کی زندگی بسر کرے اسے صحیح منزل کی طرف راہ نائی نہیں مل سکتی۔ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۝ (۴۲/۳۱)۔ اس طرح خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق جو چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے، جس کا جی چاہے غلط راہوں پر چلتا جائے۔

یہی مفہوم ان آیات کا جن میں کہا گیا ہے کہ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ ۝ (۷۱/۵۵)۔ بَارِ الْاِلٰه! ہدایت و ضلالت تیرے قانونِ مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ سورۃ

مشمول ہی میں رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ ہم نے تجھے منصب نبوت سے سرفراز کیا جو یکسر وہی ملکہ ہے۔ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ اور یقیناً تو اس کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی صراطِ مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ لیکن تیرا کام صرف راستہ بتانا ہے، راستہ پر چلانا نہیں۔ تَهْدِيْ بِہِ مَنْ تَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا (۴۲/۵۲)۔ اس قرآن کے ذریعے ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنے بندوں کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ اور وہ قانونِ مشیت یہ ہے کہ ہدایت اسے ملتی ہے جو ہدایت لینے کا خواہاں ہو۔

اور آخر میں ہم سورہ نحل کی وہ آیت درج کرتے ہیں جو اس باب میں گویا قولِ فیصل ہے۔ فَرِیَا۔ وَ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلْکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہوتا تو وہ تمام انسانوں کو ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وَ لَکِنْ یُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ۔ وَ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳/۶۶)۔ اگر آیت کے پہلے حصے (یُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ....) کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تو اس کے بعد جو کہا کہ (لَتُسْئَلُنَّ....) ”یقیناً تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیسے کام کئے تھے۔“ یہ نہ صرف بے معنی ہوگا بلکہ ایک دوسرے سے متضاد بھی۔ اگر حقیقت یہ ہو کہ خدا جسے چاہے ہدایت دے، جسے چاہے گمراہ کر دے، تو پھر لوگوں سے باز پرس کیسی باز پرس تو اسی سے ہو سکتی ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ کرے۔

لہذا، آیت کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہوتا کہ سب انسان ایک ہی روش پر چلیں، تو وہ انہیں (دیگر مخلوق کی طرح) مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو صاحب اختیار پیدا کیا تاکہ جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے غلط راستے پر چلتا رہے۔ انسان کا یہی اختیار و ارادہ ہے جس سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اسی لئے اس سے باز پرس ہوگی کہ تو نے فلاں کام ایسا کیوں کیا تھا؟ اعمال کی یہی ذمہ داری تھی جس سے بچنے کے لئے ابلیس نے خدا سے کہا تھا کہ میں نے معصیت نہیں کی۔ اَعُوْذُ بِتَنٰی۔ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ (۱۶/۷۱؛ ۱۵/۳۹)۔ اپنی ذمہ داری سے ہی گریز اور فرار ہے جس سے ابلیس رائیڈور گا ہو گیا۔ جو خود مجبور بنتا ہے اور اپنے اعمال کا ذمہ دار خدا کو قرار دیتا ہے، وہ قرآن کے ارشاد کے مطابق

المیسی و ش اختیار کرتا ہے۔

نگہ باز گشت

جن الفاظ سے ہم نے زیرِ نظر باب کا آغاز کیا تھا، انہیں ایک بار پھر سامنے لائے۔ یعنی مَنْ يَهْدِيهِ اللَّهُ فَلَا ضَلَالَةَ لَهُ وَ مَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ۔ اور ان کا یہ ترجمہ بھی کہ جس شخص کو خدا ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ اس ترجمہ سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ، نہ صرف یہ کہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی اس قسم کا تاثر یا تصویر صحیح نہیں۔ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآنِ کریم کی کسی ایک آیت کو دیگر متعلقہ مقامات سے الگ کر کے، اس کے لفظی ترجمہ سے، نہ صرف یہ کہ بات واضح نہیں ہوتی بلکہ اس سے الٹی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ متعلقہ موضوع کے متعلق قرآنِ کریم میں جہاں جہاں جو کچھ آیا ہے اسے سامنے

قرآنِ فہمی کا صحیح طریقہ

اس کی اس بنیادی تعلیم کی رو سے، متعلقہ آیات کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم متعین کیا جائے۔ اس سے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ انسانی زندگی کے سلسلہ میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو فاعل قرار دیا ہے۔ (یعنی یہ کہا ہے کہ خدا ایسا کرتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور جب قرآنِ کریم سے یہ بھی متعین کر لیا جائے کہ اس باب میں خدا کا قانونِ مشیت کیا ہے تو پھر بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں چند ایک آیات پر پھر غور کیجئے۔ مثلاً

(۱) سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔ وَ مَنْ يُضِلِّ

لہ میں نے لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو اسی اصول کے مطابق مرتب کیا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِهِ (۱۷/۹۷)۔ عام ترجمہ اس کا یہ ہے۔ ”جسے خدا ہدایت دے نو وہی ہدایت یافتہ ہوگا اور جسے وہ گمراہ کر دے، تو خدا کے سوا اس کا کوئی کارساز نہیں ہو سکتا۔ قیامت کے دن ہم اسے اوندھے مٹھے منہ، اندھا، بہرہ، گونگا بنا کر اٹھائیں گے۔ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا..... آپ دیکھیں گے کہ اس آیت کو، دیگر متعلقہ مقامات سے الگ کر کے دیکھنے سے کتنی بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے لیکن اس سے اگلی ہی آیت میں ہے۔ ذَالِكَ جَزَاءُ هُمُ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا (۱۷/۹۸)۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہمارے قوانین سے انکار کیا اور ان سے سرکشی برتی تھی۔ اس سے بات صاف ہو گئی کہ جو شخص قوانین خداوندی سے انکار کرتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ یہ خدا کا قانونِ سنیت ہے۔ لہذا، مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے، اسے خدا کی رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔ جو ان سے انکار کر دے، اس کے سامنے صحیح راستہ نہیں مل سکتا۔ (اس سلسلہ میں آیات (۱۷/۱۷۸، ۱۷/۱۷۹، ۱۸/۱۷۸، ۱۸/۱۷۹) بھی ملاحظہ فرمائیے)۔

قرآن کریم میں خدا کے لئے **الْمُضِلُّ** آتا ہے۔ یعنی خدا کے حسین ترین بہترین ہم۔ اس سے مراد وہ صفات خداوندی ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ اس جہت سے آپ نے اکثر جگہ خدا کے ننانوے نام لکھے دیکھے ہوں گے۔ بعض جگہ ان میں **الْمُضِلُّ** (یعنی گمراہ کرنے والا) بھی درج ہوتا ہے۔ قرآن کریم **خدا کا ایک نام۔ الْمُضِلُّ** میں اللہ تعالیٰ کا یہ نام تو نہیں آیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسے ان آیات سے مستنبط کیا گیا ہے جن میں مَنْ يُضِلُّ قِسْمِ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان الفاظ، یا جن آیات میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں، ان کا صحیح مفہوم آپ کے سامنے آچکا ہے اس مفہوم کے پیش نظر ہم سمجھتے ہیں کہ خدا کو **الْمُضِلُّ** (گمراہ کرنے والا) ہرگز نہیں کہنا چاہیے۔ وہ تو **الْمُهَادِي** (ہدایت دینے والا) ہے۔ اور جو **الْمُهَادِي** ہو وہ **الْمُضِلُّ** کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں **مُضِلُّ** (گمراہ کرنے والا) شیطان کو کہا گیا ہے۔ سورۃ قصص میں **ایسا نہیں کہنا چاہیے** ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے فطی کو مکہ مار کر ڈھیر کر دیا تو اس کے بعد کہا کہ **هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ** (۱۵/۲۸)۔ یہ تو شیطان کا کام ہے۔ بے شک وہ (انسان کا) دشمن اور کھلا ہوا **مُضِلُّ** (گمراہ کرنے والا) ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ **وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا** (۴/۶۰)۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ

لوگوں کو دُور کی گمراہی میں پھینک دے۔ ظاہر ہے کہ جس کام (گمراہ کرنے) کو قرآن، شیطان کا عمل قرار دے اسے (معاذ اللہ) خدا کی طرف یکسے منسوب کیا جاسکتا ہے؛ لہذا، اس قسم کی آیات کا ایسا ترجمہ بھی نہیں کرنا چاہیئے جس سے خدا ”گمراہ کرنے والا“ قرار پائے۔

اسی طرح ان ننانوے ناموں میں، اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا) کے ساتھ اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا)۔ بِالْاِثْمِ رَفْعُ کے ساتھ اَلْضَّالُّ (نقصان پہنچانے والا) بھی شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ جن آیات سے اس قسم کے ناموں کو مستنبط کیا جاتا ہے، ان کا صحیح مفہوم سامنے آنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا نہ کسی کو یونہی ذلیل کرتا ہے اور نہ نقصان پہنچاتا ہے۔ ذلت اور ضرر انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے انسب ہے کہ اس قسم کے ناموں کو اَلْاَوْسَمَاءُ الْحَسَنَةِ کی فہرست میں شامل نہ کیا جائے۔

(سورۃ انعام میں ہے۔ مَنْ يَشَأِ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَ مَنْ يَشَأِ يَجْعَلْهُ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۶/۳۹)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ یہ ترجمہ بہت بڑی غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتی ہے۔ اس کے مطابق جو شخص چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے، جو چاہے غلط راستے پر گامزن رہے۔ وہ قانونِ مشیت کیا ہے؛ اس کی وضاحت اس آیت کے ابتدائی الفاظ میں یوں کر دی کہ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمُّوْا وَ بُكُّوْا رَفِیْ اَظْلُمُتْ (۶/۳۹)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں، وہ بہرے اور گونگے بن کر تاریکیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

(۳) سورۃ الشُّرَٰہِ میں ہے۔ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَشَآءَ اللّٰهُ۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ جسے خدا گمراہ کر دے اُسے کون ہدایت دے سکتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں۔ اس کا مفہوم آیت کے ابتدائی الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے جن میں کہا گیا ہے۔ بَلِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَهْوٰ اَتٰهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳۰/۲۹)۔ یہ ظالم، بغیر علم و بصیرت، اندھا دھند اپنے حیوانی جذبات کا اتباع کئے چلے جاتے ہیں۔ اب سوچو کہ جو شخص قانونِ خداوندی کی رُو سے اس طرح غلط راستوں پر چلتا جائے، اسے کون راہِ راست پر لاسکتا ہے۔

(۴) سورۃ توبہ میں ہے کہ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰی

يُسَبِّحِينَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ ۝ (۹/۱۱۵)۔ یہ خدا کے شایان شان ہی نہیں کہ وہ لوگوں کی طرف اپنی راہ نمائی (کتاب) بھیج دے اور اس طرح یہ واضح کر دے کہ انہیں کن امور سے بچنا چاہیئے اور اس کے بعد انہیں یونہی گمراہ کر دے۔ اس نے اگر لوگوں کو گمراہ کرنا ہوتا تو ان کی طرف ہدایت کے ضابطے کیوں بھیجتا۔

(۵) سورۃ انعام میں ہے۔ قَمَنْ يُّشْرِكِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرًا لِلْاِسْلَامِ فِى السَّمٰوٰتِ (۶/۱۲۶)۔ اس کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ خدا جس شخص کو ہدایت دینے کا ارادہ کرے اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرے اس کا سینہ یوں تنگ کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان کی بندیوں کی طرف چڑھ رہا ہے۔ اس سے پہلے آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے سامنے جب قوانین خداوندی پیش کئے جاتے ہیں تو وہ کٹ جھٹتیاں کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مجرم جنہیں ذلت آمیز سزا ملتی ہے۔ اسی تسلسل میں مندرجہ بالا الفاظ آئے ہیں اور ان الفاظ کے بعد کہا ہے۔ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرّٰجِسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۶/۱۲۶)۔ جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے ان پر حقیقت مشتبہ رہ جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی قلب کا خدائی راہ نمائی کے لئے کشادہ ہو جانا، ایمان کا ثمر طیب ہے۔ اور اس کا بھنخ جانا، انکار و جحود کا لازمی نتیجہ۔ چونکہ یہ کچھ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتا ہے، اس لئے خدا نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ قلب کی بستی و کشا و انسان کے اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ النحل میں کہا گیا ہے۔ جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹ جائے اس پر عذابِ عظیم وارد ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ اس شخص کے متعلق نہیں کہا گیا جس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو لیکن اس سے کفر کا کوئی کام زبردستی کرا دیا جاتے۔ یہ اس شخص کے متعلق کہا گیا ہے۔ مَنْ شَرَحَ بَانْكُهُ صَدْرًا (۱۶/۱۰۶)۔ جو کفر کے لئے اپنا سینہ کھول دے دیکھو یہاں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان، کفر اور ایمان کے لئے اپنا سینہ خود ہی کھولتا اور بند کرتا ہے، خدا اپنی کتاب کے ذریعے راہِ ہدایت نمایاں کر دیتا ہے۔ جو اپنے سینے کی کشادگی سے اپنے قلب میں سمولیتا ہے، کس پر کامیابیوں کی راہیں واہ ہو جاتی ہیں۔ جو اپنے دل کے دروازے بند کر لیتا ہے، وہ ان سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ ذٰلِكَ هُدٰى اللّٰهُ يَهْدِيْهِ مَن يَّشَآءُ ۝ (۲۲-۲۳/۳۹)۔ اس طرح خدا

ہر اس شخص کے سامنے کامیابیوں کے راستے کشادہ کر دیتا ہے جو کامیابیاں حاصل کرنا چاہے جو ایسا نہ چاہے، اس پر یہ دروازے بند رہتے ہیں۔ اور جس پر یہ دروازے، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق بند رہیں، اُسے کوئی بھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتا۔ جو شخص خود ہی اپنی آنکھیں بند کر لے، اسے کون بنیائی عطا کر سکتا ہے!

فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ (۱۶/۳۷)۔

جو خود ہی گمراہ رہنا چاہے اسے خدا از بروستی (ہدایت نہیں دیتا)۔

دوسری طرف۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔
جو لوگ ہمارے بارے میں سعی و کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں، ہم ان کی راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کرتے جاتے ہیں۔

وَذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ



بارھواں باب

رزق خدا کے ہاتھ میں کیسے؟

اب ہم اپنے سفر کی اس منزل میں داخل ہو رہے ہیں جہاں جبر کا عقیدہ سب سے زیادہ تباہ کن نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے امیر بنادے، جسے چاہے غریب کر دے۔ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لہذا امیروں کی دولت کی طرف دیکھ کر کبھی دل میں کڑھنا نہیں چاہیئے، نہ ہی یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ان کی دولت ہمیں مل جائے۔ ایسا خیال کرنا، خدا کے خلاف شکایت کرنا ہے۔ اس کے فیصلے کے خلاف چیلنج ہے۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے۔ وہ جس حال میں رکھے، انسان کو مطمئن رہنا چاہیئے۔ راضی برضا یہ کفر ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے۔ وہ جس حال میں رکھے، انسان کو مطمئن رہنا چاہیئے۔ راضی برضا رہنا ہی خدا کے بندوں کا شعار ہے۔ قناعت بڑی دولت

مفلسی کی شان میں قصیدہ ہے۔ توکل کا بڑا درجہ ہے۔ غریبی خدا کو پسند ہے۔ یہ دنیا مُردار ہے اور اس کا چاہنے والا کُتتا ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گزرنا، ممکن ہے لیکن دو لمبوں کا آسمان کی بادشاہت میں داخلہ محال ہے۔ انبیاء عظام، اولیاء کرام، مقربین بارگاہ الہی، خدا کے برگزیدہ بندے، سب غریب تھے۔ انہوں نے غریبی کو اپنے لئے پسند کیا تھا۔ الفقیر فخری خود شاہنشاہ کوئین سرور کائنات کا ارشاد ہے جس کی رُو سے آپ نے فرمایا ہے غریبی میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اسلام شروع میں بھی غریبوں میں آیا اور آخر میں بھی غریبوں میں فروغ پائے گا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر (رحمۃ اللہ علیہ) سے ان کے ایک مرید نے غریبی کی

شکایت کی تو آپ اسے ایک دن ایک تالاب کی طرف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ جو بھیڑیں پانی پنی کر سیر ہو چکی تھیں، وہ آرام سے لیٹی خراٹے لے رہی تھیں اور پیاسی بھیڑیں دوڑ دوڑ کر پانی کی طرف آ رہی تھیں۔ آپ نے اپنے اُس مرید سے کہا کہ بیٹا! تم نے امیری اور غربی کا فرق دیکھ لیا۔ جو سیر ہو جاتا ہے وہ خدا کی طرف سے مُنہ موڑ کر غافل ہو جاتا ہے۔ جسے محتاجی رتی ہے وہ دوڑ دوڑ کر خدا کی طرف جاتا ہے۔ اس قسم کے قصے کہانیاں ہر مجلس وعظ اور ہر محفل ارشاد میں عوام کو سنائی جاتی ہیں اور غریبوں کو تھپک تھپک کر سلایا جاتا ہے کہ ان کی نگاہ کہیں اس طرف کو نہ اٹھنے پائے کہ ان امرار کے محلات کی فلک بوس غارتیں اپنی (غریبوں اور مفلسوں) کی ہڈیوں کے چونے سے استوار ہوتی ہیں اور ان کے عشرت کدوں کی رنگینیاں انہی کے خون کی رہنِ منت ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قسم کے معتقدات کس دور کی پیداوار ہیں اور کن دماغوں کی تخلیق۔ اور ستم بالائے ستم کہ ہر باطل عقیدے کی طرح، ان عقائد کی تائید میں بھی قرآنی آیات پیش کر دی جاتی ہیں۔ اے والے!

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم جس نے مومن کو بنایا مہ و پروں کا امیر
 ”تن بتقدیر“ ہے آج ان کے عمل کا انداز تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
 تھا جو، ناخوب، بتدریج وہی، خوب، ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
 آئیے دیکھیں کہ جس قرآن نے، مومن کو مہ و پروں کا امیر بنایا تھا، اس کی اس باب میں تعلیم کیا ہے؟

رزق کے معنی سامانِ زیست کے ہیں۔ یعنی ہر وہ شے جس پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے، قسطن
 کریم میں اس کے لئے رزق کے علاوہ، فضل اور معاش کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

رزق کی کیفیتِ ہدایت کی سی ہے جس کے متعلق ہم تفصیلی طور پر سابقہ باب میں دیکھ آئے ہیں یعنی
 خدا نے انسان کو پیدا کیا تو ساتھ ہی کہہ دیا کہ دنیا میں غلط اور صحیح راستے کو نمایاں طور پر الگ الگ کر کے
 دکھا دینا ہمارے ذمے ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنی طرف سے ضوابطِ ہدایت نازل کیئے۔
 لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ دونوں راستوں کو متمیز کر کے تمہارے سامنے رکھ دینا ہمارے
 ذمہ تھا۔ اب یہ تمہارے اختیار میں ہے، کہ تم کو نسا راستہ اپنے لئے منتخب کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے
 اس انتخاب میں ہم دخل نہیں دیں گے۔ تم میں سے جو غلط راستے پر چلنا چاہے، اس راستے کو اختیار کر لے۔

جو صحیح راستے پر چلنا چاہے اسے منتخب کر لے۔

اسی طرح خدا نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے تمہیں دنیا میں بھیجا ہے تو جس متاع و سامان پر تمہاری زیست کا دار و مدار ہے اسے ہم نے پہلے ہی صفحہ ارض پر مہیا کر دیا ہے۔ حرارت، روشنی، ہوا، پانی اور خوراک

پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ ان سب کو تمہاری سامان رزق خدا نے مہیا کر رکھا ہے

پیدائش سے بھی پہلے پیدا کر دیا۔ یہ مطلب ہے ہمارے اس کہنے کا کہ تمہیں رزق ہم دیتے ہیں۔ لیکن جس طرح ہماری ہدایت سے مستفید

ہونے کے لئے تمہیں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے، اسی طرح ہمارے مہیا کردہ سامان نشو و نما سے متمتع

ہونے کے لئے بھی تمہیں خود سعی و کادش کرنی ہوگی۔ اس کے لئے ہم نے کچھ قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے

ہیں۔ جو لوگ ان کے مطابق کوشش کریں گے، انہیں سامان زیست میسر آجائے گا۔ جو ایسا نہیں کریں گے

وہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی ماں کی چھاتیوں سے دودھ کے

چشمے پھوٹ جاتے ہیں لیکن جو ماں بچے کو تنہا چھوڑ کر چلی جائے، وہ بلک بلک کر بھوک سے مرجاتا ہے۔

اس کے حلق میں ہم دودھ کا قطرہ تک نہیں ٹپکاتے۔ پھر ہمارے اس انتظام کی کیفیت یہ ہے کہ شروع

شروع میں بچے کا ہاضمہ نازک اور کمزور ہوتا ہے تو ماں کے دودھ میں دہنیت (FAT) کی مقدار کم

ہوتی ہے اور مائیت (پانی) کی زیادہ۔ یعنی دودھ پتلا ہوتا ہے۔ جوں جوں بچے کی عمر کے ساتھ

اس کا ہاضمہ توانا ہوتا جاتا ہے، اس کی ماں کا دودھ اسی نسبت سے گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ

جب بچے کے دانت نکل آتے ہیں اور اس کا نظام ہضم، دوسری قسم کی غذا، ہضم اور جذب کرنے

کے قابل ہو جاتا ہے، تو دودھ کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ اب بچے کی خوراک کے لئے اس

کے والدین کو خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو "خدا کے دیئے ہوئے رزق" سے متمتع ہونے کی انفرادی

مثال ہے۔ اجتماعی طور پر دیکھئے تو رزق کے خزانے زمین میں مدفون دستور ہیں۔ انہیں وہاں سے،

خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق نکالنا اور حاصل کرنا ہوتا ہے (انہیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے) اس

سلسلہ میں پہلا مرحلہ اپنی سعی و کادش سے رزق پیدا یا حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگلا

مرحلہ انسان کی تمدنی زندگی کا ہے جس میں پیدا یا حاصل کردہ

رزق کی تقسیم کا مسئلہ رزق کی تقسیم کا سوال سامنے آتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے

جہاں اس مسئلہ میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے خدائی راہ نمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر رزق کی تقسیم، ہدایت خداوندی کے مطابق کی جائے (جسے نظام ربوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے) تو ہر انسان کو اطمینان اور عزت کے ساتھ سامانِ رزق میسر آتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ تقسیم، انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام کے تحت رہے تو پھر یہ دنیا جہنم بن جاتی ہے۔ (جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے)۔ آئیے ہم دیکھیں کہ ان تینوں گوشوں کے متعلق قرآن کریم کیا تعلیم دیتا ہے۔



۱۱) وَاللّٰهُ يُزِيِّنُ رُزْقَكُمْ

اللہ تمہیں رزق دیتا ہے۔

رزق کی ذمہ داری کے متعلق فرمایا۔ ذَا مِمَّا مِنْ دَاآبَةِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ

إِنْزَامُهَا..... (۱۱/۶۱)۔ صفحہ ۱۱ پر کوئی ذی حیات

ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ دوسرے

مرازق دینے کی ذمہ داری

مقام پر انسان اور دیگر مخلوق کی الگ الگ تصریح کر دی۔ (۲۹/۶۰)۔ سورہ روم میں ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِي

خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ (۳۰/۴۰)۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں پیدا کرتا ہے اور رزق دیتا ہے۔

سورہ النعام میں ہے۔ نَحْنُ نَزْنِزُ قُكُّكُمْ وَآيَاكُمْ (۱۵۲/۶ و ۱۴/۳۱)۔ ہم تمہیں بھی رزق

دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ یہاں اس امر کی ایک بار پھر تصریح کر دی جائے کہ خدا کی اس ذمہ داری

سے مراد یہ نہیں کہ وہ انسان اور دابة کو براہ راست رزق دیتا ہے۔ اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے تو اس

کا کیا جواب دیا جائے گا کہ (دیگر مخلوق کو تو چھوڑیے) ایک قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے تڑپ تڑپ

کر مر جاتے ہیں۔ ویسے بھی آجکل حالت یہ ہے کہ دنیا میں آدھی آبادی کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانے

کو نہیں ملتا۔ اس سے (معتزض کہے گا کہ)۔ خدا اپنی اس ذمہ داری کو عجیب انداز سے پورا کرتا ہے کہ دنیا

بھوک مری رہی ہے اور وہ کچھ نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، خدا کے رزق دینے سے

لے خُلا کی یہ ذمہ داری کس طرح انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے، اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

مراد یہ ہے کہ اس نے سامانِ رزق پیدا کر دیا ہے۔ وَقَدْ مَكَتُكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا
لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (۱۰/۱۵)۔ ہم نے تمہارا ٹھکانہ زمین میں بنایا اور اس میں تمہارے لئے
سامانِ زندگی رکھ دیا۔

زمین میں خوراک پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی اور آسمان سے بارش برسائی اس طرح تمہارے
لئے زیست کا سامان مہیا کر دیا۔ اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ
پیدائشِ رزق کا فطری نظام | اَسْمَوَاتٍ وَالْأَرْضِ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَخَرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۱۴/۳۲)۔ خدا نے ارض و سموات کو پیدا کیا۔
پھر وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے تمہارے لئے زمین کی فصلوں سے رزق مہیا کرتا ہے۔
کہیں کہا کہ يَزِدُّكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۳۵/۳)۔ وہ تمہیں زمین اور آسمان سے رزق
دیتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ (مثلاً ۲۲/۲، ۳۱/۱۰، ۶۴/۶، ۲۷/۳۶، ۳۲/۳۷)

۳۰/۵، ۲۵/۵، ۵۰/۱۱، ۵۱/۲۳، ۲۵-۳۲/۸۰)۔

کہیں کہا کہ اگر خدا رزق کے ان سرچشموں کو خشک کر دے تو بتاؤ تمہیں کون رزق دے سکتا
ہے؟ (۶۴/۲۱، ۶۴/۳۰، ۶۳-۵۶/۷۳)۔ خدا کے سوا کسی اور میں اس کی قدرت ہی نہیں کہ وہ ذرائعِ رزق
پیدا کر دے۔ (۴۳/۱۶، ۲۹/۱۷)۔ سورہ طہ میں ہے۔ لَا تَسْأَلُكَ رِزْقًا. نَحْنُ نَزْنِزُكَ (۲۰/۳۶)
ہم تمہیں رزق دیتے ہیں۔ تم سے رزق مانگتے نہیں۔ (نیز ۵۱/۵)۔

زمین میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت تو لامحدود ہے، لیکن اس سے بیک وقت ایک خاص مقدار
کے مطابق رزق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وَ إِنْ قَوْلٌ شَيْءٌ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا
نُنْزِلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۵/۲۱)۔ ہمارے ہاں ہر شے کے خزانے موجود ہیں۔ لیکن ان میں
سے ہم ایک "قدر معلوم" کے مطابق ہی نیچے اتارتے (باہر لاتے) ہیں۔ "قدر معلوم" کے الفاظ بڑے
غور طلب ہیں۔ یعنی ایسے اندازے اور پیمانے جن کا علم دیا گیا ہے جنہیں انسان اپنی تحقیق و تدقیق سے
دریافت کر سکتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ انتظام ہم نے اپنے قانونِ مشیت (مَا يَشَاءُ)
کی رُو سے کیا ہے۔ اور مصلحت اس میں یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور زمین سے رزق بغیر اندازے
اور پیمانے کے نکلتا چلا جاتا، تو جو لوگ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جاتے وہ دنیا میں اودھم

مچا دیتے۔ (۲۴/۲۷)۔

”قد معلوم“ سے یہ اشارہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ زمین میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت تو بے اندازہ ہے لیکن حصولِ رزق، انسان کے علم، صلاحیت اور محنت کے مطابق ہوگا۔ یہاں سے ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔

(۲) رزق ملنے کی شرائط

خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں اور ان سے رزق حاصل کرنے کے لئے، انسانی محنت اور کاوش میں باہمی تعلق کیا ہے، اسے سورۃ واقعہ میں بڑے بلیغ اور دلکش انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور بہارِ قافِ لُؤنِ فطرت کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈالتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے۔ کیا یہ تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ایسا ہوتا ہے؟ پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد اس کی حفاظت کون کرتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پچڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیکا میں گئے۔

پھر تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دار و مدار بھی ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟ یہ بادل منہ کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر رکھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آ سکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے۔ ذرا سوچو کہ اگر بارش کا پانی بھی ویسے کا ویسا رکھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟ حیرت ہے تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس بیج سے غور کر کے صحیح نتیجہ تک کیوں نہیں

پہنچتے اور خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا، تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔

ہمیں نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے۔ (تمہاری اس میں صرف محنت ہوتی ہے)۔ ہم نے ان حقائق کو اس لئے بیان کیا ہے تاکہ یہ فراموش کردہ حقیقت تمہیں یاد آجائے کہ ہم نے یہ تمام انتظام بھوکوں کو رزق دینے کے لئے کیا ہے۔ (مفہوم القرآن ۶۳-۶۴/۵۶)۔

انسانی زندگی کے ابتدائی ایام میں، خوراک مشتمل ہوتی تھی زمین کی عام پیداوار، یا شکار کے گوشت پر اس کے بعد مصنوعات کا دور شروع ہوا۔ لیکن مصنوعات کی بنیاد بھی وہ خام مسالہ ہوتا ہے جو زمین سے پیدا ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے بھی رزق کا اولین سرچشمہ زمین ہی قرار پاتی ہے۔

انسان کی تمدنی زندگی کے آغاز میں، تبادلہ اشیاء کا نظام (BARTER SYSTEM) تھا جس کی رو سے، ضروریات کی چیزوں کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد انسان نے سکے ایجاد کیا جس کی رو سے، رزق (ضروریات زندگی) چاندی سونے کے عوض خریداجلنے لگا۔ اس سے مال و دولت، حصول رزق کا ذریعہ بن گئے اور اسی سے وہ ساری پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ جنہیں جس قدر حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہے۔ رزق کے مفہوم میں دولت بھی شامل ہو گئی | چلی جاتی ہیں۔ (یہ ایک الگ موضوع

ہے۔ ہم اس وقت کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اب) رزق کی اصطلاح میں، مال و دولت بھی شامل ہو گئے اور اکتسابِ رزق کے معنی زمین سے فصل پیدا کرنا ہی نہ رہے، بلکہ اس کے معنی دولت کمانا بھی ہو گئے۔ — حتیٰ کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ زمین سے رزق حاصل کرنے کا تصور پس پشت جا پڑا ہے اور مال و دولت کمانے کے تصور نے اولیں اور بلند ترین جگہ لے لی ہے۔ اب امارت اور غربت کا پیمانہ روپیہ پیسہ قرار پا گیا ہے اور یہی 'محنت کا معاوضہ' قرار کرنے کا معیار بن گیا ہے۔ چنانچہ، اب اکتسابِ رزق کی صلاحیت سے مفہوم ہوتا ہے روپیہ کمانے کی صلاحیت اور استعداد۔ اس "صلاحیت" میں انسان کی عقل و فکر، علم اور تجربہ، اقتصادی مہرہ بازیوں کی ہمارت اور سب سے

آخر، محنت سب شامل ہوتے ہیں۔۔۔ بلکہ بسا اوقات، محنت کا اس میں دخل ہی نہیں ہوتا۔۔۔ سرمایہ، اور اس کے استعمال کی شاطرانہ چالیں، دولت کمانے کا اولین ذریعہ قرار پا جاتی ہیں۔ اس موضوع کے متعلق ذرا آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اب اکتسابِ رزق کا اولین مفہوم دولت کمانا ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ حصولِ رزق کے لئے "اس کی طلب و جستجو بنیادی شرط ہے۔ اُسے، قرآن کی اصطلاح میں "اِبْتِغَاءِ فَضْلِ اللَّهِ" کہا گیا ہے۔۔۔

رزق کی طلب و تلاش

یعنی خدا کی طرف سے عطا کردہ رزق کی تلاش۔ اس نے کہا ہے کہ دن اور رات کی گردش آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور ان کو روشن اور تاباں اس لئے بنایا گیا ہے۔ لَتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ (۱۲/۱۷)۔ تاکہ تم اپنے رب کے فضل (رزق) کی تلاش کر سکو۔ واضح رہے کہ ابتغاء صرف تلاش کو نہیں کہتے۔ اس میں 'ارادہ'، 'تلاش' اور 'حصول' سب شامل ہوتے ہیں۔ رزق کی اس طلب و جستجو کے لئے کشتیوں کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے، جو اس زمانے میں سامانِ رزق کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا بہترین ذریعہ تھیں۔ آج بھی ان کی افادیت کچھ کم نہیں۔ وَ تَبْتَغُوا فِيهِ وَ تَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (۱۳/۱۶)۔ تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں کشتیاں کس تیزی سے تیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل (رزق) کی تلاش کر سکو۔ (نیز ۳۶/۳۰، ۳۵/۱۲، ۲۵/۱۲)۔ رزق کی اس طرح طلب اور تلاش، مومن اور کافر ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ والذین معہ کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَ فِيْ ضَوَائِ (۲۹/۲۸)۔ وہ اللہ کے فضل (رزق) کی طلب و جستجو کرتے ہیں۔ (رضوان کے متعلق بعد میں بتایا جائے گا)۔ یہی (۲۰/۷۳) میں کہا گیا ہے۔ بلکہ دوسری جگہ مومنین کو اس کا حکم دیا گیا ہے سورہ جمعہ میں ہے کہ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَمْۤاۡضِ وَ ابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۱۰/۶۲)۔ جب تم صلوٰۃ سے فارغ ہو جاؤ تو پھر زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کے رزق کی تلاش کرو۔

اس طلب و جستجو کے نتیجہ میں 'رزق' خدا کے مقرر کردہ قوانینِ فطرت کے مطابق ملے گا اور (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قوانینِ فطرت میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں ہوتی۔ جو

شخص، قوانینِ زراعت کے مطابق زمین تیار کر کے کھیتی کرے گا، اس کی فصل بھی ہوگی۔ خواہ وہ ہر نام سنگھ ہو یا عبدالرحمن۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہر نام سنگھ، طلب و جستجو کرے تو اس کے راستے میں بند لگا دیئے جائیں کہ تم اس سے آگے نہیں جا سکتے اور عبدالرحمن کے لئے راستے

اس میں کافر و مومن کی کوئی تخصیص نہیں

کھلے چھوڑ دیئے جائیں۔ اسافطعاً نہیں ہوگا۔ دیکھئے، قرآنِ کریم اس حقیقت کو کس وضاحت سے بیان کرتا ہے جہاں کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ مَشَرْنَا..... جو شخص دنیاوی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے، ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے بنایا ہے، اسے دنیاوی مفاد دیتے ہیں۔ (اس کے بعد ہے کہ آخرت میں اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس کی بابت بعد میں لکھا جائے گا)۔ وَ مَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝ اور جو شخص (دنیاوی مفاد بھی لینا چاہتا ہے اور) اُخروی مفاد بھی اور اس کے لئے خدا کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھنے کے بعد، ان کے مطابق پوری پوری کوشش کرتا ہے، تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں۔ كُلُّ نَفْسٍ هَوْءٌ لَّاؤٍ وَ هَوْءٌ لَّاؤٍ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۖ رِزْقًا كَافٍ سَامًا ۝ ہم نے نوعِ انسانی کے لئے بطور عطیہ عام کیا ہے، اس کے حصول کے لئے مومن اور کافر سب کو ہم ان کی سعی و کوشش کے مطابق آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝ (۱۸-۲۰/۱۷)۔ ان عطایائے خداوندی کے راستے میں پھانک نہیں لگا دیئے جاتے کہ کافر اس حد تک جاسکتا ہے، اس سے آگے نہیں۔ اور مومن کھلے بندوں جہاں تک جی چاہے جاسکتا ہے۔ نہیں! خدایتعالیٰ نے اس لئے سامانِ رزقِ تمام نوعِ انسان کے لئے کھلا رکھا ہے۔ اسے جو بھی اپنی سعی و کوشش سے حاصل کرنا چاہے، حاصل کر لے۔ اسی حقیقت کو سورہ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ”جو کوئی مستقبل کے مفاد چاہتا ہے ہم اس کی سعی و کوشش کے مطابق اس کے لئے اس کی کھیتی کی فصل بڑھاتے رہتے ہیں۔ اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم، اس کی محنت و کوشش کے مطابق، اسے دنیا کی فصل دیتے رہتے ہیں۔ البتہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔“ (۲۰/۴۲)۔

یہ ہے خدا کا وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق رزق کی بستی و کشادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ
مَعِيشَةً ضَنْكًا ۝ (۲۰/۱۳۳)

جو شخص (یا قوم) ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا
تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔

قوانینِ خداوندی کے اعراض
سے رزق کی تنگی

(اس کے بعد ہے وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰی۔ جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ اس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں)۔

اس سے واضح ہے کہ رزق کی تنگی، قانونِ خداوندی سے اعراض کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور قانونِ خداوندی کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے کہ جو شخص، قانونِ فطرت کے مطابق، جس قدر کوشش کرے گا اسے اسی قدر رزق فراواں ملتا جائے گا۔ یہی قانون، ہر رسول کی وساطت سے اس کی امت کی طرف بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا کہ اگر یہ لوگ تورات و انجیل اور جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اس پر قائم رہتے تو، انہیں ادھر اور نیچے سے بافراط رزق ملتا (۵/۶۶ ذ ۷۹/۷۹)۔ رزق کی اس طرح فراوانی کو خدا نے اپنی نعمت اور احسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ قریش کے متعلق فرمایا کہ انہیں چاہیے کہ اُس ربِّ کعبہ کی عبودیت اختیار کریں جس نے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ وَ اَمَّنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (۱۰۶/۴)۔ انہیں بھوک مٹانے کے لئے روٹی دی اور خوف سے مامون کر دیا۔ اس کے برعکس، خوف اور

بھوک خدا کا عذاب ہے

بھوک کو خدا کا عذاب بتایا گیا ہے۔ سورہ نحل میں ہے۔

خدا ایک بستی کی مثال سے بات کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ امن و اطمینان میں رہتی تھی۔ چاروں طرف سے رزق بافراط اس کے ہاں کھینچے چلا آتا تھا۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان نعمتوں سے کفران برتاؤ فرمایا اِذَا قَالُوا لِلّٰهِ رَبِّاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ خدا نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا اور یہ سب ان کی اپنی کارستانیوں کا نتیجہ تھا۔ (۱۶/۱۱۲)

اسی طرح اس نے اہل سبا کے متعلق کہا ہے کہ انہیں بڑی خوش حالی حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے فصلوں اور باغوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی تو وہ سب تباہ و برباد ہو گئے۔ (۱۵-۱۶/۳۴)۔

ان تصریحات کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب ان پر رزق کی تنگی آتی ہے تو وہ خدا پر الزام دھرتے ہیں کہ اس نے ہمیں یونہی تباہ و برباد اور ذلیل کر دیا۔ فرمایا کہ ان سے کہو کہ خدا یونہی کسی کو ذلیل و خوار نہیں کیا کرتا۔ یہ سب انسان کے اپنے غلط اعمال اور باطل نظام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تم معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کی عزت نہیں کیا کرتے تھے، اس لئے تم ذلیل و خوار ہو گئے۔ تم محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے اور چاروں طرف سے مال اور دولت سمیٹ کر جمع کرتے چلے جایا کرتے تھے، اس لئے تباہ حال ہو گئے۔ (۱۶-۲۰/۸۹)۔

ہم نے دیکھ لیا کہ ذلت اور بھوک خدا کا عذاب ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ انہیں ”عزت کی روٹی“ ملتی ہے۔ **عزت کی روٹی** وَرِثَاقٌ كَيْفَ يُحْمُ (۸/۷۴)۔ انہیں ہر خطرہ سے حفاظت اور عزت کی روٹی تیر

ہوتی ہے۔ اسے متعدد مقامات میں دہرایا گیا ہے۔ (مثلاً ۸/۴، ۵/۲۲، ۲۶/۲۶، ۳۳/۳۱، ۳۴/۴)۔ اور یہی وہ رزق کریم (عزت کی روٹی) ہے جس کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ تک، خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ معمارِ حرم، حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے بعد سب سے پہلی دعائیں یہ کہا تھا کہ

اللہ العالمین! میں نے اپنی اولاد کو اس بے برگ و گیاہ زمین میں بسا دیا ہے کہ وہ تیرے گھر کی نگہبانی کریں۔ تو ایسا انتظام کر کہ ان کی طرف سامانِ رزق کھنچا چلا آئے۔ یہ بھوکے نہ رہیں۔ (۱۴/۳۷، ۵۷/۲۸، ۱۲۶/۲)۔

اور یہی ”مَا عِدَّكَ مِنْ السَّمَاءِ“ (خدائی و سترخوان) تھا جس کے لئے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے متبعین کے لئے التجا کی تھی۔ (۵/۱۱۴)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ حصولِ رزق، انسانی سعی و کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص جان مار کر محنت کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود مفلس اور نادار رہتا ہے۔ وہ اور اس کے بچے بھوکوں مرجھاتے ہیں۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص کچھ محنت نہیں کرتا اور

عیش اڑاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟
اس کے لئے ہم اپنے سفر کی اگلی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

(۳) تقسیم رزق کا نظام - (معاشی نظام)

جو سوال ہم نے ابھی ابھی اٹھایا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ غریبوں اور مزدوروں کا طبقہ بڑی جانفشانی سے محنت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ نہ انہیں اور ان کی اولاد کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ نہ ان کے پاس سر چھپانے کو جھونپڑہ ہوتا ہے نہ مصیبت کے وقت کام آنے کے لئے کچھ پس ماندہ اگر وہ چار دن کے لئے بیمار پڑ جائیں تو علاج کے لئے پیسہ نہیں ہوتا اور دوسری طرف چونکہ وہ کام پر جانے سے معذور ہو جاتے ہیں اس لئے آمدنی بھی بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اگر وہ مر جائیں تو گھر میں کفن و دفن کے لئے بھی کچھ نہیں ہوتا اور ان کے بعد بڑھئی یا نادار بیوی، چھوٹے چھوٹے بچے لاوارث رہ جاتے ہیں جن کا کوئی پرستار حال نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو ساری عمر تنگدست رہے تو ذکر دہرا نہیں کرتے اور ان کے کتوں تک کو وہ کچھ ملتا ہے، جو غریب کے بچوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ کیوں ہے؟

برہمن نے اس کیوں کا جواب یہ دیا کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے جنہوں نے اُس جنم میں اچھے کام کئے تھے، وہ عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں جنہوں نے بُرے کام کئے تھے وہ مصیبتیں بھگتتے ہیں اور چونکہ یہ سب ایشور پر ماتما کے حکم سے ہوتا ہے اس لئے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ واعظ نے کہہ دیا کہ ہر ایک کا رزق خدا نے سکھ دیا ہے۔ غریبی امیری سب تقدیر کے کھیل ہیں جسے لاکھ کوشش کے باوجود تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ قسمت کا کھانا اٹل ہوتا ہے۔

اور قرآن نے کہا کہ یہ نہ کسی پچھلے جنم کے کرموں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی قسمت کا کھانا۔ یہ سب بے

کسبت ایدیکہ - انسانوں کے اپنے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے۔
قرآن نے کہا بات واضح ہے۔

ایک غریب آدمی، اپنی عمر بھر کی کمائی (بلکہ قرض اٹھا کر) اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان خرید کر لاتا ہے اور راستے میں ڈاکو اس کا سب کچھ چھین لیتے ہیں اور وہ روتا دھوتا گھر آ جاتا ہے۔

ایک مزدور، دن بھر کی محنت مشقت کے بعد چار روپے جیب میں ڈال کر بازار کی طرف جاتا ہے کہ بال بچوں کے لئے وال، آٹا خرید کر لے جائے۔ راستے میں گرہ کٹ اس کی جیب کاٹ کر چاؤں کچاؤں رد پے لے اڑتا ہے اور وہ بیچارہ خالی ہاتھ گھر لوٹ جاتا ہے۔

اس قسم کے چور، ڈاکو، گرہ کٹ تو ہمیں نظر آ جاتے ہیں لیکن معاشرہ میں ذرا آگے بڑھ جائیں تو وہاں

غلط معاشی نظام کیفیت یہ ہوتی ہے کہ چوری، قزاقی، گرہ کٹی تو اس سے کہیں بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، لیکن انہیں نہ کوئی چور کہتا ہے نہ ڈاکو، نہ گرہ کٹ نہ قزاق۔ انہیں، بلکہ معاشرہ کے معزز ترین افراد سمجھا جاتا ہے۔ یہ کون ہیں؟

گاؤں کا زمیندار، ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ کاشت کار سال بھر جان مار کر محنت کرتے ہیں اور وہ فصل کا بہترین حصہ اٹھوا کر اپنے گھر لے جاتا ہے۔ نہ اسے اس سے کوئی واسطہ ہوتا ہے، نہ کسی اور کو کہ جو کچھ کاشت کار بے چارے کے پاس بچا ہے اس سے اس کے اور اس کے بال بچوں کا سال بھر گزارہ بھی ہو سکے گا؟

کارخانہ کا مالک گھر بیٹھے لاکھوں روپے ماہوار سمیٹتا چلا جاتا ہے اور جن کی محنت سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے، انہیں تین چار روپے روزانہ سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ جب اس سے کہئے کہ یہ محنت کشوں پر ظلم ہے تو وہ بڑے دھڑکتے سے کہتا ہے کہ یہ ظلم نہیں، عین انصاف ہے میں انہیں ان کی مقدار اجرت ٹھیک ٹھیک اور عین وقت پر ادا کر دیتا ہوں۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ ان کی یہ اجرت، جس میں انہیں دو وقت کے لئے کھانے تک کو بھی نہیں ملتا، مقرر کس نے کی ہے اور کس اصول اور قاعدے کے مطابق کی ہے؟

جب مزدور، چار روپے لے کر بازار جاتا ہے تاکہ وہاں سے وال آٹا خرید کر گھر لے جائے تو وہ دوکاندار سے پوچھتا ہے کہ بھائی، کل تو دال دو روپے سیر دی تھی، آج اڑھائی روپے کیوں مانگ رہے ہو، تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ آج اس کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ یعنی ہے تو، ورنہ آگے جاؤ۔ اور یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ بھاؤ خود بخود کیسے اوپر چڑھ جاتا ہے اور اگر خود بخود نہیں چڑھتا تو اسے کون اوپر

چڑھاتا اور نیچے اتارتا ہے۔

یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ایسا کچھ اس معاشی نظام کی رُو سے ہوتا ہے جسے انسان خود متشکل کرتے ہیں۔ اس میں نہ تقدیر کا کوئی ہاتھ ہوتا ہے نہ انسانوں کے پچھلے جنم کے کرموں کا کوئی واسطہ۔ خدا نے رزق پیدا کیا لیکن اس کی تقسیم اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ (تقسیم رزق کے نظام کو معاشی نظام کہا جاتا ہے)۔ اس کے لئے اس نے اصول و قوانین بذریعہ وحی عطا کر دیئے اور کہہ دیا کہ اگر رزق کی تقسیم ان اصولوں کے مطابق کی جائے گی تو دنیا میں کوئی انسان اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہے گا۔ لیکن اگر اس کی تقسیم انسانوں نے اپنے وضع کردہ نظام کی رُو سے کی تو معاشرہ میں ایسی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی جن سے انسانوں کی دنیا و زندوں کا بھٹ بن کر رہ جائے گی۔

قرآن کریم نے اس معاشی نظام کے جو اصول و حدود متعین کئے ہیں، اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کا یہ مقام نہیں۔ وہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر میں تفصیلی طور پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس وقت صرف چند بنیادی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن کا معاشی نظام (۱) رزق کا بنیادی سرچشمہ زمین ہے، جسے تمام انسانوں کے لئے سامانِ زیست ہتیا کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی فاقی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زمین کو خاص طور پر آمِضِ اَمْلَہِ (۱۱/۶۳)۔ یعنی خدا کی زمین کہا ہے اور اس کی تصریح کر دی ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (۲/۲۹)۔ یعنی زمین پر کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس میں جو کچھ (سامانِ زیست) ہے اسے خدا نے تمام نوعِ انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْہَا مَعٰیِشًا (۱۵/۲۰)۔ اس میں تم سب کے لئے سامانِ معیشت ہے۔ یٰرٰثِیْنَآ اَللّٰہُ اَدِیْبٌ (۵۰/۱۱)۔ یعنی خدا کے بندوں کے

لے اس سلسلہ میں نظامِ ربوبیت، خدا اور سرمایہ دار، مستقل تصانیف کے علاوہ معاشی مسئلہ کے متعلق میرے متفرق مضامین کا مطالعہ مفید ہے گا۔ ان کی تفصیل ادارۃ طُلوعِ اسلام، گلبرگ، لاہور سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

لئے رزق کا ذریعہ لہذا اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ سَوَاءٌ لِّلرَّسَالِیْنَ (۱۰/۴۱)۔ یہ جو زمین کے مالک کہلاتے ہیں ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ کسی زمانے کے غلط نظام میں کسی نے زمین کے رقبوں پر لکیریں کھینچ کر کہہ دیا کہ یہ میری ملکیت ہیں۔ اس کے بعد اس کی وہ "ملکیت" یا وراثت آگے منتقل ہوتی چلی آئی اور یا اس نے اسے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی ملکیت ابتدا ہی باطل تھی، وہ وراثت یا بیع و شری سے کس طرح حق (جائز) قرار پا جائے گی۔ قرآنی نظام میں زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہتی۔ وہ معاشرہ کی تحویل میں رہتی ہے اور (نظام مملکت) ایسا انتظام کرتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اسے لوگوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ (۲) انسان نے سکہ کی ایجاد اس لئے کی تھی کہ اس سے سامان زیست کی نقل و حرکت یا خرید و فروخت میں آسانی رہے۔ بجائے اس کے کہ ایک شخص گیہوں، ایک گاڑی میں لا کر اسے پچاس میل کے فاصلہ پر لے جائے اور وہاں سے اس کے تبادلہ میں، کپڑے کا تھکان لائے، یہ آسان تھا کہ وہ گیہوں کو اپنے مقام پر فروخت کر کے، دوسری جگہ سے کپڑا خرید لائے۔ سکہ کی ایجاد تو اس مقصد کے لئے ہوئی تھی لیکن لوگوں نے اسے جمع کر کے رکھنا شروع کر دیا اور اس کے زور پر محنت کشوں کی کمائی ہتھیانے لگ گئی۔ اقتصادی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اب معاوضہ محنت کا نہ رہا۔ بلکہ سرمایہ کا بن گیا۔ اسے نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ یعنی وہ نظام جس میں سرمایہ خود بخود اپنے آپ کو بڑھاتا چلا جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے ربو کہتے ہیں جو قرآنی نظام معیشت کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ (۲/۲۴۹-۲۵۰)۔

قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دولت کا جمع کرنا، اس جہنم کا ایندھن فراہم کرنا ہے جس میں انسانیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے۔ (۳۴-۳۵) (۹/۲۵)؛ (۱۵-۱۸) (۴۰/۱۸)۔ اسے معاشرہ میں گردش کرتے رہنا چاہیئے اور وہ بھی اس طرح کہ یہ صرف اوپر کے طبقہ ہی میں مصروف گردش نہ رہے، دوران خون کی طرح سارے جسم میں گردش کرے۔ (۵۹/۴۱)۔ لہذا، قرآنی معاشرہ میں، زائد از ضرورتِ رُپیہ کسی کے پاس نہیں رہتا۔ (۲/۲۱۹)۔

(۳) رزق پیدا کرنے (یعنی کام کرنے) کی صلاحیتیں، مختلف افراد میں مختلف ہوتی ہیں۔ صلاحیتوں کا

یہ اختلاف صرف اس مقصد کے لئے ہونا چاہیے کہ معاشرہ کے مختلف کام باسانی سرانجام پاتے رہیں۔ اسے تقسیم عمل کہتے ہیں۔ (۴۳/۳۲)۔ مختلف صلاحیتوں کے افراد اپنی اپنی صلاحیت استعداد کے مطابق کام کریں۔ اور اس کا ماحصل (سامانِ رزق) ہر ایک کی ضروریات کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ (۱۱۶/۴۱) و (۱۶/۵۳)۔ یہ قانونیت (سربایداری کا خدا فراموش نظام) ہے جس میں ذہنیت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ میں نے کمایا ہے، وہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اسے میں دوسروں کو کیوں دے دوں (۲۸/۴۸)۔ قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت، سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنا موجب ہے۔ (۳۹/۲۹)۔

(۴) اس قسم کا معاشی نظام وہ حکومت قائم کرتی ہے جو قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے۔ (اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے)۔ خدا نے جو کہا تھا کہ تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق مہیا کرنے کے ذمہ دار ہم ہیں، تو اس کی یہ ذمہ داری اس حکومت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے! اس مملکت میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم رہتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد دولت رہتی ہے۔

(۵) یہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو خدا کے ساتھ یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ”ہم اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں“ اور اس کے عوض میں، خدا انہیں جنت عطا کرنے کا وعدہ دیتا ہے (۹/۱۱۱)۔ دنیاوی زندگی میں یہ ”جنت“ اسلامی مملکت کے ہاتھوں تشکیل ہوتی ہے اور آخرت کی جنت، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق۔

یہ ہے وہ نظام جس میں کسی فرد کو تقدیر کا رونا نہیں ٹاپڑتا کیونکہ اس میں کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہتی۔ اس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم، اس لئے اس میں ہر ایک کو ”رضاقِ کسیمہ“ عزت کی روٹی ملتی ہے۔ رزق تو باطل نظام میں بھی ملتا ہے لیکن اس میں، بالادست، مستبد طبقہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ انہیں بلا محنت و مشقت، رزق کی فراوانیاں، قوت کے نشہ میں بدمست کر دیتی ہیں اور اس طرح وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے (۲۸/۵۸)۔ اور پچھلے طبقہ میں وہ تمام برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو غربت و افلاس کا فطری نتیجہ ہیں اور جن کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ”جس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے وہ قیامت میں بھی اندھا رہتا ہے“ (۲۰/۱۲۲ و ۱۴/۴۲)۔ اس کے برعکس جو رزق

قوانین خداوندی کے مطابق تقسیم کی رو سے ملتا ہے، وہ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰی ہوتا ہے (۲۰/۱۳۱) یعنی بہتر اور خوشگوار بھی اور محکم اور درپا بھی۔ اس میں افراد کو ان کی محنت کے مطابق ہی نہیں ملتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ یعنی اس قدر جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ یہ معاشرہ اس لئے قائم کیا جاتا ہے۔ لِيَجْزِيَہُمْ اللہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوا۔ دَیْزِ یُدَہُم مِّنْ فَضْلِہ۔ خدا انہیں ان کے کاموں (محنت) کا معاوضہ بطریق احسن دیتا ہے۔ بلکہ اپنے فضل سے انہیں ان کی محنت سے بھی زیادہ دیتا ہے۔ وَ اللہُ یَزِیْرُ قٰی مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۲۴/۳۸)۔ یوں اللہ انہیں اتنا دیتا ہے کہ محنت کا معاوضہ (اُجرت) مقرر کرنے والے دنیاوی معیار، دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس "معاوضہ" کے متعین کرنے کا معیار، ان کے حساب کتاب سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہی وہ معیار خداوندی ہے جس کے پیش نظر خدا نے اپنے آپ کو خَيْرُ الرّٰزِقِیْنَ

خدا خیر الرّٰزِقِیْنَ ہے

کہا ہے (۲۳/۷۲)۔ یعنی رزق دینے والوں میں بہترین رزق دینے والا۔ رزق تو غیر خداوندی نظام میں بھی ملتا ہے لیکن جو رزق نظام خداوندی میں ملتا ہے اس کی نوعیت اور کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

اے خدا نانا نے دہد، جانے دہد
ایں خدا جانے بُرد نانا نے دہد

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس قسم کی حکومت ملتی کس قوم کو ہے اور کس طرح ملتی ہے۔ اس کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔

(۴۱) یَزِیْرُ قٰی مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ

(۱) خدا نے انسان کو پیدا کیا تو رزق کے سامان اور وسائل بھی ساتھ ہی مہیا کر دیئے۔

(۲) لیکن ان ذرائع و اسباب سے رزق، محنت اور کاوش سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی قوانینِ فطرت کی رُو سے۔

(۳) حاصل شدہ رزق کی تقسیم کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اسے نہ قوانینِ فطرت کی رُو سے حل کیا جاسکتا ہے، نہ تنہا انسانی عقل و فکر کی رُو سے۔ اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

(۴) قوانینِ فطرت اور قوانینِ وحی، دونوں کے لئے، قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح، مشیتِ خداوندی ہے۔ یعنی وہ قوانین جنہیں خدا نے اپنے اختیار و ارادہ، اپنی مرضی اور مشیت کے مطابق مقرر کیا ہے۔

(۵) رزق کے معاملہ میں، قرآنِ کریم میں جہاں مَن یَشَاءُ آئے گا، وہاں اگر فاعل خدا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا اپنے قوانینِ مشیت کے مطابق، رزق کی بست و کشاد کرتا ہے۔ اور جہاں اس کا فاعل انسان ہوگا وہاں مراد یہ ہوگی کہ جو لوگ قوانینِ مشیت کا اتباع کریں گے انہیں رزق فراوان اور باعزت حاصل ہوگا۔ جو ان قوانین سے اعراض برتیں گے، وہ بھوک اور افلاس کے ذلت آمیز عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں عنوان ۲ پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے جس میں بتایا گیا ہے کہ رزق ملنے کی شرائط کیا ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں مَن یَشَاءُ کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا۔

سورہ زمر میں قارونی ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی کیفیت بھی عجیب ہے۔ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اور جب خوشحالی اور رزق کی فراوانی میسر آتی

مَن یَشَاءُ کا صحیح مفہوم ہے تو اکثر جانتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مجھے اپنی ہنرمندی کی بدلت حاصل ہوا ہے اس لئے اس میں کسی اور کا حصہ کس طرح ہو سکتا

ہے۔ حالانکہ یہی ذہنیت تمام فتنوں کی جڑ ہے اور انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کا بنیادی سبب۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں۔ یہ ذہنیت نہ کسی ایک فرد تک محدود ہے نہ کسی ایک زمانے کے انسانوں تک۔ ہر زمانے کے سرمایہ دار ایسا ہی کہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ، تاریخ اس کی بھی شہادت دے گی کہ اس ذہنیت کا نتیجہ تبسا ہی

بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ ان کے سامنے آجاتا تھا۔ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ هُوَ لَوْءٌ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا لَهُمْ بِمُخْرِجِنَیْنِ۔ اور ہمارا یہ قانون (کہ غلط معاشی ذہنیت اور نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے)۔ نہ کسی خاص زمانے سے فطرت تھا نہ کسی خاص قوم تک محدود۔ اسے رسول! تیری مخاطب قوم میں سے بھی جو لوگ اس قسم کے ظلم و استبداد اور سلب و ہنسب کی روش اختیار کریں گے ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ یہ لوگ ہمارے قانون مکافات کو شکست نہیں دے سکیں گے۔

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی تباہیاں، انسانوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ اس کے بعد ہے اَوْ لَمْ يَعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّوْعٰی صُوْنٌ ۝۵۱ (۳۹/۵۲)۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ خدا لِمَنْ يَشَاءُ رزق فراواں دیتا ہے اور لِمَنْ يَشَاءُ ناپ تول کر دیتا ہے۔ اس میں ہر اس قوم کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتی ہے۔ مروجہ تراجم کی رو سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ”کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ خدا جس کے لئے چاہتا ہے رزق کی کثاد کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے۔“ یعنی پیچھے سے یہ بیان ہوتا چلا آ رہا ہے کہ ہمارا ایک اہل قانون ہے جس کے مطابق رزق کی بست و کشاد ہوتی ہے، اسی قانون کے مطابق اب بھی ہوگا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ ہمارے ہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں۔ ہم جس کی روزی چاہیں تنگ کر دیتے ہیں، جسے چاہیں رزق فراواں دے دیتے ہیں، نہ صرف بے ربط ہوگا بلکہ ایک دوسرے سے متضاد اور متخالف ہوگا۔ اور جب صورت یہ ہو کہ رزق کی بست و کشاد کے لئے کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں، یہ خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جسے چاہے بافراط رزق عطا کر دے، جس کی چاہے روزی تنگ کر دے، تو اس کے بعد یہ کہنا بھی بے معنی ہو جاتا ہے کہ اس بات میں مومنین کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ یہ تو اسی صورت میں کہا جائے گا جب یہ بتانا مقصود ہو کہ یہ سب کچھ خاص اصولوں اور قاعدوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اقوام سابقہ کے تاریخی نوشتے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ لہذا، اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ (یہ ہے رزق کی بست و کشاد کے لئے ہمارا قانون) جو قوم بھی اس قانون کے مطابق روش اختیار کرے گی اسے بافراط رزق مل جائے گا۔

جو اس کی خلاف ورزی کرے گی اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے گا (اس قانون کے مطابق) جو شخص رزق فراواں حاصل کرنا چاہے اسے رزق فراواں مل جائے گا۔ جو نبی ملی روزی لینا چاہے اسے ویسی روزی مل جائے گی۔

اور اگر اس آیت میں اللہ کو فاعل قرار دیا جائے تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق فراواں رزق دیتا ہے اور اپنے قانونِ ہی کے مطابق رزق تنگ کر دیتا ہے۔

سورہ قصص میں اس حقیقت کو قاسم ورنے کا نام لے کر بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ قانون

قانون کی مثال | اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، بے ساختہ پکار اٹھے کہ **وَيَكُنَّ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ** (۲۸/۸۲)۔ بے شک رزق کی بست و کشاد انسان کے اپنے تصورات کے مطابق نہیں بلکہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔

اسی طرح سورہ روم میں ہے کہ **وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا**۔ جب ہم انسان کو رزق فراواں عطا کرتے ہیں تو وہ بہت اتراتا ہے۔ **وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَسْتَأْذِنُوا** **قَدْ مَتَّ آيَاتِنَاهُمْ إِذَا هُمْ يَفْقَهُونَ** ۵۔ اور جب ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ان پر تنگی آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے **أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ** ۶ **إِنِّي فِي ذَلِكَ لَظَوِّيرٌ** **لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ** ۵ (۳۰/۲۷-۳۶)۔ یہاں **لِمَنْ يَشَاءُ** کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی جو شخص رزق فراواں لینا چاہے، وہ اس قانون کے مطابق چلے، جو تنگی میں رہنا چاہے، وہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ تنگی رزق کی مصیبتیں انسانوں کے اپنے ہاتھوں (ان کے غلط نظام) کی آوردہ ہوتی ہیں۔

سورہ رعد میں ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ باندھے ہوئے عہد (معاہدہ) کو توڑ ڈالتے ہیں اور نوعِ انسان کو ایک برادری سمجھنے اور بنانے کے بجائے انہیں طبقات میں تقسیم کر دیتے ہیں، ان کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ **اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ** (۱۳/۲۶)۔ رزق کی بست و کشاد خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس قانون کے مطابق جو شخص یا قوم

جس انداز اور پیمانے کا رزق لینا چاہیے، لے لے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں، معاشرہ میں اخلاقِ حسنہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يَقْدِرُ ۖ (۳۰-۱۴/۲۳)۔ بات واضح ہے کہ جس قسم کا معاشرہ تم متشکل کر لو گے، اسی کے مطابق رزق کی بستی و کشاد ہوگی۔ جس معاشرہ میں اپنے متعلقین اور گروہ پیش کے انسانوں سے حسن سلوک اور خوش معاملگی کا ہر تاؤ ہوگا اس میں رزق کی کشاد ہوگی۔ جس میں نفسا نفسی کا عالم ہوگا، اقتصادِ ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

جو معاشرہ، قرآنی اقدار کے مطابق متشکل ہوتا ہے اس میں معاشیات کی بنیاد ”انفاق“ پر ہوتی ہے۔ قرآن کی یہ اصطلاح بڑی معنی خیز ہے۔ اس کا مادہ

انفاق سے کیا مراد ہے

(ن۔ ف۔ ق) ہے۔ پہلے زمانے میں، روپیہ پیسہ ایک میانی (یا تھیلی) میں رکھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ میانی یا تھیلی کا اوپر کا حصہ (مُنہ) تو کھلا ہوتا ہے تاکہ اس میں روپیہ ڈالا جاسکے لیکن نچلا حصہ بند ہوتا ہے تاکہ اس میں سے روپیہ نکل نہ جلتے۔ اس کے برعکس، مَنِيْفَقٌ اس میانی کو کہتے تھے جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ یعنی جس میں ایک طرف سے روپیہ ڈالتے جائیں اور دوسری طرف سے وہ نکلتا جائے۔ اس سے ”انفاق“ کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔ یعنی ایسا معاشی نظام جس میں رزق کسی ایک جگہ بند ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وہ ضرورت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رہے۔ اور کھلا بھی ”فِي سَبِيلِ اللّٰهِ“ یعنی کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر اپنی محنت کے حاصل کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رکھنا چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے۔ يَسْأَلُوْكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْاَعْفُوْ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ یہ ہے وہ نظام جس کے متعلق کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے عمدہ کھیتی میں بیج کے ایک دانے سے، سینکڑوں دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی آیات (۲۴۱-۲۴۷) میں دیکھئے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی برکات کا ذکر کس طرح جھوم جھوم کر کیا گیا ہے۔ دیگر مقامات میں اسے ”اللہ کو قرض دینے“ سے تعبیر کیا گیا ہے جو کئی گنا ہو کر واپس ملتا ہے۔ (۲/۲۲۵)۔ اسی سلسلہ میں سورۃ سبأ میں کہا کہ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ

مِنْ عِبَادِهِ ذَوُ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ ۖ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۚ وَ
هُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ (۳۹/۳۴) ان سے کہہ دو کہ رزق کی بستی و کشاد خدا کے قانونِ مشیت
کی رُو سے ہوتی ہے۔ (اور وہ قانون یہ ہے کہ) تم جس قدر رزق کھلا رکھو گے وہ کئی گنا ہو کر واپس ملے گا۔
یاد رکھو! خدا بہترین رزق دینے والا ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رزق کے بستی و کشاد کی دو شکلیں ہیں۔ پہلے یہ کہ خدا کے قوانینِ طبیعی
(قوانینِ فطرت) کے مطابق، علم و عقل اور محنت و کاوش سے رزق پیدا اور حاصل کرنا۔ اور دوسرے
یہ کہ رزق کی تقسیم، خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق کرنا۔ یعنی معاشرہ کا معاشی نظام، قوانین
خداوندی کے مطابق متشکل کرنا۔ اس سے رزق ”بغیر حساب“ ملتا ہے۔ ”بغیر حساب“ کے متعلق ہم
بتا چکے ہیں کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے
رزق بغیر حساب لئے خدا کے ہاں بھی کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ وہاں تو ہر بات کا فیصلہ

قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رزق کا حصول اور تقسیم قوانینِ
خداوندی کے مطابق ہو، تو اس سے رزق کی فراوانی اس قدر ہوتی ہے جو تمہارے سامانِ گمان میں بھی
نہ ہو۔ وہ تمہارے حساب کتاب، تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ ہم خود اپنے
ہاں کر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں زراعت، قدیم طریقوں کے مطابق ہوتی چلی آتی تھی جس سے ایک ایکڑ
ارضی میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس من گیہوں پیدا ہوتا تھا۔ ہم نے زراعت کے جدید طریقے اختیار
کئے۔ کھیتی کے لئے مشینیں منگائیں، ”میکسی پاک“ گیہوں کا بیج منگایا۔ سائنٹفک طریقے سے تیار
کردہ مصنوعی کھاد ڈالی، قاعدے اور قانون کے مطابق آبپاشی کی۔ نتیجہ یہ کہ اسی
ہمارا اپنا تجربہ زمین سے (جس سے کبھی بیس پچیس من فی ایکڑ سے زیادہ فصل پیدا نہیں

ہوتی تھی) ڈیڑھ ڈیڑھ سو من فی ایکڑ کے حساب سے گیہوں پیدا ہو گیا۔ اس نے زمینداروں (بلکہ ہمارے
محکمہ زراعت کے دانشوروں تک) کے تمام حساب و قیاس کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔

لیکن اس کے بعد، سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے اپنی کارستانیاں شروع کر دیں۔ منڈیوں میں گیہوں
کے بھاؤ گر گئے اور دیگر اشیائے صرف کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ گیہوں کی خریداری کی رفتار سُست
ہو گئی۔ غلہ، چور و رازدوں سے سمسکل ہو کر باہر جانے لگ گیا۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں خوشحالی کے بجائے

غربت اور افلاس پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے۔ ہم نے جس طرح قوانین فطرت کی ہم آہنگی سے غلہ اس قدر افراط میں پیدا کیا گیا تھا، اگر اس کا صرف بھی متقل اقدار خداوندی کے مطابق (الحسب ضاقت اللہ) ہوتا تو ملک میں ”دودھ اور شہد کی نہریں“ بہنے لگ جاتیں۔ پھر فی الواقعہ میں رزق بغیر حساب ملتا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ جب معاشرہ کا نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جنہیں کاروبار (بیع و تجارت) کی انفرادی مفاد پرستیاں، قوانین خداوندی سے غافل نہ ہونے دیں اور وہ ایتائے زکوٰۃ (نوع انسان کو سامان نشوونما مہیا کرنا) اپنی ذمہ داری قرار دے لیں، اور غلط معاشی نظام کے ہاتھوں جو تباہ کن انقلاب آیا کرتا ہے اس سے خائف رہیں، تو اس معاشرہ میں لَيَجْزِيَنَّهُمْ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا۔ خدا ان کی محنت کا بدلہ بطریق احسن دیتا ہے (ان کے کھیت سوسومن فی ایکڑ کے حساب سے فصل پیدا کرتے ہیں) اِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ هُمْ قُوَّةً فَضْلِهٖ۔ اور رزق کی صحیح تقسیم کی وجہ سے، اس میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۵ (۲۳/۳۸)۔ اس طرح، خدا رزق کی اتنی فراوانی کر دیتا ہے جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ اور یہ افراط رزق اور خوشحالی ہر اس قوم کو مل سکتی ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے (مَنْ يَّشَاءُ)۔

اسلام کے صدرِ اول ہیں، جماعتِ مومنین کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس پر ان کے مخالفین

(سردارانِ قریش) ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ ان کی حالت یہ ہے **صدرِ اول کے مومنین** کہ نہ کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں

قیصر و کسری کے تخت و تاج کے۔

فرہ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

کہا کہ انہیں علم نہیں کہ یہ قوم، خدا کے قوانینِ مشیت کے مطابق کام کرنے کے لئے ابٹھی ہے۔ اس پروگرام کے ابتدائی ایام میں بے حد مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بھوک، افلاس، اتلافِ جان و مال، فصلوں اور کھیتوں کی خرابی، یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ (۲/۱۵۵)۔ لیکن آخر الامر اللّٰهُ يَزِيْدُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۵ (۲/۲۱۲)۔ خدا ان لوگوں کو جو اس کے قوانینِ مشیت کے مطابق کام کرتے ہیں، بلا حساب رزق دیتا ہے۔ چنانچہ اُمّی مفلس اور نادار قوم

کو اس طرح بے حساب رزق ملا کہ محکمہ کے قریش ہی نہیں، دنیا بھر کے حساب دان، ششدر و حیران رہ گئے۔ اور آج تک ششدر و حیران ہیں۔ یہی وہ قوم تھی کہ جب اسے رزق کی یہ فرادانیاں حاصل ہوئیں تو ان کی زبان پر بے ساختہ آگیا کہ ہاں الہا! اس میں کوئی کلام نہیں کہ تَزْرُقُنِي مِّنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۳/۲۶)۔ جو تیرے قانونِ مشیت سے ہم آہنگ رہتا ہے تو اسے بغیر حساب رزق دیتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات سے، مَنْ يَشَاءُ اور مَنْ تَشَاءُ کا قرآنی مفہوم نکھر کر سامنے آگیا ہوگا لیکن آخر میں ہم دو اور آیات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ آئینہ اور بھی مصفا ہو جائے گا۔ سورہ شوریٰ میں پہلے یہ کہا کہ اللّٰهُ لَطِيفٌ رَّحِيمٌ ۝ خدا کے لطف و کرم بے پایاں ہیں۔ يَزْرُقُ مَنْ يَشَاءُ۔ وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق رزق دیتا ہے، وہ اس طرح کہ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۝ جو شخص مستقبل کے مفادات چاہتا ہے ہم اس کی کھیتی میں اس کے مطابق انصاف کر دیتے ہیں۔ وَ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُوفِّرْ لَهُ مِنْهَا ۝ وَ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن تَصْنِيفٍ ۝ (۱۹۱-۲۰/۲۲)۔ اور جو شخص محض طبعی قوانین کے مطابق دنیاوی مفاد ہی چاہتا ہے، ہم اسے بھی اس کی محنت کا ماحصل دیدیتے ہیں، لیکن چونکہ وہ رزق کی تقسیم میں مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتا اس لئے مستقبل کی خوشحالیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

یہاں دیکھئے مَنْ يُرِيدُ کہا گیا ہے۔ یعنی جو شخص یوں چاہے، ہم اس کے لئے یوں کر دیتے ہیں۔ يَزْرُقُنِي مِّنْ تَشَاءُ۔ جو جیسا چاہتا ہے اس کے مطابق اسے رزق مل جاتا ہے۔

اور آخر میں، سورہ ناس کی وہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ وَ اِذَا قِيلَ لَهُمْ اَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْظِرْهُمْ مِّنْ تَوْشٰٓءِ اللّٰهِ اَطَعْتُمْ ۚ جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے عطا کردہ رزق کو کوئی نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رکھو، تو یہ لوگ، جماعتِ مومنین سے کہتے ہیں کہ واہ! تم بھی کمال کرتے ہو، رزق کا بست و کشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے فراداں رزق دے۔ جسے چاہے غریب اور تنگ حال رکھے۔ یہ مفلس اور غریب اس لئے تنگ حال ہیں کہ خدا انہیں کشادہ رزق دینا نہیں چاہتا۔ تو تم جو ہم سے کہتے ہو کہ ہم انہیں کھانے کو دیں، تو یہ خدا کی مرضی اور مشیت کے خلاف

ہوگا۔ اگر وہ انہیں بھوکا نہ رکھنا چاہے تو انہیں خود ہی رزق دیدے۔ اس کے جواب میں کہا کہ اِنَّ اَنْتُمْ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۶/۴۱)۔ ان سے کہہ دو کہ تم کس قدر راہ گم کردہ ہو جو یَزْنُ قُ مَنْ يَشَاءُ کا یہ مفہوم لیتے ہو۔ خدا نہ کسی کو یونہی فراواں رزق دیتا ہے، نہ کسی کو بھوکا مارتا ہے۔ رزق اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ کشادہ بھی اور نپا تلا بھی۔ جو جیسا رزق لینا چاہے، اس کے مطابق کام کرے اور ویسا نظام قائم کرے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (۱۶/۷۱)

(اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے) قبل اس کے کہ ہم اس منزل سے اگلی منزل کی طرف قدم اٹھائیں، ان دو آیات کا سامنے لانا ضروری ہے جن کا صحیح مفہوم پیش نظر نہ ہونے سے 'رزق کے معاملہ میں' "قسمت یا تقدیر" کے مروجہ عقیدہ کو تقویت ملتی ہے۔ ان میں سے ایک آیت (۱۶/۷۱) ہے جس کا پہلا حصہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں پر رزق میں برتری حاصل ہے تو خدا کا خود ارشاد ہے کہ یہ اسی کی عطا کردہ ہے۔ اس لئے امارت اور غربت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق کے معاملہ میں ایک دوسرے پر برتری کا تعلق اقوام سے بھی ہے اور افراد سے بھی۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بعض قویں بڑی خوشحال ہیں اور ان کے مقابلہ میں دوسری قویں بڑی پس ماندہ۔ اسی طرح مختلف افراد میں بھی اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں اور استعدادیں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر یہ فرق خدا ہی کا پیدا کردہ ہے تو عقیدہ جبر کے مؤیدین کا کہنا ہے کہ یہ سمجھنا کیوں غلط ہے کہ رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے، اَللّٰهُ فَضَّلَ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، قرآنی مطالب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے **فَضَّلَ کا صحیح مفہوم** | اس کے اندازِ بیان کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً

جب وہ کہتا ہے کہ (عالم خلق میں) خدایہ کرتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ بلا کسی قاعے اور قانون کے ایسا کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا کرتا ہے۔ (مثلاً) سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا نے کہا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ۔ اللہ ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ اور اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا کہ انسانوں کے اپنے غلط اعمال رنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں جس سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت معطل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی دیگر متعدد مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ یہی کیفیت وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کی ہے۔ ایک دوسرے پر رزق کی برتری یونہی "قسمت یا تقدیر" سے نہیں ہوتی۔ یہ خود انسانوں کی سعی و عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم قرآن کریم کی متعدد آیات سابقہ صفحات میں درج کر چکے ہیں۔ ان میں سے دو ایک کا اعادہ ضروری ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۱۷-۲۱ کو دیکھئے جن میں کہا گیا ہے کہ جو شخص دنیا کے مفاداتِ عاجلہ پسنا چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے اسے ہم مفاداتِ عاجلہ دے دیتے ہیں جو ان کے ساتھ اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے اسے دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہم ان دونوں کو، ان کی سعی و عمل کی نسبت سے یہ انسان کی اپنی سعی و عمل کا نتیجہ ہوتا ہے میں کہیں بند نہیں لگا دیئے کہ ایک گروہ کو

روک دیا جائے اور دوسرے گروہ کو آگے بڑھ جانے دیا جائے اور اس کے بعد ہے۔

أَنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (۱۷/۲۱)

دیکھو! ہم کس طرح ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر برتری

دیتے ہیں۔

یہاں زور (EMPHASIS) کَيْفَ (کس طرح) پر ہے۔ یعنی مختلف گروہوں میں تفاوتِ رزق تو ہے لیکن تمہیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ تفاوت کس طرح سے پیدا ہوا ہے؟ اس کی تفصیل پہلی آیات میں دے دی گئی ہے۔ یعنی ان گروہوں کی سعی و عمل کی نسبت سے ایسا ہوا ہے۔ خدا نے ایسا نہیں کیا کہ ایک گروہ کو روک دیا ہو اور دوسرے کو آگے بڑھ جانے کی چھٹی دے دی ہو۔ آپ

نے غور فرمایا کہ وہی آیت جس کے غلط مفہوم سے ”قسمت اور تقدیر“ کا عقیدہ وضع کیا جاتا ہے کس طرح اس عقیدہ کی تردید کر رہی ہے! اب اس سلسلہ کی دوسری آیت لیجئے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا كَامِفْهُومِ | **لَنَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا**
وَلَنَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (۳۲/۳۲)۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہو گا کہ ”دنیاوی زندگی میں لوگوں میں معیشت کی تقسیم ہم کرتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر بلندیِ مدارج عطا کرتے ہیں“ اس آیت میں لفظ قَسَمْنَا سے ”قسمت“ کا تصور پیدا کر لیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ دیکھئے! رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اسی کو انسان کی قسمت کہا جاتا ہے۔

اصولی طور پر جو کچھ ہم نے (اللَّهُ فَضَّلَ) یا (فَضَّلْنَا) کے سلسلہ میں کہا ہے، اس کی روشنی میں (قَسَمْنَا) کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ ہم نے اس باب کے شروع میں لکھا ہے کہ خدا نے سامانِ رزق پیدا کر دیا لیکن اس کی انفرادی تقسیم اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ یہ تقسیم انسانوں کے معاشی نظام کے مطابق ہوتی ہے۔ غلط (غیر قرآنی) نظام میں اس تقسیم سے ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ صحیح (قرآنی) نظام میں ناہمواریاں مٹ جاتی ہیں۔ یہاں (قَسَمْنَا) کے بعد جو کہا کہ **لَنَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ**۔ (ہم نے ایک کو دوسرے پر بلندیِ مدارج عطا کی ہے) تو اس سے خود تقسیمِ رزق کا اصول واضح ہو جاتا ہے۔ تعینِ مدارج کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے **لِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا (۱۳۳/۶)**۔ ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ اور اس کی تشریح متعدد مقامات پر کر دی کہ تعینِ مدارج کس طرح اعمال کی نسبت سے ہوتا ہے۔ سورۃ النصار میں اصولاً بتا دیا کہ مجاہدین (جدوجہد کرنے والوں) کے مدارج، قاعدین (بیٹھے رہنے والوں) یا تساہل انگیز لوگوں سے بلند ہوتے ہیں (۴/۹۵) دوسری جگہ کہا کہ ”حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینے والوں یا مسجد الحرام کی تزئین و آرائش کرنے والوں کے مقابلہ میں، مجاہدین اور مہاجرین کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ (۹/۱۹)۔ اسی طرح کی اور آیات بھی ہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اکتسابِ رزق کے معاملہ میں، دو باتیں

بنیادی ہیں۔

(۱) وہ وسائل و اسباب جو خدا کی طرف سے مفت اور بلا معاوضہ ملتے ہیں۔ مثلاً زمین اور مایہاں جو کچھ اس کے

اندر ہے (روشنی، حرارت، ہوا، پانی وغیرہ) انہیں خدا نے نعمتیں کہہ کر پکارا ہے۔ اور

(۲) انسان کی سعی و کوشش۔

جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے، وہ کثرۃ ارض پر ہر جگہ یکساں نہیں۔ قطبین کے برف پوش میدان اور یخ بستہ سمندر، پہاڑی علاقے، جنگلی خطے، صحرا، اور دوسری طرف سرسبز و شاداب، زرخیز و زرخشاں قطعات ارض، ان میں، زمین کی پیداواری صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا ہے اور آب ہوا میں بھی تفاوت۔ اس کا اثر ان علاقوں میں بسنے والی اقوام پر بھی پڑتا ہے۔ یہ وہ ”تقسیم“ ہے جس پر بنیادی طور پر انسان کو اختیار نہیں، اگرچہ محنت اور کوشش سے، اس تفاوت کے نتائج کو کم کیا، اور رفتہ رفتہ، مٹایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک دوسرے حصے (سعی و عمل) کا تعلق ہے، اس کا انحصار انسان کے اپنے اختیار و ارادہ پر ہے۔ اقوام میں ”تقسیم رزق“ ان دونوں عناصر کے امتزاج سے ہوتی ہے۔

اب آئیے افراد کی طرف۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض لوگوں میں افراد میں صلاحیتوں کا فرق

مطابق ان کی کمائی میں فرق ہوتا ہے۔ صلاحیتوں کے اس اختلاف و تفاوت کے وجہ و اسباب مختصر حسب ذیل ہوتے ہیں:-

(۱) بعض ذہنی نقائص جو بچے میں وراثتاً منتقل ہو کر آتے ہیں۔

(۲) بعض اسقام جو جنین میں پیدائش سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، یہ اسقام و نقائص طبعی ہوتے ہیں اور انسانی جسم کی مشینری کے متعلق، جوں جوں سائنس آگے بڑھتی جا رہی ہے، ان کی مدافعت یا ازالہ کی شکلیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ہم سر دست نہیں کہہ سکتے کہ رفتہ رفتہ ایسا وقت آجائے گا کہ تمام بچے، یکساں صلاحیتیں لے کر پیدا ہوں، لیکن یہ تو واقعہ ہے کہ یہ اختلافات رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لہذا، ان کا تعلق کسی ”غیر متبدل تقدیر“ سے نہیں۔

(۳) بچے کی ابتدائی تربیت و تعلیم اور وہ ماحول جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔

(۴) بچوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع، درس گاہیں اور ان کا نصاب تعلیم، نیز ان کی صحت کی دیکھ بھال، ان کی نفسیات کا مطالعہ وغیرہ۔

(۵) ان صلاحیتوں کے استعمال کے مواقع۔ طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND)

کے مسائل وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان امور کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ یعنی ان میں افراد، پورے پورے اختیارات کے مالک نہیں ہوتے۔ نظام معاشرہ کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن ”خدا کی مقرر کردہ قسمت یا تقدیر“ کا سوال یہاں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ صحیح معاشرہ کے قیام کو بھی قرآن، خدا کی نعمتوں میں شمار کرتا ہے، اس لئے افراد کو جو مفادات یا (ADVANTAGEOUS POSITION) ”حُسن معاشرہ کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں“ انہیں بھی قرآن، ”نعمۃ اللہ“ کہہ کر پکارتا ہے۔ بنا بریں اکتساب رزق میں یہ دو بنیادی عوامل کارفرما ہوتے ہیں:-

(۱) انسانی سعی و عمل۔ اور

(۲) نعمائے خداوندی۔ خواہ وہ بنیادی اسباب و وسائل رزق ہوں اور خواہ افراد کو، معاشرہ

کے حُسنِ نظم کی رو سے حاصل ہونے والے مفادات۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”نعمائے خداوندی“ کی کمی سے جو نقصانات ایک قوم یا افراد کو پہنچتے ہیں، ان کے نو وہ خود ذمہ دار نہیں ہوتے۔ وہ قومیں، دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ وہ افراد و گروہ افراد کے مقابلہ میں پست سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کا

اس کا ذمہ معاشرہ ہے

ذمہ دار کون ہوتا ہے!

قرآن کہتا ہے کہ اس کا ذمہ دار معاشرہ (یا دنیا) کا نظام ہے۔ اگر یہ نظام، مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم ہو تو پھر اس تفاوت سے، اقوام یا افراد کے حالات اور مدارج میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، قرآن ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جس میں انسانیت مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نہ ہو۔ جب انسانیت، اقوام میں بٹ جاتی ہے تو ہر قوم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جائز یا ناجائز طریقوں سے دوسری قوم سے آگے بڑھ جائے۔ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ مِّمَّنْ حَسْبُكَ مِنَ الْاُمَمِ (۱۶/۹۲)۔ لیکن جب وہ ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کر لے تو اس

وقت اگر کسی خاص خطہ زمین کے باشندوں کو "خدا کی نعمتوں" سے وافر حصہ ملتا ہے تو وہ اس کے بل بوتے پر اقوام کو لوٹنے کھسوٹتے نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ خَلِيفَةً اَلْاَرْضِ ضی۔ خدا نے تمہیں زمین میں تمکن و تسلط عطا کیا وَ تَرَاهُ فَعَّ بَعْضُكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مدارج کی بلندی ملی۔ لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا آتٰكُمْ (۶/۱۶۶)۔ تاکہ یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے اس سے تم کیا کرتے ہو؟ صحیح نظام میں اس سے نوع انسان کی عالمگیر منفعت کا کام لیا جاتا ہے کیونکہ مستقل قدر یہ ہے کہ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْنِكُمْ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷۱)۔ ثبات و دوام صرف اس چیز کے لئے ہے جو کسی خاص گروہ، طبقہ، قوم کی نہیں بلکہ عالمگیر انسانیت کی منفعت کا موجب ہو۔

اب رہا مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کا معاملہ، سو اس سلسلہ میں قرآن کریم نے ایسی اصولی تعینم دی ہے جس کی رُو سے ان اختلافات کا افراد پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا پہلا فرق معاشی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے کہا کہ یہ فرق صرف تقسیم کار کے لئے ہوگا۔ معاشرہ میں مختلف قسم کے کام ہوں گے جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہوں گی۔ اس اختلاف کا دائرہ ہمیں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُوْحْرٰیًا (۲۳/۳۲)۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیا جاسکے۔

جہاں تک معاشی تفاوت کا تعلق ہے اسے مٹانے کے لئے قرآن کریم نے ایسا نظام پیش کیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ اور یہ نظام پیش کیا ہے اسی آیت میں جو زیر نظر موضوع کے عنوان کے طور پر لکھی گئی ہے پوری آیت یوں ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۖ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلُوْا
بِرَادٍ رِّیْآ قِهْمُ عَلَىٰ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ اَفَلَا یَنْفَعُہُمْ
اَللّٰهُ یَجْحَدُ ذُنٰہُ (۱۶/۷۱)۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں لوگوں میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن غلط ذہنیت کے حامل انسان (غلط معاشرہ کے نظام کی رُو سے) اس تفاوت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وہ اپنی برزخ صلاحیتوں کی بنا پر جو زیادہ کمائی کرتے ہیں تو اسے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر اس کے مالک بن بیٹھتے ہیں اور اسے ان ماتحتوں کی طرف نہیں لوٹا دیتے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکفی نہیں ہوتی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے تو ہم سب برابر ہو جائیں گے، قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ ان کی زائد کمائی میں کتنے ایسے عوامل شامل ہیں جو نہ ان کے زرخیز ہیں اور نہ خود پیدا کردہ۔ ان میں سے بنیادی وسائل و اسباب خدا کے عطا فرمودہ ہیں اور صلاحیتوں کی برتری کے اسباب، معاشرہ کے ہتیا کردہ۔ پھر اس میں، ان کے ان ماتحتوں کا تعاون بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جب حقیقت یہ ہے کہ اس زائد کمائی کے اسباب میں بیشتر وہ ہیں جو انہیں بطور ”نعمائے خداوندی“ حاصل ہوئے ہیں۔ یعنی جو ان کی ذاتی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں۔ تو ان کا یہ کہنا کہ اس زائد کمائی کے ہم واحد مالک ہیں، اس حقیقت کا انکار ہے کہ اس (زائد کمائی) کا بیشتر حصہ نعمائے خداوندی کا رہن منت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (۱۶/۵۳)۔ جو چیزیں تمہیں بطور ”نعمائے خداوندی“ ملتی ہیں، وہ تمہاری اپنی نہیں ہوتیں۔ وہ خدا کی طرف سے ملتی ہیں، لہذا، ان کے ثمرات کے بھی تم مالک نہیں ہو سکتے۔ انہیں خدا ہی کے احکام کے مطابق صرف کرنا چاہیئے۔ یہ ان لوگوں کا حق ہے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اِنِّیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا مَخْلُوْمٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ وَ اَلَمْ حُزُوْمٌ (۲۵-۲۷/۲۷)۔ اس آیت میں لفظ حق بڑا غور طلب ہے۔ یعنی انہیں یہ چیز خیرات کے طور پر نہیں ملتی۔ وہ اسے اپنے حق کے طور پر لیتے ہیں اور طلب کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام معاشرہ میں اصول یہ کارفرما ہو گا کہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے مطابق کام کرے اور نظام مملکت ان کی ضروریات کا کفیل ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ صحیح قرآنی معاشرہ میں، صلاحیتوں کے تفادیت کا، افراد کی حالت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

بانی رہا سوسائٹی میں عزت کا معاملہ سو قرآن کریم کی رو سے، دولت و جہ تکرم ہی نہیں، اس کی طرف

سے عطا کردہ مستقل اقدار کی رو سے۔

معیارِ تکرم

(۱) ہر انسانی سچے محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں تکرم کا مستحق ہے۔ (۱۶/۷۰)۔

(۲) سوسائٹی میں مدارج کا تعین ہر فرد کے اعمال۔ حسن سیرت و کردار کی بنا پر ہوتا ہے۔ (۷/۱۳۳)۔ اور

(۳) سب سے زیادہ واجب الشکریم وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتا

ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیكُمْ (۱۳/۷۹)۔

لہذا، جب صلاحیتوں کے تفاوت سے، افراد کے احوال و کوائف پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تو یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ تفاوت کیوں ہے! یہ سوال تو غلط معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے جس میں یہ تفاوت، افراد کی ساری زندگی بلکہ زندگی کے بعد تک بھی، ہر گوشے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں، افراد کو پہلے ان وسائل و اسباب سے محروم رکھا جاتا ہے جن سے ان صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور پھر انہیں کہہ کر دھتکارا جاتا ہے کہ ان میں کوئی صلاحیت ہی نہیں۔ انہیں قدم قدم پر دھتکارا جاتا ہے اور، اس خیال سے کہ اس سے کہیں ان کی نگاہ اس طرف نہ اٹھ جائے کہ ہماری صلاحیتوں کے اس فقدان کے ذمہ دار خود یہ لوگ ہیں جو ہمیں اس طرح دھتکار رہے ہیں، انہیں یہ وعظ پلائے جاتے ہیں کہ یہ تفاوت خدا کی طرف سے ہے اور اس کی تائید میں اس قسم کے فریب آمیز دلائل کہ خدا نے پاؤں اس لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ سارے جسم کا بوجھ اٹھائیں اور زمین کی غلاظت میں آلودہ رہیں۔ سر کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ تاج شاہانہ پہنے۔ تم پاؤں کو سر کا مقام نہیں دے سکتے۔

یہ ہیں وہ لاطائل اور فرسودہ دلائل جن پر عقیدہ جبر کی عمارت قائم کی جاتی ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ خدا نے تاج شاہانہ کی سرفرازیوں کے لئے کیا قانون مقرر کیا ہے۔



تُعَزُّ مِنْ تَشَاءُ وَتُذَلُّ مِنْ تَشَاءُ

سورۃ آل عمران کی ایک آیت ہے:-

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذَلُّ مَنْ تَشَاءُ
بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۳/۲۵)

اس کا مروجہ ترجمہ یہ ہے۔

تو کہ۔ یا اللہ۔ مالک سلطنت کے۔ تو سلطنت دے دے جس کو چاہے اور سلطنت
چھین لے جس سے چاہے۔ اور عزت دے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے۔ تیرے
ہاتھ ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن)

حکومت اور سلطنت کا تصور تو عوام کی ذہنی سطح سے اونچا ہوتا ہے، اس لئے اس کے متعلق عام طور
پر باتیں نہیں کی جاتیں، لیکن عزت اور ذلت کی باتیں تو ہر گلی محلہ میں ہوتی رہتی ہیں۔ آج کل دولت
معیار عزت قرار پا گیا ہے۔ اس لئے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ابھی کل تک جو تیاں چٹخاتا پھر رہا
تھا اور آج لاکھوں کا مالک ہو گیا ہے، 'خواہ وہ دولت، سٹہ، چوربازاری، سمگلنگ، رشوت وغیرہ کچھ بیٹے
ہی کیوں نہ حاصل ہوئی ہو۔ اور دوسری طرف، نوابوں کے خاندان کا لڑکا جو کل تک چواپہ گاڑی میں ہوا
خوری کو نکلا کرتا تھا، بھیک مانگتا دکھائی دیتا ہے 'خواہ اس نے اپنی جائداد، قمار بازی اور شراب خوری
میں کیوں نہ اڑادی ہو) تو وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہاں بھائی! یہ سب خدا کی شان ہے۔ وہ

جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلیل کر دے۔ وہاں دم مارنے کی جا نہیں۔

قبل اس کے ہم اس (اور ان جیسی دیگر آیات) کے صحیح مفہوم کو سامنے لائیں، دو ایک باتیں تہیذا

عزت اور ذلت کے معنی | سمجھ لینا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس آیت (اور قرآن کریم کے دیگر مقامات میں) عزت اور ذلت کے جو الفاظ آئے ہیں، ان کا وہ مفہوم

نہیں جس مفہوم میں یہ ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں عزت کے معنی قوت، شدت، غلبہ ہوتے ہیں اور ذلت کے معنی مغلوبیت، قوت کا ٹوٹ جانا، کمزور ہو جانا۔ جن معنی میں ہم عزت کا لفظ استعمال کرتے ہیں، عربی زبان (اور قرآن کریم) میں اس کے لئے تکویم کا لفظ آیا ہے اور ہمارے مفہوم کے اعتبار سے ذلت کے لئے توہین کا لفظ، جس کا مادہ (و - ہ - ن) ہے۔

دوسرے یہ کہ دنیا پر مادی نظریہ حیات اس درجہ چھا گیا ہے کہ اب عزت کا معیار دولت قرار پا گئی ہے۔ امیر آدمی، خواہ اس کا کیر کٹر کیسا ہی کیوں نہ ہو، معاشرہ میں بڑا معزز سمجھا جاتا ہے اور غریب کے سب حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، حالانکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے ہاں عزت کا معیار، شرافت ہوتی تھی، نہ کہ دولت۔

تیسرے یہ کہ اس آیت سے جو یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا کے ہاں حکومت و سطوت اور عزت و تکویم کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں، وہ جسے چاہے (یونہی) حکومت اور اقتدار عطا کر دیتا ہے اور جس سے چاہے (یونہی) اسے چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے (یونہی) عزت دیدیتا ہے جسے چاہے (یونہی) ذلیل کر دیتا ہے، تو اس مفہوم کی تردید خود اس آیت کے یہ الفاظ کر دیتے ہیں کہ بیدل الخیر۔ یعنی خدا، خیر اور خوبی کا سرچشمہ ہے۔ حکومت کا چھن جانا اور عزت کا مٹ جانا، خیر اور خوبی نہیں۔ اس لئے یہ بات خدا سے کہ جو خیر و خوبی کا سرچشمہ ہے (بعید ہے) کہ وہ یونہی کسی کو ذلیل و خوار کر دے۔

اس کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ پہلے حکومت اور سلطنت، اختیار و اقتدار کو لیجئے۔ چھٹے باب میں ہم ”قوموں کی تقدیر“ سے متعلق تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین کیا ہیں۔ ان تفصیل کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس مقام پر صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہو گا کہ قرآن کریم کی رو سے، حکومت اور اقتدار حاصل ہونے کی شرائط

کی شرائط کیا ہیں۔ انہی کو قوانین مشیت کہا جائے گا۔

سورہ انبیاء میں ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا
عِبَادِي الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ غَافِلِينَ ۝

(۱۰۵ — ۱۰۶/۲۱)

ہم نے زبور (یا ہر کتاب وحی) میں، ضروری احکام و ہدایات دینے کے بعد، اس بات کو بطور
اساسی قانون لکھ دیا تھا کہ ارض (حکومت و سلطنت) کے وارث وہی لوگ ہوسکیں گے جن میں
اس کی صلاحیت ہوگی۔ یہ اساسی قانون ہر اس قوم کے لئے ایک دور رس حقیقت اپنے اندر رکھتا
ہے جو ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔

یعنی دراثت ارض کا قانون اساسی یہ ہے کہ یہ ”صالحین“ کو حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ”صالحین“
(اور اسی جہت سے ”اعمال صالح“) کا ایک خاص مفہوم مروج ہو چکا ہے جس کی تشریح میں جانے کی
ضرورت نہیں۔ دین کو جب ”مذہب“ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو اس کی اصطلاحات کام ہی حشر ہو جاتا
ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ”صالحین“ سے مراد ہوتے ہیں وہ
صالحین سے کیا مراد ہے | لوگ جن میں اس کام کی صلاحیت ہو جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اور اعمال صالح سے مراد ہوتے ہیں ایسے کام جو انسان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کر دیں۔ حکومت و
سلطنت کے سلسلہ میں جب کہا کہ یہ ”صالحین“ کو مل سکے گی تو اس سے مراد ہوں گے وہ لوگ جن میں
سلطنت حاصل کرنے اور حکومت قائم کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ اس ”صلاحیت“ میں دو باتیں شامل
ہوں گی۔ ایک تو طبعی صلاحیت، یعنی وہ تمام طبعی خواص و اسباب جن کی بنا پر سلطنت حاصل کی جاتی ہے
اور دوسرے وہ انسانی صلاحیتیں جن کی بنا پر حکومت، انسانوں کی تمدنی زندگی کو جنت ارضی میں تبدیل
کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کو صرف طبعی قوتیں حاصل ہیں اور وہ انسانی صلاحیتوں سے عاری ہے
اس کی حکومت، فرعون، ہلاکو، چنگیز، یا عصر حاضر کی خدا فراموش اقوام کی حکومت ہوگی۔ اس کے برعکس جس
قوم میں حکومت و سلطنت کے لئے طبعی صلاحیتیں نہیں ہوں گی، انہیں یہ اقتدار حاصل ہی نہیں ہوسکے گا
لیکن جس قوم کو طبعی صلاحیتیں بھی حاصل ہوں گی اور اس کے ساتھ، مستقل اقتدار خداوندی پران کا ایمان
بھی ہوگا، ان کی حکومت، خدا کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے گی۔ یہ وہ حکومت ہے

جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ..... (۲۴/۵۵)۔ جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین محکم رکھیں گے اور اس کے بعد ایسے کام کریں گے جو ان کی صلاحیتوں کو بیدار کر دیں، تو ہم انہیں حکومت و مملکت عطا کر دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ (اٹل قانون) ہے۔ اس قسم کی حکومت کا نتیجہ دین خداوندی کا ممکن ہوگا۔ اس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اس میں خالص قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کی جائے گی، کسی انسان کی نہیں۔ (۲۴/۵۵)۔ ان لوگوں سے یہ بھی تاکید طبعی اسباب حفاظت کی اہمیت

کہہ دیا کہ حکومت حاصل ہو جانے کے بعد ایسا نہ ہو کہ اس کے استحکام کے لئے جن طبعی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے، تم ان کی طرف سے غافل ہو جاؤ۔ بالکل نہیں۔ وَاعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَ عَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جس قدر سامان حرب و ضرب اور گھوڑوں کے رسالوں کی ضرورت ہو، انہیں ہر وقت تیار رکھو تاکہ اس سے تمہارے اور دین خداوندی کے دشمنوں کے دل میں تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ حکومت و مملکت کے لئے صلاحیت شرط ہے، قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی داستان کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ داستان بنی اسرائیل

کرنے کے بعد سورہ قصص میں کہا کہ وَ مُرِيدُ أَنْ..... وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ..... (۲۸/۶-۵)۔ بالآخر ہم نے ارادہ کر لیا کہ جس قوم کو غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر بے حد کمزور کر دیا گیا تھا، اس پر احسان کریں، اسے ان کی ہم عصر اقوام کی لیڈر شپ عطا کر دیں اور انہیں ملک میں ممکن عطا کر کے حکومت و سلطنت کا وارث بنادیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ”خدا نے اس کا ارادہ کر لیا تھا۔“ خدا کا ایک ارادہ تو عالم امر میں ہوتا ہے کہ إِذَا آمَنَّا شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۳۶/۸۲)۔ اُوھر اس نے ارادہ کیا اور اُدھر وہ شے ظہور میں آگئی۔ لیکن اس کا دوسرا ارادہ عالم خلق میں ہوتا ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے مختلف کڑیاں درکار ہوتی ہیں اور وہ انسانوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے متعلق خدا کے اس ارادہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے

حضرت موسیٰ کو ایک تفصیلی پروگرام دیا گیا جس کی بنیادی شق: بنی اسرائیل جیسی محکومیت زدہ قوم کی صحیح تعلیم و تربیت تھی۔ اس کے لئے حضرت موسیٰ نے انتہائی کوشش کی لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ وہ کسی ایک بات پر جم کر بیٹھتے ہی نہیں تھے۔ ان کی اس تلون مزاجی کی بنا پر حضرت موسیٰ نے ان سے بار بار کہتے تھے کہ اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاٰمِرَیْنَ یُّوْسِرُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (۴/۱۳۸)۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تمہیں حکومت و سلطنت مل جائے گی لیکن یہ یو نہی نہیں ملا کرتی، یہ ملا کرتی ہے خدا کے قابضانِ مشیت کے مطابق جس کی رُو سے اولیں شرط یہ ہے کہ تم اپنے اندر اس کی صلاحیت پیدا کرو اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اس پروگرام پر استقامت اور استقلال سے عمل پیرا ہو اور اس حقیقت پر ایمان رکھو کہ راستے میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آئیں، انجام کار وہ لوگ ضرور کامیاب ہونگے جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کریں گے۔ لیکن اس قوم نے اپنی رُش کو نہ بدلا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاتَّخَذُوا مَحَرَّمَاً مِّنْهُ عَلَیْهِمْ اَمْرًا بَعِیْنًا سَنَةً یَّتَبَیْهُوْنَ فِی الْاٰمِرِیْنَ... (۵/۲۶)۔ وہی سرزمین جسے ان کے نام لکھ دیا گیا تھا، چالیس سال تک ان پر حرام کر دی گئی اور حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ انہیں صحرائے سینا میں سرگرداں پھرنے دو اور اپنی توجہات ان کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دو۔ چنانچہ اس طرح یہ غلامی کی فضاؤں کے پروردہ سہل انگار ”بڑے بوڑھے“ ختم ہو گئے اور جہان کی نئی نسل پروان چڑھی تو انہوں نے ایک ہی جست میں اس سرزمین پر قبضہ کر لیا اور تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ الْخُسْفٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ۔ بِمَا صَبَرُوْا (۴/۱۳۷)۔ اور اس طرح خدا کی وہ بات جو اس نے بنی اسرائیل کے لئے کہی تھی پوری ہو گئی۔ وہ اس لئے پوری ہو گئی کہ وہ ہمت اور استقامت سے اپنے پروگرام پر جمے رہے تھے۔ کَذٰلِکَ دَاوَرْنَا بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ (۱۲۶/۵۹)۔ یوں ہم نے بنی اسرائیل کو اس مملکت کا وارث بنا دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ دراثہ ارض کا قانون کس طرح صلاحیت سے مشروط ہے۔

قصہ حضرت طاوت | قصہ حضرت طاوت میں مَن یَّشَآءُ کا مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ قوم بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم جنگ کے لئے تیار ہیں لیکن پہلے کسی کو کمانڈر مقرر کر دیجئے۔ اس نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طاوت کو تمہارا کمانڈر مقرر کیا ہے۔ انہوں

نے کہا کہ طاوت کو کیسے کمانڈر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں قَالَ رَبِّ اِنَّهُ
اَضْطَفُّهُ عَلٰیكُمْ وَ زَادَهُ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ اِنَّ نَبِیَّیْنِیْ لَفِیْ سَكَنٍ
کہ فوج کی کمان کے لئے مال و دولت بشرط نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے جسمانی قوتیں بھی
بافراط حاصل ہوں اور وہ فنونِ حرب و ضرب سے بھی واقف ہو۔ طاوت میں یہ دونوں صلاحیتیں موجود
ہیں اس لئے اسے اس منصب کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس وضاحت سے بتا دیا کہ طاوت کو یہ اقتدار کیوں سونپا
گیا اور اس کے بعد ہے وَ اِنَّهُ یُوَفِّقُنِیْ مُلْكُهُ مَن یَّشَاءُ ۖ وَ اِنَّهُ وَاسِعٌ عَلَیْكُمْ ۝ (۲/۲۵۰)
اقتدار و اختیار خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ یاد رکھو! علمِ خداوندی 'تمہارے علم کے
مقابلہ میں بہت وسیع ہے۔ تم اتنا ہی جانتے تھے کہ دولت 'معیارِ انتخاب ہونا چاہیئے اور ہم یہ جانتے
تھے کہ فوج کی کمان کے لئے کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے ہمارا قانونِ مشیت
جس کے مطابق طاوت کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یُوَفِّقُنِیْ مُلْكُهُ مَن یَّشَاءُ کے کیا معنی ہیں؟ یہ نہیں کہ وہ جسے چاہتا ہے
یونہی اقتدار و حکومت عطا کر دیتا ہے۔

اس کے بعد ہے کہ طاوت اپنے شکر کو لے کر جاوت کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ اس کے دل کی
یہ آرزوئیں بار بار وعابن کر اس کے لبوں تک آتی تھیں کہ رَبَّنَا اٰخِرُ غُرَابِیْنَا صَابِرًا وَ ثَبَاتٌ
اَقْدَمْنَا (۲/۲۵۰)۔ اسے ہمارے نشوونما دینے والے اہم پر استقلال و استقامت کے جامِ انڈیل
دے۔ میدانِ جنگ میں ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔ اس میدان میں (حضرت) وَاَوَدُّنَا جَاوِتَ کُوْقُلِیْ
وَ اِنَّهُ اَمْلُکُ (۲/۲۵۱)۔ اور یوں خدا نے اسے حکومت عطا کر دی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت بیان کی کہ اس قسم کے جنگ و قتال کی ضرورت کیوں
لاحق ہوتی ہے۔ فرمایا۔ وَ کَوْلَا دَفَعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضُہُمْ بِبَعْضٍ لِّفَسَادِ الْاَرْضِ
وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ ذُو فَضْلٍ عَلٰی الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲/۲۵۱)۔ اگر ایسا نہ ہو کہ خدا 'مستبد اور ظالم قوموں کی
کی مدافعت انسانوں کی دوسری جماعتوں کے ذریعے کرائے تو مستبد قوتیں دنیا میں تباہی مچا دیں۔ لیکن
چونکہ خدا انسانوں کی تباہی نہیں چاہتا اس لئے اس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے۔

یہاں دیکھتے کس وضاحت سے کہا گیا ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کی مدافعت، انسانوں ہی کے دوسرے گروہ کے ہاتھوں کرائی جاتی ہے۔ خدا براہ راست ایسا نہیں کرتا۔ یہ پہلا گروہ وہ ہوتا ہے جو محض طبعی قوتوں کے زور پر اقتدار حاصل کر لیتا ہے اور اپنے محکموں پر عرصہ جہات تنگ کر دیتا ہے۔ ان کے خدائی پروگرام کے ہاتھوں انسانوں کی تکمیل | خلاف دوسرا گروہ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو طبعی قوتوں کے ساتھ شرف انسانیت کی صلاحیتوں

سے بھی مرصع ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے سورہ حج کی ان درخشندہ آیات کو سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ جماعت مومنین کو جنگ کی اجازت کیوں دی گئی تھی۔ (۳۹ - ۲۲/۴۱)۔ اس کے بعد جب انہیں حکومت ملی تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ لِنَظَرٍ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰۷/۱۳)۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ اگر تم نے بھی وہی ظلم و استبداد کی روش اختیار کر لی یا تم میں عسکری صلاحیتیں ختم ہو گئیں، تو پھر تمہاری جگہ دوسری قوم لے لیگی۔ ثُمَّ لَا يَكُونُ ذَا أَمْتَالِكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوگی۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ تُوْعِي الْمُلْكُ مَنْ تَشَاءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكُ مِمَّن تَشَاءُ کا صحیح مفہوم کیا ہے (مزید تفصیل چھٹے باب قوموں کی تقدیر میں گزر چکی ہے)۔

اب اس آیت (۳/۲۵) کے دوسرے حصے کی طرف آئیے۔ یعنی عزت و ذلت سے متعلق قانون خداوندی — پہلے ہم عزت و ذلت کے الفاظ کو قرآنی معانی میں لیتے ہیں۔ یعنی قوت و غلبہ، رفعت و عظمت اور اس کے برعکس، کمزوری اور مغلوبیت، پستی اور زبوں حالی۔ سورہ فاطر میں اس کے لئے ایک جامع اصول بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا۔ جو تم میں سے قوت اور غلبہ، رفعت و عظمت (عزت) حاصل کرنا چاہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ صحیح عزت، اللہ کے ہاں سے (یعنی قوانین خداوندی کی پابندی سے) حاصل ہو سکتی ہے یہاں دیکھتے کہا یہ گیا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ — تم میں سے جو کوئی عزت حاصل کرنا چاہے۔ اس سے واضح ہے کہ عزت اسے ہی ملتی ہے جو عزت حاصل کرنا چاہے۔ خدا کے ہاں سے از خود نہیں ملتی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کے لئے قدم اول یہ ہے کہ تم صحیح نظریہ حیات (اینڈیاویجی)

کو اپناؤ (اس کو ایمان کہتے ہیں)۔ قرآنی نظریہ میں بندیوں کی طرف جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (یعنی صحیح نظریہ حیات جس میں بار آوری۔ پھل لانے۔ کی صحت لا ہو) طَبَّبَ اس کو کہتے ہیں) اس میں ابھرنے، بندیوں کی طرف جانے کی قوت ہوتی ہے [وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ۔ اور اعمالِ صالح اُسے اوپر کی طرف بچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لہذا، عزتِ ایمان اور اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ط وَ مَكْرُهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْيَبُودُ (۳۵/۱۰)۔ جو لوگ ایسی تدابیر کرتے ہیں جن سے ناہمواریاں پیدا ہوں، جن سے سیئات پھیلیں اور وہ اس طرح عزت حاصل کریں، تو اس کا نتیجہ شدید تباہی ہے۔ ان کی سب تدبیریں آخر الامر خاک میں رہ جاتی ہیں۔

سورہ یونس میں ہے کہ جو لوگ اس طرح، ایمان و اعمالِ صالح سے، خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں اس کے رفیق بن جاتے ہیں (انہیں قرآن کی اصطلاح میں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے) انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان محکم کے بعد انکی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں۔ ان کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگوار یوں کی بشارتیں ہیں اور اخروی زندگی میں بھی۔ یہ خدا کا وہ قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ بہت بڑی کمیابی کا مرئی ہے۔ اس لئے، اگر اس پروگرام کے ابتدائی ایام میں، مخالفین طرح طرح کی حوصلہ شکنی و طنز آمیز باتیں کریں تو ان سے دل گرفتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یاد رکھو کہ اِنَّ الْاٰخِرَةَ خَيْرٌ مِّنْ الْاُولٰٓئِیْنِ (۱۰/۶۵)۔ سورہ النسا میں کہا کہ منافقین، اس نظامِ خداوندی کے مخالفین کے ساتھ ساز باز رکھتے ہیں۔ اَيَسْتَعْمِلُونَ عِنْدَ هُمْ الْاٰخِرَةَ؟ کیا ان کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ ان سے کہو کہ فَاِنَّ الْاٰخِرَةَ خَيْرٌ مِّنْ الْاُولٰٓئِیْنِ (۴/۱۳۹)۔ عزت، بہ تمام و کمال، قوانینِ خداوندی کے ساتھ وابستگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن قوانینِ خداوندی کے ساتھ وابستگی انفرادی عمل نہیں۔ اس

یہ اجتماعی عمل ہے کے لئے اس اجتماعی نظام میں شریک ہونا ضروری ہے جو ان قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے، خدا کے رسول اور اس کے رفقاء کے ہاتھوں تشکیل ہو رہا ہے۔ وَاللّٰهُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ مِّنْ سُوْلِهِ وَ لِنُمُوْهُ مَبِیْنٌ (۶۳/۸)۔ میں اس اجتماعی نظام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

اس کے برعکس اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ . اُولٰٓئِکَ فِی الْاَوَّلٰیْنَ . جو لوگ اس نظام کی مخالفت کریں گے اور میدان جنگ تک میں اتر آئیں گے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ذلیل ہوں گے۔ اس لئے کہ کَتَبَ اللّٰهُ لَا غُلْبَتَیْ اَنَا وَ مٰرِیُّ . اِنَّ اللّٰهَ قَوِیُّ غَیْبُزُّہٗ (۵۸-۶۱) خدا نے یہ لکھ دیا ہے۔ اس کا یہ اہل قانون ہے۔ کہ خدا اور اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے، اس لئے کہ وہ بڑی ہی قوت کا مالک، صاحب غلبہ و اقتدار ہے۔

سورۃ یونس میں ہے لِلَّذِیْنَ اٰحْسَنُوْا اَلْخُسْنٰ وَ زِیَادَةٌ۔

حَسَن سے عزت جو لوگ حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسے کام کرتے ہیں جن سے خود ان کی ذات اور عالم انسانیت سنور جائے۔ تو ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ ان کی زندگی حسین ہوتی چلی جاتی ہے۔ خود ان کے حسن کارنامہ اعمال سے بھی زیادہ حسین۔ وَ لَا یَزِہِقُ وَ جُوْہُهُمْ قَتَرٌ وَ لَا ذِلَّةٌ۔ روسیاهی اور ذلت انہیں چھو کر نہیں جائیگی۔ وَالَّذِیْنَ اٰکَسَبُوْا السَّیِّاٰتِ حَبْرًاۤءُ سَیِّئَةٌۢ بِمِثْلِہَا۔ وَ شَرُّہُمْ ذِلَّةٌ (۲۶-۲۷)۔ ان کے برعکس، جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والے

(حسن کائنات کو بگاڑنے والے) کام کریں گے، تو اسی نسبت سے ان کی اپنی زندگی کا حسن بگڑتا جائیگا یعنی ذلتوں کی سیاہی ان کے چہروں پر چھا جائے گی۔ زندگی کی یہی غلط روش تھی جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل جیسی شوکت و حشمت کی مالک قوم، ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ وَ ضَرَبْتُ عَلَیْہُمْ الذِّلَّةَ وَ الْمَسْکِنَةَ وَ بَاۤءُ وَاِیْغَضِبِ قَبْلَ اللّٰهِ۔ اس کے بعد اس کی وحشت کر دی کہ ایسا یونہی نہیں ہو گیا۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَاٰفُوْا یُکْفِرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ..... (۶۱/۶۲) یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانین خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر لی۔ وہ عدد و فراموش ہو گئے۔

اب آئیے عزت کے اس مفہوم کی طرف جو ہمارے ہاں مروج ہے اور جس کے لئے جیسا کہ پہلے

عزت بمعنی تکریم کہا جا چکا ہے، قرآن کریم میں تکریم کا لفظ آیا ہے اور اس کے برعکس، بے عزتی اور رسوائی کے لئے تو حنین کا لفظ، جس کا مادہ (ھ۔ و۔ ن) ہے۔

قرآن کریم نے سب سے پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عزت کا معیار، دولت، حسب و نسب یا اسی قسم کی اور اضافی نسبتیں نہیں۔ اس کا معیار سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی ہے، یعنی شرافت اور حسن اخلاق۔ کہا کہ ذات بات، حسب نسب، درشعوب و قبائل کی نسبتیں محض بغرض تعارف ہیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳)۔ خدا کے مقرر کردہ معیار کے مطابق سب سے زیادہ واجب التکریم، صاحب عزت وہ ہے جس کا کردار سب سے بلند ہے۔ اس کی تشریح میں دوسری جگہ کہا کہ خدا کے مخلص بندے جو اپنے اعمال کے بدلے جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں وَهُمْ مُكْرَمُونَ (۳۷/۴۲)۔ وہی صاحب عزت اور مستحق تعظیم و تکریم ہوتے ہیں۔ سورہ یٰسّٰس میں اس مرد مومن کا ذکر آیا ہے جس نے مخالفتوں کے جھوم میں ہنایت بیباکی سے حق کی آواز بلند کی اور کہا کہ اے کاش! میری قوم کو علم ہوتا کہ خدا نے مجھے اپنی کن رحمتوں سے نوازا ہے۔ وَجَعَلَنِيْ مِنْ اٰلِکُرْۤمِیۡنَ (۳۹/۲۷) میں نے مجھے انتہائی عزت و تکریم عطا کی ہے۔

اس کے برعکس، اس نے غلط روش کے نتیجے کو عَذَابُ الْهٰٓؤُنِ۔ یا عَذَابُ مُّہِیۡنٍ کہا ہے۔ یعنی ذلت آمیز، رسوا کن عذاب۔ یہ ذلت و رسوائی کس طرح آتی ہے، اس کے متعلق سورہ حج میں ہے کہ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوْۤا وَ کَذَّبُوْۤا بِآٰیٰتِنَا فَاُولٰٓئِۤکَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ (۳۷/۳۵) جو لوگ قوانین خداوندی سے انکار اور ان کی تکذیب کرتے ہیں، وہ رسوا کن عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ قوانین خداوندی کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کا استہزاء کرتے ہیں، وہ عذاب مجہین میں مبتلا ہوتے ہیں (۴۵/۹)۔ سورہ حٰجّر میں اصولی طور پر بتا دیا کہ رسوا کن عذاب تمہارے اپنے ہی اعمال کی بدولت آتا ہے۔ عَذَابُ الْهٰٓؤُنِ بِمَا کَاٰنُوْۤا یَکْسِبُوْنَ (۴۱/۱۷)۔

قرآن کریم نے ایک مقام پر، ایک بلیغ حقیقت کو بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ لوگ، ظلم و استبداد کی بنا پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور پھر فوت و غلط معیار التکریم | اقتدار، یا دولت و حشمت کو عزت کا معیار قرار دے کر، معاشرہ میں صاحب عزت و تکریم بن بیٹھتے ہیں۔ ہر شخص انہیں (ان سے) ڈر کر اچھک کر سلام کرتا ہے۔ انہیں اونچی جگہ بٹھاتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ظلم و استبداد کی فرعونیت سے حاصل کردہ عزت (غلبہ) اور غلط معیار فیضلت کی بنا پر حاصل کردہ اعزاز و تکریم کا آخر الامر نتیجہ ذلت آمیز تبہ ہی ہوتا

ہے۔ چنانچہ وہ (اس بسط حقیقت کو محسوس تشبیہ سے سمجھانے کی غرض سے) کہتا ہے کہ جہنم میں ایک ایسے ہی شخص کو لایا جائے گا اور اسے انتہائی ذلت و رسوائیوں کا سامانِ خورد و نوش دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝ (۴۷/۴۹)

اس ذلت آمیز رسوائی کا مزاج کھو۔ تو اپنے آپ کو بڑا مفند (با اختیار) اور معزز سمجھا کرتا تھا۔

جھوٹے اقتدار اور مصنوعی عزتوں کے مدعیوں سے اُخروی جہنم میں جو سلوک کیا جائے گا، وہ تو بعد کی بات ہے، اس قسم کے اربابِ حکومت و اقتدار اور اعیانِ عزت و قدر کا جو انجام اس دنیا میں ہوتا ہے اس کا عِتْرُ الْإِثْمِ عبرت آمیز تماشا ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے غلبہ و اقتدار کو خدا نے عِتْرٌ كَبِيرٌ بِالْإِثْمِ کہہ کر ہکا رہا ہے (۲/۲۰۶)۔ یعنی وہ غلبہ و اقتدار جس سے بظاہر

ایسا معلوم ہو کہ بڑی قوت حاصل ہو رہی ہے، لیکن درحقیقت وہ اضمحلال کی طرف لئے جا رہا ہو۔ یہ وہ غلبہ و اقتدار ہے جو حق کو ہاتھ سے دے کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ عَذَابُ الْهُونِ ہوتا ہے۔

(۴۷/۲۰۱)۔ غلط معاشرہ میں، اقتدار بھی اسی طریق سے حاصل ہوتا ہے اور عزت (بمعنی تکریم) بھی اسی معیار کے مطابق۔ اس کے برعکس، حق پر مبنی معاشرہ میں، مدارج کا تعین، جو ہر ذاتی اور حسنِ عمل کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس میں اصول یہ کارفرما ہوتا ہے کہ يَكُلُّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا۔ وَلِيُؤْتِيَهُمُ

أَعْمَالَهُمْ ۖ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۴۷/۱۹) مدارج کا تعین اعمال کے مطابق ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق ہر ایک

کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ۔ کسی پر ظلم زیادتی نہیں۔ ظلم کے معنی ہوتے ہیں۔ جس چیز کو جس مقام پر ہونا چاہیے اسے اس مقام پر نہ ہونا۔ اگر کسی شخص کو معاشرہ میں وہ مقام نہیں ملتا جس کا وہ اپنے جوہر ذاتی اور حسنِ کردار کی بنا پر مستحق ہے تو یہ بھی ظلم ہے اور جس شخص کو وہ مقام مل جاتا ہے جس کا وہ مستحق تو یہ بھی ظلم ہے۔

قرآنی معاشرہ میں ظلم نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا مقام عزت و تکریم اس کے اعمال کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ وَ يُؤْتِي كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ (۱۱/۱۱)۔ اس میں ہر صاحبِ فضیلت کو اس کی

فضیلت کے مطابق مقام مل جاتا ہے۔ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ - وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (۵۸/۱۱)۔ ہر صاحب علم کو اس کے جوہر کے مطابق مدارج۔ اللہ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہوتا ہے۔ وَهُوَ وَ لَيْتَهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۶/۱۲۸)۔ وہ ان کے اعمال کی بنا پر ان کا ولی (دوست، رفیق، کارساز) بن جاتا ہے۔ ان کے اعمال کی بنا پر یہ ہے مشیت کا اہل قانون جس کے مطابق حکومت و مملکت بھی ملتی ہے اور عزت و تکریم بھی۔ (رفعت درجات کے متعلق سابقہ باب کے اخیر میں بھی لکھا جا چکا ہے)۔

ان تصریحات کی روشنی میں، سورہ آل عمران کی اس آیت کو سامنے لائیے جو اس موضوع کی زیر عنوان ہے۔ یعنی۔

آیت کا صحیح مفہوم

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُدْخِلُ مَنْ تَشَاءُ طَبَقًا
الْحَيْرِ ۚ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۳/۲۵)۔

اور دیکھئے کہ اس کا مفہوم کس قدر واضح ہے کہ

بارِ اہل! قوت و اقتدار کا حقیقی مالک تو ہے۔ جو لوگ تیرے قانونِ مشیت کے مطابق چلتے ہیں، تو انہیں اقتدار عطا کر دیتا ہے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان سے اقتدار چھین لیتا ہے۔ عزت و ذلت تیرے قانونِ مشیت کے مطابق ملتی اور چھنتی ہے۔ یہ کچھ یونہی دھاندلی سے نہیں ہوتا۔ دھاندلی سے ہو کیسے سکتا ہے، اس لئے کہ تو تو خیر کا سرچشمہ ہے۔ چشمہ خیر سے شر کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ تو نے ہر بات کے لئے پیمانے، اندازے، قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ اور جو فیصلہ قانونِ حق کے مطابق ہو، اس میں ظلم اور زیادتی کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اے اللہ العالمین! خدا ہونا تجھی کو زیب دیتا ہے۔

تائید نصرت خداوندی

ہم یہ ارشاد خداوندی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وَ هُوَ وَ لِيَرْهَمُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۱۳۸/۶)۔ خدا انسانوں کے اعمال کی بنا پر ان کا رفیق و دمساز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رفاقت کبریٰ کو، اس کی نصرت اور تائید کہا جاتا ہے۔ (تائید غیبی کے الفاظ ہمارے ہاں عام طور پر بولے جاتے ہیں)۔ رسول یہ ہے کہ خدا کی یہ نصرت کیا ہے اور کسے ملتی ہے۔ ”تائید غیبی“ سے تو ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ غیب سے یونہی آ جاتی ہے۔ اور اس کی تائید میں وَ اللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنُصْرِهِ مَن يَشَاءُ جیسی آیات قرآنی پیش کر دی جاتی ہیں۔

نصرت کے معنی | عربی زبان میں نصرت کے معنی ہوتے ہیں، ہارش کا زمین کو سیراب کرنا۔ ندی نالوں کا وادی میں دُور دُور تک چلے جانا تاکہ ان سے آبپاشی کی جاسکے۔ ظاہر ہے کہ ہارش اسی کسان کے لئے منفعت بخش ہو سکتی ہے جو اپنی زمین کو کھیتی کے لئے تیار کرتا ہے۔ طبعی اسباب و سامان، کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ جو شخص ان کے خواص و فوائد سے واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ انہیں قاعدے اور قانون کے مطابق کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پھر انہیں اسی طرح استعمال بھی کرتا ہے۔ اس کی کوششیں بار آور ہوتی ہیں۔ جو ان سے، قاعدے اور قانون کے مطابق فائدہ نہیں اٹھاتا، ناکام رہتا ہے۔ اسی کو بالفاظ دیگر یوں کہیں گے کہ قوانین خداوندی کے مطابق کوشش کرنے سے، خدا کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ندی کے بہاؤ کی طرف کشتی چلاتا ہے اور دوسرا اس کے چڑھاؤ کی طرف۔ جتنے عرصہ میں بہاؤ کے ساتھ جانے والا دس میل کا سفر طے کر لے گا، چڑھاؤ کی طرف جانے والا شاید ایک میل بھی نہ جاسکے اور اس کے علاوہ اس کی جس قدر طاقت صرف ہوگی وہ بھی ظاہر ہے۔ لہذا جو جماعت، خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے اٹھے اور اس کے متعین کردہ قوانین کے

لے رسول اللہ نے اپنی حیاتِ ارغنی کے آخری لمحات میں فرمایا تھا بل هو الرفیق الاعلیٰ یعنی میں اس کی طرف جارہا ہوں جو رفیقِ اعلیٰ ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے۔ اس رفاقتِ باہمی میں خدا رفیقِ اعلیٰ ہے اور انسان رفیقِ ادنیٰ۔ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے حضورؐ نے دو الفاظ میں بیان فرمادیا!

مطابق کام کرے اس کی کوششیں بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔ دیکھئے، قرآن کریم نے اس حقیقت کی وضاحت کیسے بلیغ انداز میں کی ہے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷)۔

اے جماعتِ مؤمنین! اگر تم خدا کی مدد کر دو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔

یہاں دیکھئے! مدد کرنے کی سبقت یا پہل، انسانوں کی طرف سے ہوگی۔ یعنی جو جماعت خدا کی مدد کرے گی، خدا اس کی مدد کرے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا تو کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ لہذا، خدا کی مدد کرنے سے مراد ہے کہ اس کے پروگرام کی تکمیل (دین کی اقامت و استحکام) کے لئے کوشش

خدا کی مدد کرتا ہے

کرتا ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ خدا کی یہ مدد کیا کرے گی؟ فرمایا۔

وَ يُثَبِّتُ أَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔

وہ تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔

کسی پروگرام کی کامیابی کے لئے استقامت اور استقلال اولیٰ شرط ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ اس پروگرام کی صداقت پر ایمان محکم ہو اور اس امر کا یقین کامل کہ جو راستہ ہم اختیار (جو طریقہ ہم استعمال) کر رہے ہیں وہ ہمیں بالضرور کامیابی سے ہمکنار کر دے گا۔ اس سے وہ سکونِ قلب (جمعیتِ خاطر) حاصل ہوتا ہے جس کا عملی نتیجہ ثابت قدمی ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہے وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمُ دَآصِلٌ أَعْمَالُهُمْ (۴۷/۸)۔ اور جو لوگ کواہنِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں، ان کے حصے میں ناکامیاں اور نامرادیاں ہیں۔ ان کے اعمال رائگاں جاتے ہیں۔ وہ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کرتے۔ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أُنْزِلَ اللَّهُ فَاحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۴۷/۹)۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ وحی کی رو سے عطا شدہ قوانین و اقدار کو ناپسند کرتے ہیں، لہذا ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ جو کام بھی قاعدے اور قانون کے خلاف کیا جائے گا بے نتیجہ رہیگا۔

وہ ہاجرین جو، دینِ خداوندی کے قیام کے پروگرام میں شرکت کے لئے، اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ، مدینہ کی طرف آگئے تھے، ان کے متعلق کہا وَ يَنْصُرُونَ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ

الصِّدِّقُونَ (۵۹/۸۱)۔ یہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوے ایمان میں پختے ہیں۔ انہی کے متعلق کہا ذَلِكُمْ يَنْصُرُونَ اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرْهُ فَقَدْ يُقِيْنَا اللّٰهَ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کر دی کہ خدا کن لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ فرمایا۔

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطہ ہدایت دے کر بھیجا، یعنی اس نظام زندگی کو دے کر جو یکسر حقیقت پر مبنی ہے تاکہ وہ نظام دنیا کے تمام باطل نظاموں پر غالب آئے، خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کے بجائے مختلف "خداؤں" کے احکام کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں، اسے جماعت مومنین! آؤ تمہیں زندگی کا ایک اصول بتائیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص ایسا کاروبار کرنا چاہتا ہے جس میں اسے فائدہ ہو۔ لیکن تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ انسان کئی سووے، ایسے بھی کر بیٹھتا ہے جن میں اسے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اب سوچو کہ اگر تمہیں کسی ایسے کاروبار کا پتہ نشان مل جائے جس میں کبھی نقصان نہ ہو تو یہ کیسی عمدہ تجارت ہوگی؟ آؤ! ہم تمہیں ایسا کاروبار بتائیں جس میں کبھی نقصان کا احتمال نہ ہو اور اس طرح وہ تمہیں اطمینان عذاب سے بچالے۔

وہ کاروبار یہ ہے کہ تم اس نظام خداوندی کی صداقت اور حکیمیت پر پورا پورا یقین رکھو جو اس کے رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہو رہا ہے۔ اس نظام کے قیام کے لئے پوری پوری جدوجہد کرو۔ اس کے لئے اپنا مال و دولت بھی صرف کرو اور ضرورت پڑنے پر اپنی جانیں تک بھی لڑاؤ۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لے کر غور کرو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ اس کاروبار میں کس قدر منافع ہے۔

یہ نظام تمہارے لئے ایسا سامان ہیا کر دے گا جس سے تم ان بتا ہیوں سے بچ جاؤ گے جو تمہارے پیچھے لگی رہتی ہیں اور تمہیں اس دنیا اور حیاتِ اخروی میں ایسی جنتی زندگی عطا کر دے گا جس کی ترقی و تازگی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ (تمثیلاً) سدا بہار باغات میں نہایت خوشگوار رہنے کے مکانات۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے جسے نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد ہے۔ وَ اٰخِرٰى تَجِبُوْنَهَا۔ اور اس کے علاوہ وہ کچھ بھی جو نہیں بہت عزیز ہے یعنی نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ اللہ کی نصرت اور قریبی فتوحات۔ وَ بَشٰرِی الْمُوْمِنِیْنَ (۹۱-۱۳۷/۶۱) اسے رسولِ جماعتِ مومنین کو اس کی خوشخبری دیدے۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی نصرت کن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے؟

پہلے کہا جا چکا ہے کہ کسی مقصد میں کامیابی کے لئے اولیں شرط یہ ہے کہ آپ کو اس مقصد کی صداقت پر یقین محکم ہو۔ اس کے بعد دوسری شرط یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو اسباب و ذرائع درکار ہوں وہ مہیا کئے جائیں اور ان کا استعمال قاعدے اور قانون کے مطابق کیا جائے۔ دیکھئے قرآن کریم نے ان دونوں شرائط کو کس وضاحت سے بیان کیا ہے۔ سورہ حدید میں ہے کہ ”ہم نے اپنے رسولوں کو واضح قوانین دے کر بھیجا، یعنی ان کے ساتھ آسمانی کتابیں نازل کیں تاکہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی

نصرت کے لئے تلوار کی ضرورت | بسر کر سکیں۔ یہ تو رہی آسمانی ہدایت۔ اس کے بعد کہا وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ..... اور ان ہدایت کے ساتھ ہم

نے ”شمیر خاہ شگاف“ بھی نازل کی۔ اس میں بڑی سختی اور صلابت ہوتی ہے اور جب اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ نوعِ انسانی کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ یہ سب انتظام ہم نے اس لئے کیا لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنِ يَنْصُرُهُ وَ مِمَّا سُلِّیْ بِالْغِیْبِ (۵۷/۲۵)۔ تاکہ خدا دیکھے کہ تم میں سے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی امداد ”بالغیب“ کرتا ہے۔ یہاں ”بالغیب“ کا لفظ بڑا غور طلب ہے۔ دینِ خداوندی کے پروگرام کے ابتدائی مراحل میں، مشکلیں ہی مشکلیں اور مصائب ہی مصائب ہوتے ہیں۔ اس میں مسلسل محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور کوئی محسوس نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ اس زمانے میں اس قدر جانکاہ مشقتیں وہی برداشت کر سکتا ہے جسے (کسان کی طرح) اس بات کا یقین ہو کہ یہ پروگرام ایک دن بڑے شاندار نتائج مرتب کرے گا۔ اس پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان ہی انسان کو اس قدر مسلسل محنت پر آمادہ کر سکتا اور ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ اسے ”ایمان بالغیب“ کہتے ہیں جسے قرآن کریم کے آغاز میں، کامیابی کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے (۱۳/۲)۔ اسی ”نصرت بالغیب“ کا ذکر (۵۷/۲۵) میں آیا ہے۔

ضمناً، ہم، خدا کی طرف سے تائیدِ غیبی کی توقعات وابستہ کرتے ہیں اور خدا ہم سے ”تائیدِ غیبی“ کا مطالبہ کرتا ہے! اسی کے لئے اس نے کہا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! كُوْنُوْا اَنْصَارًا لِلّٰهِ (۶۱/۱۳۷)

تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ یہی بات حضرت عیسیٰ نے بھی اپنے متبعین سے کہی اور انہوں نے اس پر کس طرح بتیک کہا۔ یہ ایک الگ داستان ہے جسے میں نے اپنی کتاب ”شعلہ مستور“ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس نصرت کا عملی مظاہرہ سب سے پہلے بدر کے میدان میں ہوا جہاں ایک طرف وہ جماعت تھی جو در بن خداوندی کے قیام کی خاطر شمشیر بدست میدان میں نکل آئی تھی۔ اسے قرآن نے ”قتال فی سبیل اللہ“ کہہ کر پکارا ہے اور دوسری طرف مخالفین کی جماعت جس کا قتال ”فی سبیل لطاغوت“ انھا۔ جماعتِ مومنین خدا کی مدد اپنی جانیں بھیلی پر رکھ کر کر رہے تھے اور ان کی مدد خدا کے قانون اور نظام کی حقانیت اور صداقت کر رہی تھی۔ اس مقام پر کہا

کہ **وَاللّٰهُ يُوعِظُ بِنُصْرِهِ مَنْ يَّشَاءُ** (۳/۱۳)۔ اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ جو بھی اس طرح خدا کی مدد حاصل کرنا چاہے۔ **مَنْ يَّشَاءُ**۔ خدا اس کی مدد کرتا ہے اور یہ بھی کہ ”اس طرح خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مدد کیا کرتا ہے۔“ یہ مدد یونہی اتفاقیہ (ACCIDENTALLY) حاصل نہیں ہو جاتی۔ قاعدے اور ضابطے کے مطابق (RATIONALLY) حاصل ہوتی ہے، کیونکہ

اس کے بعد کہا ہے کہ **إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِیْ الْاَبْصَارِ** (۳/۱۲)۔ اس میں اربابِ بصیرت صاحبانِ فکر و نظر کے لئے سلمانِ عبرت ہے۔ عبرت کے معنی ہوتے ہیں دلائل و براہین کی رُو سے اسباب پر غور کر کے نتیجہ تک پہنچنا۔ جو بات اس طرح واقع ہو کہ اس کے متعلق پتہ ہی نہ چل سکے کہ وہ کیسے ظہور پذیر ہو گئی ہے، (تائیدِ غیبی کا تصور ایسا ہی ہوتا ہے) اس پر علم و بصیرت کی رُو سے دعوتِ غور و فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ نصرتِ خداوندی تھی جس کے متعلق کہا تھا کہ وہ جماعتِ مومنین کے لئے

فرحت و شادمانی کا موجب بنے گی (۳۰/۵۱)۔ ان معرکوں میں ملائکہ کے ذریعے مدد کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق وہیں وضاحت

کر دی گئی ہے کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ جماعتِ مومنین کو اطمینانِ قلب حاصل ہو (۹/۱۰) اور اس طرح ان کے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ (۸/۱۲)۔ یہی ثبات و استقامت ہے جس سے خدا کی نصرت

حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا اگر تم مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرو گے اور قانونِ خداوندی کے پابند رہو گے، تو تمہیں نصرتِ خداوندی حاصل ہوگی (۱۲۲)۔ (۱۳/۱۲۵) اگر تم میں سو مجاہد ثابت قدم ہوں گے تو دوسو پر غالب آجائیں گے۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸/۴۴)۔ اس طرح خدا، ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس نصرتِ خداوندی کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَاسُوْلَهٗ۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ۔ باہمی جھگڑا مت کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ وَاصْبِرُوْا۔ ثابت قدم رہو۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (۸/۴۴)۔ یاد رکھو! خدا ان کا ساتھ دیا کرتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں اور جن لوگوں کو اس طرح خدا کی نصرت اور معیت (رفاقت) حاصل ہو جائے، ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ اِنْ يَنْصُرْکُمْ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۚ جب خدا تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔ وَ اِنْ یَّخْذُ لَکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرْکُمْ مِنْۢ بَعْدِ ۚ (۲/۱۵۹) اور اگر وہی تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد تمہاری مدد کون کر سکے گا۔ اس غلبہ و نصرت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وَ اَنْتُمْ اَلْعٰلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲/۱۳۸) اگر تم مومن ہوئے تو تم سب پر غالب رہو گے۔ یہ ہے وہ جماعت جسے خدا کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔



چودھواں باب

يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ

(جسے چاہے عذاب دے، جسے چاہے بخش دے)

قرآن کریم کی بعض آیات میں اس قسم کے الفاظ آتے ہیں۔ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ (۱۳۸/۳) اور ان کا لفظی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ عذاب جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دیدے۔ اور اس ترجمہ کی بنیاد پر جو عمارت استوار کی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ سلسلہ رشد ہدایت اور قانون مکافات عمل کا آخری نتیجہ یا حاصل عذاب و مغفرت ہے۔ اور اگر اس کی بھی یہی صورت ہے کہ اس کے لئے نہ کوئی اصول مقرر ہے نہ کوئی قاعدہ اور قانون۔ وہ

عذاب و مغفرت کے معنی

جسے چاہے عذاب دے دے، جسے چاہے بخش دے۔ تو اس سارے سلسلہ کی ضرورت کیا ہے؟ یہ تو سعدی کے الفاظ میں ”مزاج شاہاں“ والی بات ہو گئی کہ۔

_____ گاہے بہ درشت نامے خلعت بہ بخشند، و گاہے بہ سلامے برنجند۔ _____ کبھی اچھے موڈ میں ہوں تو گالی دینے والے کو انعام و اکرام سے نواز دیں اور اگر موڈ خراب ہو تو سلام کرنے والے کو تختہ دار پر لٹکوا دیں۔ ظاہر ہے کہ انداز خدا کے نہیں ہو سکتے۔ لہذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ قرآن کریم سے اس باب میں کیا راہ نمائی ملتی ہے۔

چپ ہم عذاب کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں جہنم کا نقشہ آ جاتا ہے جس میں ”گنہگار عذاب الیم میں ہتلا دکھائی دیتے ہیں۔ جہنم برحق ہے اور اس کا عذاب بھی حقیقت۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے عذاب جہنم تک ہی محدود و مختص نہیں۔ انسان کی ہر غلط روش کے نقصان رساں نتیجہ کا نام عذاب ہے۔

جو دنیا میں بھی سامنے آسکتا ہے اور آخرت میں بھی۔ ان نتائج کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ قرآنِ کریم نے مجرم کی اُس سزا کو بھی، جو اسے عدالت سے ملتی ہے، عذاب کہہ کر پکارا ہے۔

جہاں تک مغفرت کا تعلق ہے اس کے معنی بھی ”بخش دینے“ کے نہیں (مادہ کے اعتبار سے) اس لفظ کے معنی ہیں سامانِ حفاظت ہم پہنچانا۔ ہم، قانونِ مکافاتِ عمل سے متعلق، جو تھے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیان مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس مہلت کے وقفہ میں، اگر انسان ایسے (اچھے) کام کر لے جن سے اُس نقصان کا ازالہ ہو جائے جو اس کے غلط عمل کی وجہ سے واقع ہونا تھا، تو وہ اس نقصان سے بچ جاتا ہے۔ اسے مغفرت کہتے ہیں۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ”جہانِ خسرا“ میں ملے گی)۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ عذاب کس طرح وارد ہوتا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو اس کے مورد ہوتے ہیں۔ سورۃِ مادہ میں، یہودیوں کے جرائم کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے لِبُئْسٍ مَا قَدَّمْتُمْ لِنَفْسِكُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ (۵/۸۰)۔ جو کچھ انہوں نے... اپنے لئے پہلے بھیجا ہے، وہ بہت بُرا ہے۔ اس سے یہ خدا کے غضب کے مستحق قرار پا چکے ہیں اور اسی کی وجہ سے یہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ ”مَا قَدَّمْتُمْ“ کی تشریح پہلے سامنے آچکی ہے۔ اس کے معنی انسان کے وہ اعمال ہوتے ہیں جن کا نتیجہ ہنوز سامنے نہیں آیا ہوا۔ اس آیت سے واضح ہے کہ عذاب انسانوں کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

سورۃِ آلِ عمران میں یہودیوں کے ان جرائم کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی وجہ سے وہ مستحقِ عذاب قرار پائے یعنی قوانینِ خداوندی سے انکار و سرکشی، انبیاء کا ناحق قتل اور ان لوگوں کا قتل جو حق و انصاف کا حکم دیتے تھے۔ اس کے بعد ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۳/۲۰)۔ اے رسول! انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کر دے۔ اس سورہ میں، ذرا آگے چل کر ہے۔ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَعَذَابُ اللَّهِ شَدِيدٌ ۚ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ (۳/۵۵)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ دنیا اور آخرت میں شدید عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کا مال دولت بطورِ فدیہ دے کر بھی اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ (۵/۳۶)۔ سورۃِ انعام میں ہے۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (۶/۴۹)۔ جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں، وہ اپنے فسق کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہوں گے (نیز ۱۶/۱۶۵)۔ سورۃ توبہ میں ہے کہ ان مخالفین قریش نے ظلم و ستم پر اس لئے کمر باندھ رکھی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس مال دولت بھی بہت ہے اور ہمارا جتھہ بھی بڑا مضبوط ہے اس لئے ہم جو جی میں آئے کریں، ہمیں کون پوچھ سکتا ہے؟ کہا کہ ان کا یہی زعم باطل انہیں مبتلائے عذاب کر دے گا (۹/۵۵) اور ان پر یہ عذاب تمہارے ہاتھوں میدان جنگ میں آئے گا۔ (۹/۵۲)؛ (۹/۵۵)۔ سورۃ ہود میں ہے کہ یہ لوگ نہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں، نہ عقل و ہوش سے۔ نہ کسی کی بات سنتے ہیں، نہ دیکھ کر راستہ چلتے ہیں۔ یہ مبتلائے عذاب نہیں ہوں گے تو اور کون ہو گا؟ (۱۱/۲۴-۱۸) ذ (۲/۷۱)

بعض آیات میں عذاب کے مقابلہ میں رحمت کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور خدا کی طرف سے واضح تعلیم مل جانے کے بعد اختلاف کرنے لگ گئے۔ اُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ یہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ جس دن اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آئیں گے تو بعض چہرے سیاہ ہوں گے اور بعض نورانی۔ جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نیلے پانے لے آئے کے بعد پھر سے کفر اختیار کر لیا تھا (یعنی امتِ واحدہ بن جانے کے بعد، تفرقہ پیدا کر لیا تھا) اَفَذُذُّوْا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ لہذا، تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔ اور جن لوگوں کے چہرے نورانی ہوں گے فَقَدْ رَحِمْنَاكُمْ ۝ (۱۰۴-۱۰۶/۳)۔ وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جسے دوسرے الفاظ میں قانونِ مشیت کہا جاتا ہے۔ جن آیات میں مَنِ يَشَاءُ كَافَعِلُ خُدا ہوتا ہے ان میں اس کا یہی قانونِ مشیت مراد ہوتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دعا کی کہ بارِ الہما! ہمارے لئے دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں بکھ دے۔ خدا نے جواب میں کہا کہ عَذَابِيْ

اُصِيبُ بِهِ مِنْ اَشْأَوْ وَ تَحْمِيْ دَسَعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (تم میرے عذاب سے ڈرتے ہو اور اس سے محفوظ رہنا چاہتے ہو، تو اسے سمجھ لو کہ) میرا عذاب تو میرے قانونِ مشیت کے مطابق وارد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم یونہی اندھا وھند جسے چاہیں بتلائے عذاب کر دیتے ہیں۔ لہذا، اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ باقی رہی میری رحمت، تو وہ ساری کائنات کو محیط ہے۔ لیکن انسانوں میں سے ہم اسے ان لوگوں کے لئے لکھ دیتے ہیں جو تقویٰ شعار ہوتے ہیں، ایسا زکوٰۃ کا انتظام کرتے ہیں اور ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں (آخری دور میں یہ رحمت ان کے حصے میں آئے گی) جو ہمارے اس نبیؐ کا اتباع کریں گے جس کا ذکر وہ تورات اور انجیل میں موجود پائیں گے۔ جو معروف کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا..... (۱۵۵- ۱۵۶/۷)۔ یہاں سے واضح ہو گیا کہ عذاب اور رحمت کے لئے اصول اور قانونِ مشیت کیا ہے اور مَنْ يَشَاءُ کا مطلب کیا۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ اے رسول! میرے بندوں سے کہہ دو کہ آپس میں ہمیشہ اچھی باتیں کیا کریں۔ خوش معاملہ رہیں، کیونکہ شیطان چاہتا ہے کہ تم میں نزاع اور مخالفت کا بیج بودے۔ اس کا اتباع نہ کریں۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے بعد ہے رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ۔ خدا تمہارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اِنْ يَشَاءُ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَشَاءُ يُعَذِّبْكُمْ۔ اگر وہ (اعمال) اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوئے تو تم اس کی رحمت کے مستحق قرار پاؤ گے۔ اگر اس کے خلاف ہوئے تو اس کا عذاب تم پر وارد ہو جائے گا۔ اب ان میں سے جس کا جی چاہے، خدا کی رحمتوں کے دروازے اپنے سامنے کھول لے، جس کا جی چاہے اس کا عذاب اپنے اوپر وارد کر لے۔ وَمَا اَنْهَاسَلْبُكَ عَلَيْهِمْ فَكَيْدًا (۱۱۷/۵۴)۔ اے رسول! ہم نے تمہیں ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ انہیں زبردستی سیدھے راستے پر چلاؤ تاکہ ان پر خدا کی رحمتوں کا سایہ رہے۔

اب مغفرت کی طرف آئیے۔ اس کی دو شکلیں ہوں گی۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب کسی بستی میں وبائی امراض پھیلتے ہیں تو کمزور آدمی ان کا جلد شکار

ہو جاتے ہیں اور جن میں قوتِ مدافعت (POWER OF RESISTANCE)

زیادہ ہوتی ہے، وہ ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ وہ سامانِ مغفرت

مغفرت کی دو شکلیں

ان تصریحات کی روشنی میں یُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جو شخص غلطی ہو جانے کے بعد اس پر اڑا رہے، وہ عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ جو اس سے باز آ کر اپنی اصلاح کر لے، وہ عذاب سے بچ جائے گا۔ دیکھئے! قرآن کریم نے اس حقیقت کی کس طرح وضاحت کی ہے۔ سورہ مائدہ میں پہلے کہا کہ سارق (چور) کی سزا یہ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ ذَا صَلَاحٍ فَإِنَّ اللّٰهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ۔

سزا اور معافی

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ لیکن جو مجرم اپنے کئے پر نادم ہو اور اس روش سے باز آ جائے، اور اپنی اصلاح کر لے، تو خدا اس کی طرف لوٹ آئے گا۔ یقیناً خدا مغفرت اور رحمت عطا کرنے والا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ عذاب اور مغفرت (عام الفاظ میں سزا اور معافی) کو ساتھ ساتھ رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ سوال اس لئے اُبھرتا تھا کہ یہودیوں کے ہاں 'سزا ہی سزا تھی، معافی کی گنجائش نہیں تھی اور عیسائیوں کے ہاں رحم (MERCY) ہی رحم (MERCY) تھا سزا کا تصور ہی نہیں تھا۔ اس کے جواب میں کہا کہ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اس عظیم سلسلہ کائنات میں خدا کا اقتدار کس طرح کار فرما ہے؟ یہ اس کے قوانین مشیت کی رو سے کار فرما ہے۔ اسی قسم کے قوانین مشیت، انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ انہی کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ سزا کسے ملنی چاہیئے اور درگزر کس سے کر دینا چاہیئے۔ یُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۳۸-۵/۴۰)۔

آپ نے غور فرمایا کہ عذاب (سزا) کس مجرم کو دیا جاتا ہے اور مغفرت کس کی ہوتی ہے؟ کیا اس کا فیصلہ اس طرح ہوتا ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے سزا دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے؟ نہیں، اصول یہ بیان ہوا ہے کہ جو مجرم اپنے کئے پر نادم ہو کر اپنی اصلاح کر لے، اسے معاف کر دیا جائے (یَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ) اور جو جرائم سے باز نہ آئے اسے سزا دی جائے۔ (وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ)۔

یہ ہے ان الفاظ کا قرآنی مفہوم، اور یہ ہے وہ اصول جس کے مطابق اس امر کا فیصلہ ہوتا ہے کہ ملزم مستحق سزا ہے یا سزا وار عفو۔ اس سلسلہ میں کہا کہ وَ اِنْ تُبَدَّلْ مَا فِی

أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخَفُّوهُ يَحْسِبُكُمْ رَبِّهِ اللَّهُ جَوْكُجْهَ تَهَارِے دلیں ہے تم اسے ظاہر کر دیا پوشیدہ رکھو، خدا کے قانونِ مکافات پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ تمام امور کا حساب کر لیتا ہے۔ فَيَخْفِضُ مَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲/۲۸۷)۔ اس کے بعد اس امر کا فیصلہ ہوتا ہے کہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق، کسے مغفرت مل سکتی ہے اور کون مستحقِ عذاب ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ (۲۹/۲۱) جو شخص، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق، سزا بھگتنا چاہے، وہ ویسی رُش اختیار کر لے، جو مستحقِ رحمت بننا چاہے، وہ ویسے کام کرے۔

سورۃ مادہ میں ہے کہ یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چاہیبتی اولاد ہیں اس لئے ہونہیں سکتا کہ خدا ہمیں عذاب دے۔ اس کے جواب میں پہلے یہ کہا کہ اگر حقیقت یہی ہے جسے تم کہتے ہو تو آخری عذاب کی بات کو چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر تم واقعی اس کی چہیتی اولاد ہو تو فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ خدا تمہارے جرائم کے بدلے تمہیں اس دنیا میں سزائوں دیتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ خدا کی کوئی چہیتی اولاد ہے، نہ سوتیلی۔ اس کے ہاں تو مکافاتِ عمل کا قانونِ مشیت کار فرما ہے جس کا تمام انسانوں پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ يَخْفِضُ مَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ۔ اسی قانون کے مطابق عذاب و مغفرت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۵/۱۸) اس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔

اسی سورۃ میں یہ واضح کر دیا کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ ؕ وَ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۵/۹)۔ جو لوگ ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں، خدا نے ان سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ سورۃ فتح میں، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ كِىْ خُصُوصِيَّاتِ كِبْرٰى اور محاسنِ جلیلہ گننانے کے بعد کہا کہ ”اللہ نے ایمان اور اعمالِ صالح والوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ (۲۹/۲۸)۔ سورۃ ہود میں اعمالِ صالح اور استقامت کا بدلہ مغفرت اور اجرِ کبیر بتایا گیا ہے (۱۱/۱۱)۔ اسی کو (۲۳/۲۵) میں دہرایا گیا ہے۔ سورۃ احزاب میں، مسلم مردوں اور عورتوں کی خصوصیات کی فہرست دینے کے بعد کہا ہے کہ اَعَدَّ اللّٰهُ

لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَآجُرًا عَظِيمًا (۳۳/۳۵۱)۔ خدا نے ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اس کے برعکس، کہیں کہا ہے کہ شرک سے مغفرت نہیں مل سکتی۔ (۴/۱۱۶؛ ۴/۲۸)۔ کہیں یہ کہ جو لوگ کفر اور ظلم کے مرتکب ہوں (اور اپنی ان حرکات سے باز نہ آئیں) انہیں مغفرت نہیں مل سکتی۔ (۴/۱۶۸)

یہ ہے صحیح مفہوم، یَغْفِرُ مَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ کا۔ یہ عقیدہ کہ خدا کے ہاں کوئی قاعدہ اور قانون مسترد نہیں، وہ جسے چاہے عذاب دے دے، جسے چاہے بخش دے، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف اور خدا کے صحیح تصور کی نقیض ہے۔ دیکھئے، وہ کتنے پیارے انداز میں کہتا ہے کہ

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ أَمَنْتُمْ (۲۴/۴۷)۔
اگر تم قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لاؤ اور اس کی نعمتوں کی قدر دانی کرو، تو اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟

عذاب و مغفرت کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے ایک اور اہم اصول کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ایک شخص نے ایک مہذب گھرانے میں جنم لیا۔ اس کی تعلیم و تربیت عمدہ پیمانے پر ہوئی۔ اس کا ماحول باشعور ہے۔ وہ قانون سے واقف ہے اور جرائم کے عواقب سے باخبر۔ ایک جرم اس سے سرزد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، اسی جرم کا ارتکاب ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو جاہل بھی ہے اور گنوار بھی۔ اس کی زندگی ایسے ماحول میں بسر ہوئی ہے جہاں نہ شرافتِ نفس کا کوئی احساس تھا نہ جرم مجرم کے احوال کوائف کی نسبت سے سزا سے چنداں ندامت۔ قرآن کریم کا تجویز کردہ اصول یہ ہے کہ ان مجرموں کو ایک جیسی سزا نہ دی جائے۔ اسی اصول کے مطابق اس نے لونڈیوں کے جرمِ زنا کی سزا مہذب گھرانے کی مستورات کے مقابلہ میں نصف قرار دی ہے۔ (۴/۲۵) اور خاندانِ نبویؐ کی محترم خواتین سے کہا ہے

لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۴/۲۵)۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴/۲۵) لفظ نکاح کے تحت آیا ہے، وہاں عذاب عظیم ہے۔

کہ اگر تم سے کوئی جرم سرزد ہوا تو تمہیں اس کی زکئی سزا ملے گی (۳۰۱-۳۲/۳۳)۔

انفرادی احوال و کوائف سے آگے بڑھ کر معاشرہ کی اجتماعی کیفیت کا ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب معاشرہ میں خرابیاں عام ہو جائیں تو اس وقت شر مستطیر ہو جاتا ہے۔ (۷/۷۶) ،

یعنی اڑ کر جا لگتا ہے۔ جب ایسے معاشرہ پر تباہی آتی ہے تو اس کی پیٹ میں مجرم

اجتماعی سزا

اور پاکباز سب آجاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے جماعت مومنین سے کہا ہے کہ ایسا انتظام کرو کہ معاشرہ اس قسم کے سیلاب کی پیٹ میں نہ آجائے۔ وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸/۲۵)۔ اس فتنہ کی نگہداشت کرو۔ اس سے بچنے کی تدبیر کرو کہ جب وہ آجاتا

ہے تو پھر خاص طور پر انہی کو اپنی پیٹ میں نہیں لیا کرتا جن کے جرائم کی وجہ سے وہ تباہی آئی تھی۔ اس کی زد میں سب آجاتے ہیں۔ مثلاً محکمہ انہار یا تعمیرات کی بددیانتی یا غفلت سے اگر دریا کا بند ٹوٹ جائے

تو اس سیلاب سے صرف انہی اہلکاروں کے مکانات منہدم نہیں ہوتے اس سے بستیوں کی بستیاں غرق ہو جاتی ہیں۔ وہ فتنہ کسی خالص حلقے تک مخصوص و محدود نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ سیلاب نہ پڑسد کہ درخانہ کد ام

است۔ اس قسم کی اجتماعی تباہیوں میں بے قصور افراد بھی گرفتار ہلا ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد

فرد معاشرہ کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے

تقدیر کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اجتماعی

زندگی کی اصلاح پر زور دیتا ہے اور افراد سے کہتا ہے کہ وہ تقدیر کا رونا رونے کے بجائے معاشرہ کو صحیح (قرآنی) خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کریں۔ معاشرہ کے بدل جانے سے افراد کی "تقدیریں" خود

بخود بدل جائیں گی۔ الدین، معاشرہ کے صحیح نظام کا نام ہے۔ ایسے معاشرہ میں نہ کہیں نالہ نیم شبی سنائی دیتا ہے نہ فغانِ سحری۔ اس میں ہر طرف سے سلاما سلاما کی نشید جانفز افراد دس گوش بنتی ہے۔ بہر حال، ہم کہہ رہے تھے کہ عذاب و مغفرت کے ضمن میں قرآن کریم یہ اصول بیان کرتا ہے کہ اس کے تعین کے لئے فرد کے احوال و کوائف اور معاشرہ کی عمومی حالت کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۳۲) (غلام اور لونڈیوں) کا ذکر آیا ہے ان سے اُسی زمانے کے غلام اور لونڈیاں مراد ہیں۔ اس کے بعد

قرآن نے غلامی کا خاتمہ کر دیا تھا۔

کریم نے جہاں فِیْغْفِرُ طَنْ یَّشَاءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ سے پہلے یُحَاسِبُکُمْ کہا ہے، تو اس سے مراد یہی ہے کہ اس کا حساب کرتے وقت، خدا کا قانونِ مکافات اس کا پورا پورا لحاظ رکھتا ہے کہ اس جرم میں، فرد اپنے طور پر کس حد تک ذمہ دار ہے اور وہ عناصر کس حد تک ذمہ دار جن چیز سے اختیار نہیں تھا۔ یہی وہ اصول تھا جس کی رو سے حضرت عمرؓ نے اس شخص کے ملازموں کو سزا نہیں دی تھی جو انہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں دیتا تھا اور جس کی وجہ سے انہوں نے چڑا کر غلہ کھایا تھا۔ انہوں نے ان کے ملازموں کے بجائے، ان کے مالک کو سزا دی تھی۔ اسی طرح انہوں نے قحط کے زمانے میں، بھوک مٹانے کی حد تک غلہ چرانے کی سزا موقوف کر دی تھی۔ یَغْفِرُ طَنْ یَّشَاءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ میں یہ حکمت بھی پوشیدہ ہے، یعنی خدا کا قانونِ مثبت ان امور کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

اس عقیدہ نے کہ نجات اور مغفرت، انسان کے اپنے اعمال سے نہیں ہوتی، یہ خدا کے فضل اور اس کی رحمت پر موقوف ہے۔ وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے، اس قوم کو تباہیوں کے کن عینی غاؤں میں دھکیل دیا ہے، اس کا اندازہ انہیں **خدا بخشش کی دعائیں** لگایا جاسکتا۔ ان کے ہاں یہ تصور عام ہو گیا کہ بد معاملک

اور بد اخلاقیات جتنی جی چاہے کرو، ہر نماز کے بعد (۳۳) دفعہ "استغفر اللہ" پڑھ لو اور صبح کی نماز کے بعد اس کی تسبیح پوری کر لو، سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ خدا سے ہر وقت "بخشش" کی دعا مانگتے رہو۔ وہ غفور الرحیم ہے، تمہیں ضرور بخش دے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس "بخشش دینے" کی تہہ میں کیا رمز پوشیدہ ہے؟ خدا نے کہا تھا کہ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۳) یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے میں، مالک بنایا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کی رو سے، جنت اعمال کے بدلے میں ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ جنت اعمال کے بدلے میں نہیں ملتی یہ خدا کی بخشش ہے۔ جسے وہ چاہے بخش دے۔ یعنی ان کے عقیدہ کے مطابق، جنت اعمال کے بدلے میں نہیں، خدا سے "بخشش" کے طور پر ملتی ہے۔ اس لئے یہ ہر وقت بخشش کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ ہم جنت بھی، کچھ کرنے سے نہیں، بلکہ خیرات کے طور پر لینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

بہشتے بہر پاکانِ صرم است بہشتے بہر اربابِ ہم است
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش بہشتے ”فی سبیل اللہ“ ہم است

یہ گدا گردوں کی قوم، بہشت بھی فی سبیل اللہ لینا چاہتی ہے! حالانکہ

آں بہشتے کہ خدائے تو بخشد ہمہ بیج

تاجزائے عملِ توست، جنانِ اچیکم بہست (اقبل)

یہ اس قوم کی کیفیت ہے جس کے خدانے کہا تھا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ..... کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم ابھی تک ان جانگس منازل سے گذرے ہی نہیں جن سے اُمم سابقہ گذر چکی ہیں۔ انہیں مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر زہرہ گداز مصائب و تصادمات کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے پاؤں تلے سے زمیں ریل گئی اور خود رسولؐ اور اس کے ساتھی پکار اُٹھے کہ بار اہلہ! تیری نصرت کب آئے گی؟ اس وقت انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ گھبراؤ نہیں! خدا کی نصرت بہت جلد آجائے گی (۲/۲۱۴)۔ یہ ان کے خدانے کہا تھا اور ان کے رسولؐ نے فرمایا تھا ”جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔“ اور اسی قوم کی اب حالت یہ ہے کہ یہ جنت، بھیک کے طور پر مانگتی ہے۔ یا اللعجب۔ دیکھا، نایشآء کے غلط مفہوم نے قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے!

یہی نہیں، بلکہ یہ قوم اب اپنے گنہگار ہونے پر فخر کرتی ہے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے پیشوایان

مذہب تک اپنے ناموں کے ساتھ ”عاصی پرمعاصی“ اور ”مذنب“ گنہگار ہونے پر فخر!

لکھے جاتے ہیں، لیکن نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس ”انکسار“ کی ہتھ میں، فخر کا جذبہ مضمر ہوتا ہے۔ ”عاصی“ کے معنی مجرم ہیں۔ سوچئے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مجرم کہتے ہوئے شرمائیں نہیں، ان کے ہاں جرم کا ارتکاب وجہ ندامت کس طرح ہو سکتا ہے؟ جرم کا وجہ ندامت ہونا تو ایک طرف، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جرم کامرتکب نہ ہونا، بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔ یہ بات آپ کے لئے شاید وجہ تعجب ہو اور

اگر گناہ نہ کرو گے تو خدا تمہیں مٹا دے گا! آپ غالباً اسے باور کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں، لیکن ہے یہ حقیقت۔ حدیث کی دو کتابوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ یعنی صحیح ترین کتابیں۔ ان میں ایک بخاری ہے اور دوسری مسلم۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث یہ کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ

والذی نفسی بیدۃ۔ لو کم تذبنوا۔ لذهب اللہ بکم ولجأ بقوم ید منبون۔ فیستغفرون۔

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے مٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب گاری کرے۔

جس قوم کے ہاں عقیدہ یہ ہو اور اس عقیدہ کو وہ منسوب کرے حضور رسالت کی طرف) کہ اگر تم گناہ نہ کرو گے تو خدا تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جو گناہ کرے گی اور پھر خدا سے بخشش مانگے گی، تو سوچئے کہ اس قوم میں اگر جرائم و معائب عام نہ ہوں گے تو اور کیا ہوگا۔ جب یہی عقیدہ ہمارے شاعروں کے ہتھ چڑھا تو پھر ”خدا دے اور بندہ لے“ انہوں نے گناہوں کی اہمیت کو ایسے مزے لے لے کر بیان کیا کہ قوم کے نزدیک گناہ مقصدِ حیات اور اصل کائنات بن گئے۔ کہیں کہا گیا کہ

میکر گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت
الہی تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے!

دوسرا آگے بڑھا تو اس نے کہا۔

نصیب ماست بہشت آخدا شناس برو کہ مستحق کرامت گناہ گاراں اند
فارسی اور اردو کے بعد پنجابی کی باری آئی تو شاعر ذوق دم اور آگے بڑھ گیا اور کہا کہ
او تھے کیہہ پروا اے راقب، او تھے بے پروا ئیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دیئے اوگن ہار نوں

لے صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی حدیثیں کس زمانے میں اور کس مقصد کے لئے وضع کی گئی تھیں لیکن ہمارے ہاں نہیں اس قدر صحیح اور محکم مانا جاتا ہے کہ اسے امام مسلم نے اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا اور ہم اسے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۃ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) میں اسے بڑے فخر سے نقل کیا ہے۔ ہم نے مندرجہ بالا ترجمہ بھی وہیں سے نقل کیا ہے تاکہ کسی کو اس میں شک نہ گذرے۔

(اے راقب! خدا بڑا بے پروا ہے۔ اس کی بے پروائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیچو کار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں) اور ارباب تصوف کو تو اس قسم کا موقع خدا سے انہوں نے اس باب میں کیا کیا نقش آرائیاں کی ہیں، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی نظروں سے تصوف کا لٹریچر گذرا ہے۔ مثلاً ایک حضرت صاحب فرماتے ہیں کہ ایک زاہد مریض نے جنگل میں بارہ برس تک بیٹھ کر خدا کی عبادت کی۔ بارہ سال کے بعد، ندا آئی کہ ہم نے تمہاری عبادت قبول کر لی ہے۔ مانگو، کیا مانگتے ہو؟ اب ان کی سمجھ میں نہ آئے کہ خدا سے کیا مانگیں۔ وہ اسی شش و پنج میں بیٹھے تھے کہ دیکھا، ایک مرد بزرگ سامنے سے آرہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ جب انہوں نے بات بتائی تو اس بزرگ نے کہا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم نے بارہ سال تک عبادت کی ہے، کہو کہ مجھے عدل چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے خدا سے کہا کہ میں عدل چاہتا ہوں۔ اس پر جواب ملا کہ بہت اچھا، ہم عدل کرتے ہیں۔ تم بارہ سال تک اس پتھر کے اوپر بیٹھے ہو۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اب بارہ سال تک یہ پتھر تمہارے اوپر بیٹھے۔ اب انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ جسے انہوں نے مرد بزرگ سمجھا تھا شیطان تھا جس نے انہیں بہکا دیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے عدل مانگا تھا، عدل مل گیا۔ بارہ برس تک یہ پتھر کے نیچے بیٹھے رہے! اس کے بعد پھر بارہ برس تک خدا کی عبادت کی اور پھر ندا آئی کہ مانگ کیا مانگتا ہے! انہوں نے کہا کہ ہاں! میں تیرا فضل مانگتا ہوں، عدل نہیں مانگتا، جواب ملا کہ ہم نے تمہیں قطب بنا دیا۔ یا اور کھو! عدل کا مطالبہ شیطان کا ہے۔ ہمارے بندے ہمیشہ فضل مانگتے ہیں!

سینٹ پال کی تعلیم کا اثر آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کے عقائد کا سرچشمہ کونسا ہے؟ عیسائیت کی وہ تعلیم جسے سینٹ پال نے ایجاد کیا۔ آپ بائبل (عہد نامہ جدید) میں، سینٹ پال کے خطوط دیکھئے۔ ان میں آپ کو کھلے گاکے

تم کو نجات، عقیدہ کی رو سے ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں! خدا کی بخشش ہے۔ یہ

(افسیوں ۸-۹/۲)

تمہارے اعمال کے سبب نہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان 'شریعت کے اعمال کی وجہ سے نہیں' بلکہ 'ان اعمال کے بغیر' عقیدہ کی بنا پر راست باز ٹھہرتا ہے۔
(رومیوں کے نام) ۱۲/۲۸

اسی بنا پر عیسائیوں کے ہاں (GOD IS MERCY) کا عقیدہ عام ہو گیا۔ اور یہی وہ عقائد تھے جو ہمارے ہاں بھی جزو دین، بلکہ مغز دین بن گئے اور ان کی تائید کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ

لَنْ يَدْخُلَ أَحَدٌ كَمَ الْجَنَّةِ بِحَدِّهِ

تم میں سے کوئی شخص اپنے اعمال کی بدلت جنت میں نہیں جاسکے گا۔

یہ ہے یَغْفِرُ مَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ کے غلط مفہوم اور اس کے ترجمہ کا نتیجہ کہ "خدا جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔"

اور یہ ہیں عقیدہ تبر (تقدیر) کی کرشمہ زائیاں اور تباہ کاریاں!



لہٰذا اس روایت کو تاج العروس نے نقل کیا ہے اور وہاں سے لینے نے اپنے قانوس میں (حرف ب کے تحت) درج کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور اس قسم کی دیگر روایات وضعی ہیں۔

لے عذاب و مغفرت کے متعلق مزید تفصیل میری کتاب "جہانِ فردا" میں ملیں گی۔

موت کا ایک دن معین ہے

کیا یہ حقیقت ہے یا محض شاعری ہے؟ ہمارے ہاں کامرؤجہ عقیدہ تو یہی ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ ہر شخص کی عمر پہلے سے لکھی ہوتی ہے اور اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جب تک کسی کی موت کا وقت نہیں آتا، اسے کوئی مار نہیں سکتا اور جب اجل آجاتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ موت ہی نہیں، بلکہ بیماری تک کے متعلق پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ فلاں وقت آئے گی اور پھر فلاں وقت چلی جائے گی، یا مریض کو ختم کر دے گی۔ لیکن اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کو آپ دیکھئے۔ بیماری آتی ہے تو وہ اس کے علاج کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ بیماری ذرا لمبی ہو جاتی ہے تو علاج بدلتے ہیں۔ بار بار پوچھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! بچے کا بخار کب تک ٹوٹے گا؟ یہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی ایسی دوائی دیجئے کہ بخار جلد ٹوٹ جائے۔ اور اگر یہ محسوس ہو کہ بیمار بچتا نہیں تو پھر اس کے لئے جس قدر تگ و دو کی جاتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر، قیمتی سے قیمتی دوائیاں، خدا کے لیل

منتیں، نذر، نیاز، درگا ہوں پر سجدہ ریزیاں، حضرت صاحب سے دعائیں، یہ سب کا ہے کے لئے؟ اس لئے کہ بیمار

موت سے بچ جائے۔ اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ اس سے پہلے آ نہیں سکتی اور اگر اس کا وقت آگیا ہے تو آپ کے ہزار علاج معالجے اور لاکھ منتیں اور دعائیں اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹال نہیں سکتیں۔ اگر مریض جانبر ہو جائے تو بڑے فحش سے کہیں گے کہ ہم نے یہ

علاج لرایا اور وہ کوشش کی۔ اور اگر وہ مر جائے تو پھر کہا جائے گا کہ ہم نے تو سب کچھ کر دیکھا لیکن اس کی لکھی ہی اتنی تھی۔ موت کا کیا علاج ہو سکتا ہے! اور اس وقت ان سے کوئی نہیں پوچھتا (نہ وہ خود ہی سوچتے ہیں) کہ جب موت نے اپنے وقت پر آکر رہنا تھا تو اس تک و دو سے حاصل کیا تھا۔ یہ کچھ کیا کیوں؟ عقیدہ وہ اور عمل بہ! اور عقیدہ اور عمل کا تفاوت ہے جس سے قویں تباہ ہوتی ہیں۔ اس سے نہ ارادے میں پختگی پیدا ہوتی ہے نہ عمل میں ثبات۔ کاپتے ہاتھوں سے کبھی نشانہ ٹھکانے پر نہیں بیٹھتا۔

اس عقیدے کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے انسان کا دل خوف و ہراس سے مامون ہو جاتا ہے۔ وہ موت سے ڈرتا نہیں۔ اس میں بلا کی جراتیں اور قیامت کی بے باکیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے سپاہیوں کو بتایا اور سکھایا جاتا ہے کہ جس گولی پر تمہارا نام نہیں لکھا وہ تمہیں چھو تک نہیں سکتی اور جس پر تمہارا نام لکھا ہے، اس سے تم بچ نہیں سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اس کی بھی تاکید کی جاتی ہے کہ اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان کرو۔ اپنے آپ کو جان بوجھ کر خطرے میں نہ ڈالو۔ عقیدہ وہ بتایا جاتا ہے، عمل یہ سکھایا جاتا ہے!

انسانی جسم کی مشینری، خدا کے قوانین طبعی کے مطابق چلتی ہے اور انہی قوانین کے مطابق اس

موت ہر ایک کے لئے ہے | کی حرکت رک جاتی ہے۔ اس مشینری کی حرکت کے اس طرح رک جانے کو موت کہتے ہیں۔ موت ہر متنفس کو آتی ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ

ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴)۔ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴/۷۸)۔ خواہ تم کیسے ہی محکم اور مضبوط قلعوں کے اندر بھی پناہ گزیں کیوں نہ ہو، وہاں بھی آجائے گی۔ تم اس سے بھاگ کر نہیں نہیں جا سکتے۔ (۶۲/۸)۔ حتیٰ کہ خود حضور رسالت مآب کے متعلق فرمایا کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ (۳۹/۳۰)۔ انہوں نے (تمہارے مخالفین نے) بھی مرنا ہے اور تم بھی وفات پاؤ گے۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا

موت باذن اللہ کے معنی | مَوْعَجَّلاً (۳۱/۴۴) اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔ کسی شخص کو خدا کے حکم (اذن) کے بغیر موت

نہیں آ سکتی۔ یہ ایک ایسی اجل ہے جو لکھی ہوئی ہے۔ اس آیت میں اَوْتَ، کتاب اور اجل کے

الفاظ قابل غور ہیں۔ ان الفاظ کا قرآنی مفہوم اس سے پہلے (چھٹے باب میں) تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں سے آپ دیکھیں گے کہ اذن کے معنی قانونِ خداوندی کے ہیں۔ اجل کے معنی میعاد یا وقفہ کے ہوتے ہیں اور جس مقام پر وہ میعاد ختم ہوتی ہے اسے بھی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کتاب کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں۔ ان معانی کی روش سے، مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی اور موت، قانونِ خداوندی کے تابع ہے۔ انسان کی پیدائش اور موت کے درمیان وقفہ (اجل) کو اس کی عمر کہا جاتا ہے۔ اور اس وقفہ یا میعاد کا تعین، قانونِ خداوندی کی روش سے ہوتا ہے۔

يَكُلُّ أَحْبَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ ہر میعاد اور وقفہ کے لئے ایک قانون ہے۔ جب اس وقفہ کا آخری لمحہ آ جاتا ہے (جسے موت کہا جاتا ہے) تو اس وقت اس میں کمی بیشی (تاخر و تفتتم) نہیں ہو سکتی (۶۳/۱۱) یعنی موت کہتے ہی اس لمحہ کو ہیں جب انسان کی عمر ختم ہو جائے، لہذا اس لمحہ کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ پہلے آگیا ہے یا بعد میں۔ سوال یہ ہے کہ پیدائش اور موت کے درمیان جو وقفہ ہے اور جسے عمر کہا جاتا ہے، وہ گھٹ بڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے | اس میں کمی اور بیشی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

اس قسم کے الفاظ تو ہم ہر روز بولتے ہیں لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اس نے بڑی لمبی عمر پائی ہے یا وہ چھوٹی عمر میں مر گیا۔ لمبی یا چھوٹی (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) اضافی (RELATIVE TERMS) ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ایک گز لمبی لکڑی لاؤ۔ وہ اگر چار فٹ لمبی لکڑی لے آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ زیادہ لمبی ہے اور اگر دو فٹ کی لکڑی لے آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ چھوٹی ہے۔ لمبی اور چھوٹی، کمی اور بیشی، یا گھٹنے اور بڑھنے کے سلسلہ میں ایک پیمانہ قرار کرنا ہوتا ہے اور اس پیمانہ کی نسبت سے یہ الفاظ بولے جاسکتے ہیں۔ اب سوچئے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اس شخص نے بڑی لمبی عمر پائی ہے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر لوگوں کی جتنی عمر ہوتی ہے یہ شخص اس سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہا ہے۔ کسی ملک یا قوم کے لوگوں کی عام (اوسط) عمر کو، عمرِ طبعی کہا جاتا ہے۔ اور اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قومیں، حفظانِ صحت کے اصولوں کی کاربندی، عمدہ خوراک، امراض کی روک تھام کی تدابیر، معیارِ زیست کی بلندی وغیرہ سے اپنے ہاں کی ”عمرِ طبعی“ بڑھا

لمیتی ہیں۔ اور بڑھائے جا رہی ہیں۔ ان کے برعکس، جو قومیں ان امور کا خیال نہیں کرتیں، ان کے ہاں کی عمر طبعی، نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اقوام کی طرح افراد کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جو لوگ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں اور ان اسباب و ذرائع پر نگہداشت جن سے جسم کی مشینری عمدگی سے چلتی ہے، وہ اگر کوئی حادثہ نہ ہو جائے، تو لمبی عمر تک جیتے رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے ہاتھوں اپنی صحت کا ستیاناس کر رہتے ہیں، وہ جلدی مر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خودکشی کرنے والا جس وقت چاہے اپنی عمر کو ختم کر سکتا ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ **وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ (۱۱/۳۵)**۔ نہ کسی کو لمبی عمر ملتی ہے، نہ کسی کی عمر میں سے کچھ کم کیا جاتا ہے، سب اس کے کہ یہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص کی عمر کا تعین پہلے سے کیا جا چکا ہو، (یعنی اس کی پیدائش سے پہلے ہی یہ لکھ دیا گیا ہو کہ اس کی عمر اتنی ہوگی) تو پھر اس کی عمر کے، اس سے کم یا زیادہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق خدا نے لکھ دیا کہ اس کی عمر پچاس برس کی ہوگی۔ خدا کے اس فیصلے (تقدیر) کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پچاس برس سے پہلے مر جائے، یا اس کے بعد زندہ رہے۔ عمر کے بڑھ جانے یا گھٹ جانے کا امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عمر کا تعین پہلے سے نہ ہو چکا ہو۔ بنا بریں، مندرجہ بالا آیت اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ عمروں کا تعین پہلے سے نہیں ہو جاتا۔ طبعی زندگی، طبعی قوانین کے مطابق گزاری جاتی ہے۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان لمبی عمر پاتا ہے۔ انکی خلاف فری کرنے سے وہ اپنی عمر گھٹا لیتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم طبعی قوانین کہتے ہیں تو اس میں ماں باپ کی طرف سے منتقل ہونے والے وراثتی اثرات، رحم مادر میں جنین کی مناسب حفاظت و پرورش، پیدائش کے بعد، اس کی غذا اور حفظانِ صحت کی دیکھ بھال، عام معاشرتی حالات، اعصابی سکون و توازن کے اسباب و علل، علاج معالجہ کے انتظامات، حادثات کی روک تھام کی تدابیر وغیرہ سب شامل ہیں۔ یہی وہ پہلے ہیں جن کے مطابق عمروں کا تعین ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں **مَخْنُوقًا**۔ **قَدْ نَمُنَا بِبَيْنِكُمْ اَلْمَوْتُ (۶۰/۵۶)**۔ ہم نے تمہارے

موت کے پہلے (قوانین)

لئے موت کے پہلے مقرر کر دیئے ہیں۔ جو قوم، یا جو افراد

جس قسم کا پیمانہ چاہیں اپنے لئے منتخب کر لیں۔ اس کے لئے تاکید کر دی گئی کہ **وَلَوْ شِئْنَا بِأَيِّدِكُمْ إِلَى اللَّهِ مَلَكَ (۲/۱۹۵)**۔ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ سوچئے کہ اگر ہلاکت کا وقت پہلے سے متعین ہوتا تو اس تاکید سے مطلب کیا تھا؟ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر پہلے سے طے تھا کہ فلاں شخص نے، فلاں دن اور فلاں وقت، فلاں طریق سے مرجانا ہے، تو جو شخص کسی کو قتل کر دے، اسے مجرم کہوں قرار دیا جائے۔ قسراں کی رو سے، قتل تو سنگین ترین جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ لیکن اگر ”تقدیر کی رو سے“ مقتول کی موت اسی طرح اس کے ہاتھوں، واقع ہونی تھی تو اس میں مجرم کا کیا قصور؟ قرآن کریم نے قتلِ عمد (بالارادہ کسی کو قتل کر دینے) اور قتلِ خطا (کسی کے ہاتھوں، سہو یا بلا ارادہ کسی کی موت واقع ہو جانے) میں فرق کیا ہے اور ان کی سزائیں مختلف تجویز کی ہیں۔ قتلِ خطا میں خوں بہا لیا جاسکتا ہے لیکن قتلِ عمد میں سزا دی جاتی ہے۔ (۹۲۱۔ ۴/۹۳)۔ ”عمد اور خطا“ کے اس فرق سے بھی ظاہر ہے کہ اس باب میں مجرم کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ پہلے سے مقدر ہو تو پھر مجرم کا جرم کیا اور اس کی نوعیت میں فرق کے کیا معنی؟ ان امور کے متعلق تفصیلی گفتگو آئندہ چل کر کی جائے گی۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ سورۃ مائدہ میں ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ فِي الْأَرْضِ خِثَاءً ۖ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۚ** جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، بجز اس کے کہ اسے قتل یا بغاوت (فساد) کے جرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہو، بوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ **وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲)**۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو بھی زندگی عطا کر دی (اس کی جان بچا دی) تو بوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی۔

اگر موت کا ایک دن معین ہے تو کوئی شخص کسی کی جان کیسے بچا سکتا ہے؟ کسی کو مار دینے یا اس کی جان بچا دینے کا امکان تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یہ امور پہلے سے فیصلہ شدہ نہ ہوں

اے اگرچہ اس آیت کا تعلق قوموں کی اجتماعی حیات و موت سے ہے، لیکن یہی اصول افراد پر بھی کارفرما ہے۔ فرد بھی تو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈال لیتا ہے جس سے اُسے روکا گیا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ، اور تو اور، میدانِ جنگ میں، سر بجھ نکلنے والے سپاہیوں تک سے بھی تابعدار کر دی کہ خُنْ وَ خُنْ تَاکُمْ (۴/۷۱)۔ اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان ساتھ رکھو۔ قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔ حتیٰ کہ، یہاں تک بھی تابعدار کر دی کہ خطرہ کے عالم میں اجتماعِ صلوٰۃ کے لئے یہ شکل اختیار کرو کہ ایک گروہ شامل اجتماع ہو تو دوسرا گروہ پیچھے کھڑا ان کی حفاظت کرے اور ایک سجدہ کے بعد، وہ گروہ پیچھے آکر کھڑا ہو جائے اور محافظ دستہ شامل اجتماع ہو جائے۔ (۴/۱۰۲)۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی سپاہی کو وہ گولی بگنی ہی نہیں جس پر اس کا نام نہ لکھا ہو اور جس گولی پر اس کا نام لکھا ہو، اس سے وہ بچ ہی نہیں سکتا، تو اس قسم کی حفاظتی تدابیر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اب رہا یہ کہ انسان کا سینہ کس طرح خوف و ہراس سے مامون ہو سکتا ہے اور وہ موت کے ڈر پر کس طرح قابو پا سکتا ہے، تو اس کے لئے، موت اور حیات کا وہ نظریہ سامنے لانا چاہیے جسے قرآن اس شرح و بسط سے پیش کرتا ہے وہ نظریہ یہ ہے کہ زندگی، یہی طبعی زندگی نہیں۔ اس کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ حیات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، پیگمرا انسانی تک پہنچتی

ایمان بالآخرت کے انسان موت کے

بے خوف ہو سکتا ہے

ہے۔ اس سطح پر جو جو انسان قرآن کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق، زندگی بسر کرے، اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان ارتقائی منازل کا اگلا میدان موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۹۶/۲) موت اور حیات کا سلسلہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو (TEST) کر سکو کہ تم میں زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

اب آپ سوچئے کہ جس نظریہ کی رُو سے، موت، زندگی کے وسیع تر، رفیع تر، حسین تر، امکانات واکر۔ نہ کا باب (دروازہ) ہو، اس نظریہ کے حاملین کے نزدیک موت کوئی ڈرنے کی چیز ہوگی؟ وہ موجودہ زندگی کی حفاظت کے لئے کوشش اس لئے کرے گا کہ اسے اپنی صلاحیتوں کے بیدار اور اپنی ذات کو مستحکم کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں۔ اور اس کے بعد جب موت سامنے آکر اس منظر پر

سے پردہ اٹھا دے گی جہاں زندگی کی درخشندہ تر شمعیں فروزاں ہوں گی، تو وہ موت کو لپک کر گلے سے لگا لے گا۔ یہی وہ اربابِ ایمان و عمل، سعادتمند افراد ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

نشانِ مردِ حقِ دیگر چہ گویم

چو مرگ آید، تبستم بر لبِ اوست

جو طالبِ علم، امتحان میں کامیابی کے بعد، اگلی جماعت میں چلا جاتا ہے، اسے کچھلی جماعت کے چھوڑنے کا صدمہ نہیں ہوتا وہ تو اس پر جشنِ مسرت مناتا ہے۔

جن اعمالِ حیات سے، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے، ان کی تفصیل تو طولِ طویل ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب زندگی کے کسی طبعی تقاضے اور مستقل قدر میں تصادم ہو (ان میں TIE پڑ جائے) تو اس وقت مستقل قدر کو طبعی تقاضے پر ترجیح دی جائے۔ جس قدر وہ طبعی تقاضا زیادہ جاذب، عزیز

مقتولین فی سبیل اللہ کا مقام اور گراں بہا ہوگا، اسی قدر اس عمل کا وزن زیادہ ہوگا۔ طبعی زندگی کے تقاضوں میں، تحفظِ خویش (جان کی حفاظت) کا تقاضا سب سے زیادہ شدید اور گراں بہا ہوتا ہے۔ جب ایسا وقت آجائے کہ مستقل قدر (حق) کی حفاظت کے لئے جان تک دیدنی پڑے، تو قرآن کہتا ہے کہ اس طرح جان دینے والے کو مردہ کہو ہی نہیں۔ بَلْ اَحْيَاءٌ ۚ ذٰلَکُمْ لَآ یَعْقِلُوْنَ ۚ لَآ تَشْعُرُوْنَ ۚ (۲/۱۵۴) زندہ درحقیقت وہی ہے لیکن تم طبعی زندگی کے شعور کی سطح سے، اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اقبالؒ اسے (مستقل اقدار کیساتھ) عشق سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

کھول کے کیا بیان کروں، سہرِ مقامِ مرگِ عشق

عشق ہے مرگِ با شرف، مرگِ حیاتِ بے شرف

یہ ہے وہ ایمان جس سے مردِ مومن کا قلب، رعد آسا جراثیموں اور برقِ مثال بے باکیوں کا شعلہ جوالہ بن جاتا ہے اور وہ ”بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے“ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

خودی ہے زندہ تو ہے موتِ اک مقامِ حیات

کہ عشقِ موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

وہ خاکِ مجبور کی طرح ”موت کے متعین وقت“ کا انتظار نہیں کرتا، بلکہ، حق و باطل کی آویزش میں، موت

کو خود آواز دے کر بلا لیتا ہے کہ اس کی ہم آغوشی سے اُسے حیاتِ جاوداں نصیب ہو جاتی ہے۔
 اس کا ایمان ہوتا ہے کہ _____ ہے کبھی جاں اور کبھی تسیم جاں ہے زندگی
 اگر موت کا وقت، مقام، اور طریق پہلے سے متعین ہوتا تو ان مردانِ مجاہد کو 'حق' کی خاطر، اپنے پروگرام کے
 مطابق، مخالفین کی جان لینے اور اپنی جان دیدینے کی تاکید کیوں کی جاتی۔



اے بیچاری بد قسمت!

میں نے طلوع اسلام کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۶۶ء سے خطاب کرتے ہوئے ”خدا کی مرضی“ کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا، جو بڑا مقبول ہوا تھا۔ اس کے ابتدائیہ میں، میں نے تمثیلی انداز میں کہا تھا۔

نور خان کی بیوی کے اوپر تلے، چار لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ ہر لڑکی کی آمد پر گھر میں صاف ماحم کچھ جاتی۔ چوتھی لڑکی کی پیدائش کے بعد، ماں باپ، عزیز واقارب کے اصرار سے نور خان دوسری شادی کرنے کی کٹھان چکا تھا۔ بیوی نے ہزار منتوں، سماجتوں سے اسے روکا۔ وہ اُس وقت توڑک گیا لیکن بیوی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر پھر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ ضرور دوسری شادی کر لے گا۔ اور بے چاری کی بد قسمتی ملاحظہ ہو کہ پانچویں بار پھر لڑکی پیدا ہوئی۔ نور خان کی بیوی کو غش پر غش آرہے تھے۔ دل کے دردے پڑتے تھے۔ لیکن گھر والے سب اس سے ناراض تھے۔ خاندان ادھر کا رخ تک نہیں کرتا تھا۔ وہ تنہا چارپائی پر پڑی روتی رہتی۔ گلی محلے کی عورتیں آتیں اور اسے تسلی دیتیں کہ یہ سب خدا کی مرضی پر منحصر ہے وہ جسے چاہے لڑکے دے، جسے چاہے لڑکیاں دے۔ تمہارے رونے دھونے سے کیا حاصل ہے۔ جب خدا کا لکھا ہی ایسا تھا تو اسے کون مٹا سکتا ہے۔ مرضی مولا برہمہ اولیٰ۔ صبر شکر کر کے مصیبت برداشت کرو۔ خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ وہ مالک ہے۔ جس حال میں چاہے رکھے۔ (حضرت سلیمانؑ نے ایک دفعہ دل ہی دل میں کچھ شکوہ شکایت کیا تھا۔ بارہ برس تک بھٹیاری کا بھٹ جھونکنا پڑ گیا۔ اس لئے کوئی ایسی ویسی بات زبان پر نہ لانا۔ وہ

بڑا بے پردا ہے

لڑکی کی پیدائش پر صفِ ماتم | یہ بات تو ہم بعد میں دیکھیں گے کہ "خدا جسے چاہے لڑکیاں دے، جسے چاہے لڑکے دے،" کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

پہلے یہ دیکھیں کہ لڑکی کی پیدائش پر جو گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے، اس کی وجہ کیا ہے۔ اور یہ صفِ ماتم، جہلا کے گھروں ہی میں نہیں بچھنی۔ بڑے بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک آدمی لڑکی تک تو خیر، وہاں کچھ نہیں کہا جاتا۔ لیکن جب نو بہت، دو چار تک پہنچ جائے تو رونا دہاں بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اس رونے کے آنسو آنکھ سے نہ بھی ٹپکیں، تو بھی دل کی کلی تو ضرور مڑ جھکا جاتی ہے، خواہ منہ رکھنے کو میاں صاحب کتنا ہی کیوں نہ کہیں کہ نہیں، ہم تو لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اس میں فرق ضرور کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں کیا جاتا ہے اور لڑکی کی آمد وجہ افسردگی کیوں ہو جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ اس کی ایک وجہ اقتصادی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں، عورتیں، معاشی طور پر مردوں کی دست نگر ہوتی ہیں اور لڑکیوں کے لئے مناسب بر تلاش کرنے اور ان کے آسماں سے باتیں کرنے ہوتے، تقاضوں کے پورا کرنے میں جو جانسکاء دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا احساس لڑکی کے والدین کو ہر مردہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد، اگر شادی کامیاب نہیں ہوتی اور لڑکی، دو چار بچوں کے ضمیمے سمیت، میکے میں آ بیٹھتی ہے تو یہ حادثہ بھی کچھ کم جانسکاء نہیں ہوتا۔ لیکن اس صفِ ماتم کی وجہ صرف اقتصادی نہیں۔ اس کی بنیاد ہی کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت کو مسٹر کے مقابلہ میں سمجھا ہی فخر جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت، محض

عورت کو فرد تر سمجھا جاتا ہے | عورت ہونے کی جہت سے، مرد سے کمتر ہوتی ہے یا خیال

مرد کا پیدا کردہ ہے!

ہندوؤں نے تو عورت کا شمار انسانوں کی صف میں کیا ہی نہیں۔ انہوں نے اسے ایک جنس قرار دیا جو کسی نہ کسی کی ملکیت میں رہتی ہے۔ بیٹی ہے تو باپ کی ملکیت میں، بیوی ہے تو خاوند کی ملکیت میں اور ماں ہے تو بیٹے کی ملکیت میں۔ وہ کسی شے کی ملک نہیں ہو سکتی۔ اسے جو کچھ دیا جاتا ہے بطور دات (خیرات) دیا جاتا ہے۔ جہاں تک اس کے بیوی ہونے مذاہبِ عالم میں عورت کی حیثیت کا تعلق ہے، ایک عورت کے بیک دفن متعہ و خاوند

ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہما بھارت میں ہے کہ دروپردی کے پانچ خاوند تھے اور انہوں نے اُسے جوئے میں ہار دیا تھا۔ پرانوں کی روایت کے مطابق نرپسی کنیا سے سات رشیوں نے بیاہ کیا تھا۔ دارکشی نامی منی کنیا سے پرچیتا نامی دس برہمن بھائیوں نے بیک وقت شادی کی تھی۔ یہ بھائی، ویدوں کے رشی بھی تھے۔ چونکہ ہندو دھرم شاستر برہمنوں کا وضع کردہ ہے، اس لئے اس میں، برہمنوں کو خاص مراعات دی گئی ہیں۔ چنانچہ انھیں وید نیز بزرگ وید میں ہے کہ

اگر کسی ایک عورت کے پہلے دس غیر برہمن خاوند موجود ہوں اور برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے گا کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک ہوتا ہے۔

ان حالات میں، ہندو سوسائٹی میں (ان کے دھرم کی رو سے) عورت کا جو مقام ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

یہودیوں کے ہاں (تورات میں) ہے کہ خدا نے آدم (مرد) کو پیدا کیا، تو وہ تنہائی کی وجہ سے اس کو اداس سارہنے لگا۔ اس کا دل بہلانے کی خاطر، خدا نے، اس کی پسلی سے خواہ کو پیدا کر دیا۔ یعنی مقصود تورات کی رو سے عورت کی پوزیشن

بالذات تو مرد کی پیدائش ہی تھی۔ عورت اس کے لئے نکھونے کے طور پر پیدا کر دی گئی۔ پھر عورت شیطان کے فریب میں آگئی اور اس نے آدم کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ عیسائیوں کے ہاں، اسی افسانہ کی رو سے عورت کو تمام برائیوں کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسانی

بچہ، اپنے اولین ماں باپ کا یہ گنا اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے جس کے ازالہ کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لایا جائے۔ گناہوں کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے، ان کے ہاں عورت کو ایسا قابل نفرت سمجھا جاتا ہے کہ اسے چھو جانا بھی خباثت کا موجب تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے (SAINTS) سچرہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عیسائیت کے دورِ اول میں (VALESIANS) نامی ایک فرقہ تھا جو اپنے آپ کو خستی کر کے، مقربینِ خداوندی کے زمرہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ عورت، جنت میں نہیں جاسکتی۔ اس سے یہ دشواری سنائی آئی کہ پھر حضرت مریمؑ کا کیا کیا جائے۔ اس کے حل کے لئے یہ کہا گیا کہ آخرت میں سب عورتیں مرد بنادی جائیں گی۔ اور اس طرح جسے جنت میں جانا ہوگا، وہ مرد کی حیثیت سے جنت میں جائے گی۔ سینٹ پال

اس تعلیم کو عام کرتا تھا کہ ”آدمی، عورت سے پیدا نہیں کیا گیا۔ عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے قانون کی رشتے سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں کمتر درجہ پر رہنا چاہیئے۔“ آپ عیسائیوں کا مذہبی لٹریچر دیکھئے۔ اس میں عورت کی تصویر ایسی قابل نفرت کھینچی جاتی ہے کہ اس کے تصور سے گھن آنے لگ جاتی ہے۔

مذہب کی دنیا سے نیچے اتر کر، عالم فکر کی طرف آئے تو وہاں بھی عورت کے ساتھ اسی قسم کا سلوک

ہوتا دکھائی دے گا۔ ارسطو، جسے فلاسفرز کا ابوالابار کہا جاتا ہے، یہ **فلاسفرز کے نزدیک** ”فلسفہ“ پیش کیا کرتا تھا کہ عورت ہر گوشہ میں مرد سے فروتر واقع ہوتی ہے۔

حقیقت (وہ کہتا تھا کہ) مرد کے منہ میں بتیس دانت ہوتے ہیں اور عورت کے منہ میں اٹھائیس۔ (اسے اپنے اس فلسفہ کی صداقت پر اتنا یقین محکم تھا کہ اس نے کبھی اتنی سی زحمت گوارا کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ اپنی بیوی کا منہ کھول کر دیکھ لے کہ اس میں کتنے دانت ہیں!) اس کا قول تھا کہ ”عورت کے کردار کے متعلق ہمیں بس یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فطرت کے پروگرام میں ایک کمی رہ گئی ہے۔“ (PLAUTUS) کہا کرتا تھا کہ ”عورت کے معاملہ میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی یہ کہے کہ میں اچھی عورت کا انتخاب کروں گا۔ اس انتخاب سے ہر دوسری عورت پہلی سے بدتر نکلی گی۔“ یہ تو پھر بھی پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ رومسوجس نے عصرِ جدید میں یورپ (بلکہ دنیا) کو انسانی حقوق اور تصورِ جمہوریت سے روشناس کرایا، کہا کرتا تھا کہ ”عورت کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مرد کی مطیع و فرمانبردار رہے اور اس کی ناانصافیوں کو برداشت کرے۔“ انیسویں صدی تک کے محققین مغرب کی تحقیق یہ تھی کہ ”زمانہ قدیم میں“ مرد نے سب سے پہلے جس جانور کو گھریلو بنایا، وہ عورت تھی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں جب انگلستان میں عورتوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تحریک چلائی تو، ملکہ نے یاد رکھئے کسی مرد بادشاہ نے نہیں، خود عورت، ملکہ نے انتہائی غصے کے عالم میں اعلان کیا کہ

حضور ملکہ معظمہ کی دلی خواہش ہے کہ ہر وہ دانشور جو، عورتوں کی اس پاگل پن اور حماقت آمیز

روش کو روکنے کے لئے کچھ لکھ سکتا یا کہہ سکتا ہے ملکہ کا دست و بازو بنے۔ یہ مسئلہ ایسا

غضب آویں اور اشتعال انگیز ہے کہ ملکہ معظمہ اپنے آپ پر ضبط نہیں کر سکتیں۔ خدا نے مرد اور

عورت کو مختلف حیثیتوں سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے عورتوں کو آپے سے باہر نہیں ہونا

چاہیے۔

اور اس باب میں 'اب بھی کونسی کمی ہو گئی ہے' (H. L. MENCKEN) لکھتا ہے کہ "محبت کا تصور اس امر کی فریب دہی (یا فریب خوری) کے لئے وضع کیا گیا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت سے مختلف ہوتی ہے۔" یہ فریب ہے۔ سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ "انسانی ذہن کی سب سے بڑی ربحاویہ خیال ہے کہ عورت میں بھی کوئی خوبی ہوتی ہے۔" (C. O. SKINNER)

عصر حاضر میں 'امریکہ کو بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک کہا جاتا ہے اور وہاں کی عورت کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ بڑی آزاد واقع ہوئی ہے اور وہاں مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ میرے سامنے اس وقت، وہاں کا (ایک معنی میں خود حکومت کا ترجمان) رسالہ (DIALOGUE) جلد ۲ شمارہ ۱۲ (بابت ۱۹۸۷ء) ہے۔ اس میں 'ساری تحقیقات کا رخ اس سمت کو جاتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے ہم درجہ تصور نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ہے وہ پوزیشن جو عورتوں کو مردوں کی طرف سے ملتی چلی آرہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کسی جانور نے بھی اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو مرد نے اپنے رشتہ جاتی حیات کے ساتھ کیا ہے۔ ظہور اسلام کے وقت، عیسائیت کا دور دورہ تھا اور عورت کے خلاف تحقیر و تذلیل کے جذبات انتہائی شدت تک پہنچ چکے تھے۔ ایسے میں قرآن آیا اور اس نے پوری قوت کے ساتھ اعلان کیا کہ یہ تمام خیالات مردوں کے خود وضع کردہ ہیں جنہیں حقیقت کے ساتھ کوئی

قرآن کا اعلان

واسطہ نہیں۔ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور جو خصوصیات انسان کو حاصل ہیں اور جس شرف و مجد کا وہ حامل ہے، ان میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ تَمَثَّلْكُمْ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۴/۱)۔ اس نے انسانی تخلیق کی ابتدا ایک جرثومہ حیات سے کی اور اسی سے نر اور مادہ کو پیدا کیا۔ جب ان کی زندگی کا سرچشمہ ایک ہے تو پیدائش کے اعتبار سے تفریق کیسی! یہ درست ہے کہ طبعی زندگی میں (BIOLOGICALLY) ان کے وظائف حیات میں فرق ہے، لیکن وہ فرق صرف تقسیم کار کا ہے، شرف و مجد کا نہیں۔ جہاں تک انسانی صلاحیتوں کا تعلق ہے، وہ دونوں میں یکساں طور پر موجود ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے، جو کچھ ایک (مرد) بن سکتا ہے وہی کچھ دوسرا (عورت) بن سکتی ہے۔ سورہ احزاب کی اس آیت جلیلہ کو دیکھئے اور غور

کیجئے کہ قرآن کریم، مصافِ زندگی میں کس طرح مردوں اور عورتوں کو شانہ بشانہ چلتے دکھاتا ہے۔ ارشاد ہے

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ - اگر مردوں میں اس کی صلابت
مرد اور عورت شانہ بشانہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر سکیں تو عورتوں میں بھی اس

کی صلاحیت ہے۔ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ - اگر مرد اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں

جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے امن عامہ کی ذمہ دار بنتی ہے تو عورتیں بھی اس کی رکن بن

سکتی ہیں۔ وَالْقَنَاتِیْنَ وَالْقَنَاتِیْنَ - اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو

اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اس کا استعمالِ خدائی پروگرام کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں

بھی ہے۔ وَالصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقِیْنَ - اگر مرد اپنے دعوائے ایمان کو عمل سے سچ کر دکھانے کے

قابل ہیں تو عورتیں بھی اس کے قابل ہیں۔ وَالصَّابِرِیْنَ وَالصَّابِرِیْنَ - اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے

ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں وَالْحَشِیْعِیْنَ وَالْحَشِیْعِیْنَ - اگر مرد اس قابل ہیں کہ جوں جوں ان

کی صلاحیتیں نشوونما پانی جائیں وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے اور زبان بھکنے جائیں تو عورتیں بھی اس

قابل ہوتی ہیں۔ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ - اگر مردوں میں اِثَار کا مادہ ہے تو عورتوں میں

بھی یہ مادہ موجود ہوتا ہے وَالصَّائِغِیْنَ وَالصَّائِغِیْنَ - اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے

ہیں کہ جہاں سے انہیں روکا جائے وہ رک جائیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں وَالْحَفِیْظِیْنَ وَالْحَفِیْظِیْنَ

وَالْحَفِیْظِیْنَ - اگر مرد اپنے جسی میلانات کو ضوابطِ خداوندی کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا

کر سکتی ہیں وَالذِّاکِرِیْنَ وَالذِّاکِرِیْنَ - اگر مرد، قوانین کو سمجھنے اور انہیں دہر

اپنے پیش نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب یہ تمام صلاحیتیں، مردوں اور

عورتوں، دونوں میں، یکساں طور پر موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہو

جائیں۔ لہذا، اَعَدَّ اللّٰهُ لَكُمْ مَغْفِرَةً ۚ وَ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (۳۲/۳۵)۔ خدا نے ان سب

کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

آپ قرآن کریم کی ان تصریحات کو دیکھیں اور پھر غور کریں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق

کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے لیکن عورت میں نہیں۔ یا یہ کہ مرد میں اس کی زیادہ صلاحیت

ہے اور عورت میں کم۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش

اعمال یکساں طور پر نتیجہ خیز ہوں گے۔ وَ مَنْ يَفْعَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (۱۲۴/۳)۔ اور تم میں سے جو کوئی بھی اعمال صالحہ کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مؤمن ہو، تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور اس کے اعمال میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

جہاں تک میاں بیوی کی زندگی کا تعلق ہے، قانونی نقطہ نگاہ سے قرآن نے اعلان کر دیا کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْہِمْ بِالْمَعْمُوْرِ ۚ قَاعِدَے اور قانون کی رو سے، عورتوں کی جتنی ذمہ داریاں ہیں اتنے ہی ان کے حقوق ہیں۔ البتہ ایک **حقوق اور ذمہ داریوں میں برابری** بات میں مرد کا درجہ فائق ہے اور وہ یہ کہ طلاق یا بیوگی

کی صورت میں، عورت، عدت کی مدت میں دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی، مرد ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت ظاہر ہے کہ اگر عورت کے بطن میں بچہ ہے تو اس کی ولایت کے تعین میں کوئی التباس نہ ہو اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جو احباب اس کی تفصیل سے دل چسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب ”طاہرہ کے نام خطوط“ یا ”اسلام کیا ہے“ میں عورت سے متعلق باب ملاحظہ فرمائیں۔ جہاں تک ہمارے ہاں کے اس مروجہ خیال کا تعلق ہے کہ مرد، عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں اور مردوں کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی کو مار پیٹ بھی لیں اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر آئے گا، اس مقام پر ہم صرف ایک نکتہ سامنے لانا چاہتے ہیں۔ کہ قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد **ازدواجی زندگی کا مقصد** زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے۔ لَتَسْكُنُوْا اِلَیْہَا۔ وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ

مُؤَدَّةً ۚ وَ نَاحِیَةً۔ تاکہ تم میں سکون و رحمت اور محبت پیدا ہو۔ اس کے بعد ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۰/۲۱)۔ جو لوگ غور و فکر سے کام لیں گے انہیں اس میں حقیقت تک پہنچنے کے لئے نشانیاں ملیں گی۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد بھی یہ حقیقت سامنے آ سکتی ہے کہ اگر میاں بیوی کے متعلق یہ عقیدہ اور تصور ہو کہ خاوند بیوی پر حاکم ہے، داروغہ ہے۔ عورت کو ہر حال میں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنی چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو خداوند اسے مار پیٹ بھی سکتا ہے تو کیا، اس قسم کے تعلق اور سلوک سے باہمی محبت کا رشتہ استوار ہو سکتا ہے اور گھر میں سکینت اور رحمت کی فضا پیدا ہو سکتی ہے! اس سے مستبد حاکم اور بے کس حکوم کا تعلق تو

پیدا ہو سکتا ہے، رفاقت اور محبت کا تعلق کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس سے، ایک طرف، ہر وقت، رعونت اور بالادستی اور دوسری طرف، احساسِ کمتری اور خوفِ دہرا اس کے جذبات تو ابھر سکتے ہیں، ہمنوائی اور ہم آہنگی۔ رفاقت اور یگانگت کے جذبات کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ لہذا، قرآن کی رو سے یہ تصویبات ہیں کہ مرد کو عورت پر کوئی ذوقیت حاصل ہے، عورت، مرد کے مقابلہ میں فردِ تر واقع ہوئی ہے اور میاں بیوی کے تعلقات حاکم اور محکوم کے ہیں۔ مرد اور عورت دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں اور انسانی صلاحیتوں کے یکساں حامل۔ میاں بیوی کی حیثیت سے ان کے حقوق اور ذمہ داریاں ایک جیسی ہیں اور ان کے تعلقات، محبت اور رفاقت کے ہیں جن کے لئے مساوات بنیادی شرط ہے۔ جسے اپنے سے فردِ تر سمجھا جائے اور جو اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں ذلیل خیال کرے، ان میں کبھی رفاقت کے تعلقات وابستہ نہیں ہو سکتے۔

چھپا ہوا یہ تھی اس باب میں قرآنِ کریم کی تعلیم۔ لیکن اس کے بعد جب مسلمانوں نے خدا کی اس کتابِ عظیم کو بالائے طاق رکھ دیا تو عورت کے متعلق جو عقائد و تصورات دیگر اہل مذاہب کے ہاں رائج تھے، وہ ایک ایک کر کے ان کے ہاں در آئے اور رفتہ رفتہ جزوِ اسلام بن گئے۔ اس کے لئے ٹیکنیک ایسی اختیار کی گئی جس کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے یعنی جھوٹی روایات وضع کی گئیں اور انہیں منسوب کر دیا گیا اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جو دنیا میں حقوقِ انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار اور مساواتِ انسانیت کے عظیم واعی تھے۔ سب سے پہلے، تورات (عہدِ نامہِ عتیق) سے یہ عقیدہ مستعار لیا گیا کہ خدا نے پہلے آدم (یعنی مرد) کو پیدا کیا لیکن جب وہ اداس ہوا تو اس کی تنہائی رفع کرنے کے لئے، اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وضع روایات صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند

پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے بالکل سیدھا کرنا چاہے گا تو اسے توڑ دے گا۔ اور اگر اس میں کچھ بچی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو فائدہ اٹھا سکتا

صحیح بخاری میں، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ
رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا۔ اور اگر حواء ہوتی تو کوئی عورت
اپنے خاوند سے خیانت نہ کرتی۔
بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے بعد، مردوں پر کوئی فتنہ نہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت
نہیں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ نوحسٹ میں چیزوں میں ہے — عورت، گھر اور گھوڑا۔
(بخاری، کتاب النکاح)۔ بخاری، کتاب الانبیاء میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت کو دیکھا تو وہاں
اکثریتِ فقیروں کی پانی اور دوزخ کو دیکھا تو اکثریتِ عورتوں کی نظر آئی۔

اس قسم کی متعدد روایات، کتبِ احادیث میں داخل کر دی گئیں۔ جہاں تک میاں بیوی کا تعلق ہے،
اس سلسلہ میں بھی اس قسم کی روایات کی کمی نہیں جن میں مرد کو حاکم اور داروغہ قرار دیا گیا ہے۔
پہلے اس قسم کی روایات وضع کی گئیں اور پھر ان کی رو سے قرآنی آیات کی تفسیر مرتب کی گئی۔
اسی سلسلہ میں، بڑے شہرہ مند سے سورۃ النساء کی اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے جس میں کہا
گیا ہے کہ الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (۴/۳۴)۔ اور جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے

— مرد، عورتوں پر داروغہ ہیں۔ (حالانکہ اس کے معنی یہ ہیں
کہ چونکہ عورتوں کا زیادہ وقت اولاد کی پیدائش اور تربیت و
پرورش میں صرف ہو جاتا ہے اور مردان موانع سے فارغ
ہوتا ہے، اس لئے، تقسیمِ کار کے پیش نظر اصول یہ مقدر

الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ
کی تفسیر

کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو سامانِ زندگی ہم پہنچانا، مردوں کے ذمے ہے۔ عربی زبان کی رو سے قَوَّامُونَ
عَلَى النِّسَاءِ کے یہی معنی ہوتے ہیں)۔ اس کے معنی ”حاکم اور داروغہ“ کرنے کے لئے اس کی
شانِ نزول میں کہا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرمؐ سے شکایت کی کہ اس کے خاوند نے اسے پھینٹ

مارا ہے۔ آپ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہو گئی اور حضورؐ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارنا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپ کے حکم کو سن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر آپ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑا مار پیٹ شروع ہو گئی اور بہت سی عورتیں شکایت لے کر آپ کے پاس آئیں۔ اس پر آپ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔ لیکن جب آپ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ لہذا یہی حکم رہا کہ چونکہ مرد، عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے وہ انہیں مار پیٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا ہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعثؓ تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہؐ سے سنا کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے بیوی کو کس بنا پر مارا۔ دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا۔ اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے بلکہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوا اللہ کے کسی کو سجدہ کرے، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

حضرت علیؓ کی طرف منسوب کردہ اقوال | پنج ابلاغہ میں اس قسم کے اقوال حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہیں کہ آپ نے فرمایا:

لوگو! عورتوں کا عقیدہ، ان کا حصہ اور ان کی عقلیں ناقص ہوتی ہیں۔ (لہذا) تم بدکردار عورتوں سے بچو اور نیکوں سے بھی محتاط رہو۔ اور نیک کاموں میں بھی ان کا حکم نہ مانو تاکہ وہ بُرے کاموں میں تمہاری اطاعت کی توقع نہ رکھیں۔

دوسری جگہ ہے کہ آپ نے کہا۔

عورت خوش معاشرت بکھوبہ ہے۔ ساتھ رہو تو خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن ڈنک مارنے سے نہیں چوکتی۔

ایک اور مقام پر ہے کہ آپ نے فرمایا:

عورت سراپا شر ہے اور اس سے بھی زیادہ شر یہ ہے کہ اس کے بغیر جا رہے بھی نہیں۔ لیکن ایک طرف اس قسم کی وضعی روایات ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ بہشت ماں کے قدموں کے نیچے ہے: گویا ماں کا شمار عورتوں میں نہیں ہوتا! اس قسم کی روایات ہمارے دور ملکیت میں وضع ہوئیں۔ جب کیفیت یہ تھی کہ عورتیں بازاروں میں بکا کرتی تھیں۔ احمد امین مصری، صحنی الاسلام میں لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں۔

بغداد میں غلام اور لونڈیوں کی تجارت عام تھی۔ ایک بازار کا نام ہی شائع دار الرقیق (غلاموں کا بازار) تھا۔ اس تجارت کرنے والوں کو نخاس کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ دراصل موشیوں کی تجارت کرنے والوں کے لئے تھا۔ بعد میں غلام اور لونڈیوں کے تاجروں کے لئے بولا جانے لگا۔ حکومت کی طرف سے ان پر انسپکٹر مقرر ہوتا تھا جسے قیم الرقیق کہتے تھے۔ خلیفہ متوکل کے حرم میں چار ہزار لونڈیاں مستویہ تھیں۔

اس قسم کے عقائد اور مسلک سے عورت کی کس قسم کی تصویر سامنے آتی ہے اس کی جھلک ہمیں اپنے لٹریچر سے ملتی ہے۔ مثلاً نظامی گنجوی لکھتا ہے کہ

اگر نیک بودے سراحوال زن زناں را مزن نام بودے، نزن
چہ خوش گفت جمشید بارائے زن کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن
مشو امین از زن کہ زن پاراست کہ خربتہ بہ گرچہ دزد آشناست

اور جب بات وارث شاہ تک پہنچے تو پھر پوچھتے ہیں کہ اس بیچاری کی کیا اور گت بنتی ہے! مسلمانوں میں تصوف کا فلسفہ ایران سے آیا تھا لیکن انہوں نے مسلک خاںقاہیت، عیسائیوں سے لیکھا تھا۔ عیسائیوں کے ہاں عورت کی جو پوزیشن تھی اس کا تھوڑا سا عکس ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے صوفیا بھی (عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کی طرح) تجرؤ کی زندگی پسند کرتے اور عورت کو تمام برائیوں کا چشمہ قرار دیتے تھے۔ حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) لکھتے ہیں کہ

لے ہماری تاریخ اور جملہ کتب احادیث و عہد عباسیہ میں مرتب ہوئی تھیں اور نہ ہجرت البلاغۃ ان سے بھی بعد میں مدون ہوئی تھی۔

بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقرر ہوا اس کی اصل عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ یعنی ہابیل قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دوسرا فتنہ (ہاروت و ماروت) کو سرا دے تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا۔ اور آج 'دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔

ان نصیحتات کی روشنی میں آپ غور فرمائیے کہ جس قوم میں اس "جنس کا سر" کے متعلق یہ خیالات عام ہوں، اس کی آمد پر گھروں میں صفِ ماتم نہیں بچھے گی تو کیا مستر کے شاد بانے بجائے جائیں گے؟ اور وہ اگر احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو منحوس، بد قسمت اور بد نصیب تصور نہیں کرے گی تو اور کیا ہوگا! کہا جائے گا کہ اب ہم تعلیم یافتہ اور مہذب ہو گئے ہیں۔ اس لئے عورت کے متعلق اس قسم کے خیالات باقی نہیں رہے۔ تہذیب و تعلیم کا یہ ادعا بجا اور درست لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ یہ جو ہمارے ہنایت مہذب اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں 'ہنایت خوبصورت، تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار،

ہمارے مہذب معاشرہ کی حالت

منتخب کردہ، لڑکی کو اپنے ہاں بیوی یا بہو بنا کر لانے کے عوض، کوٹھی، موٹر کار، ہزار ہاروپہ کے جہیز کا مطالبہ ہوتا ہے، یہ (عورت کے متعلق) کس قسم کے "حسن خیال" کا غماز ہے؟ اس سے تو ہم 'اُمس دورِ جہالت سے بھی پست سطح پر گر گئے ہیں۔ اُس زمانے میں عورت کو خرید کر لایا جاتا تھا تو اس کی کچھ قیمت ادا کی جاتی تھی۔ اب ہم عورت کو لاتے ہیں تو اس کے ساتھ لاکھوں روپے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ پھر ہمارے مروجہ قوانین کے تحت (جنہیں بد قسمتی سے قوانینِ شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے) عورت کی جو حالت ہوتی ہے، اس کی مثالیں ہر دو قدم پر ملیں گی۔ ان قوانین کی رو سے، مرد کو اس کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے کہ جب جی چاہے، عورت کو طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کرے۔ اس کے برعکس، عورت پر ہزار مظالم ہوں، اُسے جا برد مظالم خاوند کے استبداد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں اور وہاں، ان بے چاری شریف زادیوں کا جو حشر ہوتا ہے اس کے احساس سے یہ مظلوم، انصاف حاصل کرنے کے مقابلہ میں، گھروں میں دم گھٹ کر مرجانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر یہ کسی طرح، ہزار ذلتوں کے بعد، چھٹکارا حاصل بھی کر لیتی ہیں تو ان کے لئے بقایا زندگی گزارنے کا سوال اور بھی وجہ سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔ اس میں معاشی مسئلہ ہی وجہ پریشانی نہیں ہوتا، حفاظت اور عزت کا سوال بھی ہزار خوف پیدا کرنے کا موجب

ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں، عورت کی حفاظت کے لئے مرد کی چھت لاینفک سمجھی جاتی ہے۔ اگر عورت کسی طرح اپنی طبعی حفاظت کا انتظام کر بھی لے تو بھی اسے اس بات کا احساس ہر وقت چھلاوے کی طرح ڈراتا رہتا ہے کہ اگر کسی بد معاشرے نے کسی وقت بھی ایک بات اس کے خلاف مشہور کر دی تو وہ معاشرہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ اور بد معاشرے کی زبان کا روکنا کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو پھر بھی دور کی داستان ہے۔ آج کل ہمارے ہاں یہ عام ہو رہا ہے کہ ایک معصوم، بھولی بھالی بچی اسکول یا کالج جا رہی ہے اور راستے میں اسے غنڈے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس مظلوم و معصوم کو ماں باپ، بہ ہزار دشواری واپس لے بھی آتے ہیں تو وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ اس کی بقایا ساری زندگی جہنم میں گزرتی ہے۔ اور یہ کس جرم کی پاداش میں؟ خدا نے، جہلائے عرب سے، جو اپنی معصوم بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، کہا تھا کہ بتاؤ! جب اس بچی سے پوچھا جائے گا کہ

بَايَا ذَنْبٍ قُتِلْتُ ۝ (۸۱/۹)

تہیں کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔

تو تم اس کا جواب کیا دو گے۔ لیکن ہمارے معاشرہ کی معصوم و مظلوم بچیاں خود خدا سے پوچھتی ہیں۔ اور یہ کوئی فرضی افسانہ نہیں، اس قسم کی بچیاں خود مجھ سے یہ سوال کیا کرتی ہیں۔ کہ ہم نے کیا جرم کیا تھا جو تو نے ہمیں لڑکی بنا کر پیدا کر دیا۔ اور ہمارے بھائی نے کونسا تیر مارا تھا جو اسے لڑکا بنا دیا، تو اس کا جواب انہیں کہیں سے نہیں ملتا۔ برہمن نے تو پھر بھی اس کا جواب تراش لیا تھا کہ یہ تمہارے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ہے جسے بھگتنے کے لئے برہمن نے تمہیں عورت بنا دیا، آپ اس کی اس منطق کی نامعقولیت پر ہنس دینگے لیکن سوچئے کہ اس سوال کا جو جواب آپ کے ہاں سے ملتا ہے اس کا منطقی نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ آپ کے ہاں سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ خدا کی مرضی ہے۔ وہ جسے چاہے لڑکا بناوے، جسے چاہے لڑکی۔ جسے چاہے عزت دیدے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ تم اس سے پوچھ نہیں سکتیں کہ اس نے ایسا کیوں کر دیا ہے۔ سوچئے کہ آپ کی یہ ”منطق“ انسان کو کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ برہمن کی منطق غلط تھی، لیکن اس سے برہمن کے سر پر کوئی الزام نہیں آتا۔ اس کا تصور ایک عادل کا ہوتا ہے جو انسانوں کے اعمال کے مطابق نئے جنم میں ان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ لیکن آپ کے جواب سے خدا کا جس قسم کا تصور سامنے آتا ہے اسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

یہ جواب ہمارے ہاں کے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے دیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں آیتیں اور حدیثیں پیش کر دی جاتی ہیں۔ پھر ان کی تائید مزید کے لئے (بزعم خویش) دلائل بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ اس قسم کے کہ نر اور مادہ کا پیدا کرنا، خدا کے تخلیقی پروگرام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ گائے کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ اسے گائے کیوں بنایا گیا، بیل کیوں نہیں بنایا گیا۔ نیز، بعض مخلوق کا افضل ہونا اور بعض کا فروتر، یہ بھی فطرت کا پروگرام ہے۔ گدھے کو اس کا حق نہیں کہ وہ شکایت کرے کہ اسے اس پنازی کیوں نہیں بنایا گیا۔

نظامِ فطرت کی غلط مثال

فطرت کے یہ پروگرام بجا اور درست، لیکن اس قسم کے دلائل دینے والے اتنا نہیں سوچتے (اگر ان میں سوچنے کی صلاحیت ہو تو وہ ایسے پوچھ دلائل دیں ہی کیوں!) کہ وہ مثالیں حیوانوں کی دے رہے ہیں اور یہاں بات انسانوں کے متعلق ہو رہی ہے۔ حیوانات میں عورت اور ذلت کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ ان میں، کہتری اور مہتری کا احساس نہیں۔ نہ بیل کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ میں گائے سے افضل ہوں، نہ گائے کو اس کا شعور کہ میں بیل سے فروتر ہوں۔ گدھے کی حماقت ضرب المثل ہے۔ لیکن کسی گدھے کو اس کا شعور احساس نہیں ہوتا کہ وہ ”گدھا“ ہے۔ ان کے برعکس، انسان صاحب شعور بھی ہے اور ذی احساس بھی۔ اور جب ہم ”انسان“ کہتے ہیں تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ جب خدا نے کہا تھا کہ ہم نے نوع انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (۱۶/۷۰) تو اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس نے مردوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے، عورتوں کو نہیں، یا اس تکریم میں کسی قسم کی تفریق کی گئی ہے۔ یاد رکھئے کسی ذی شعور و ذی احساس (یعنی انسان) کے لئے کسی ایسی بات کو وجہ تزیل و تحقیر بنانا جس کے لئے وہ فہم دار نہ ہو، نہ ہی جسے بدلنے کا اسے اختیار ہو اور نہ ہی اس کے ازالہ کی کوئی صورت، اُس خدا کے شایانِ شان نہیں جس کا اعلان ہے کہ وَمَا آتَا بِظِلْمٍ ۖ لِّلْعَبِيدِ (۵۰/۲۹)۔ ہم بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔ پیدائش کے اعتبار سے، انسان اور انسان میں کسی قسم کی تفریق، خدائے رؤف الرحیم کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ تفریقات و تخصیصات ہماری پیدا کردہ ہیں اور ہم اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے نہ اس سے ڈرتے ہیں نہ شرماتے۔ اگر ہمارے معتقدات و تصورات، قرآن کریم کے مطابق ہوں اور ہم سارا معاشرہ قرآنی اقدار پر متشکل، تو پھر نہ لڑکی کی پیدائش پر گھروں میں صفا ماتم بچھے گی اور نہ ہی عورت کو اپنی ”قسمت“ پر رونا پڑے گا۔ فطری وظائفِ حیات کے لئے، مرد اور عورت میں حیاتیاتی (BIOLOGICAL)

فرق ضرور ہے لیکن اس تفریق سے، مرد اور عورت کے مقام انسانیت پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ اس کے لئے اصول یہی ہے کہ **وَبِكُلِّ دَنٍ جِتٍ مِّمَّا عَمِلُوا** (۱۹/۳۶)۔ ہر ایک کا مقام اس کے اعمال (سیرت و کردار) کے مطابق متعین ہوگا۔ **ذَكَرَ أَوْ اُنْثٰی** (۱۹/۳)۔ وہ عورت ہو یا مرد۔ فطری فرائض کی سرانجام دہی کے لئے مرد اور عورت میں جو تفریق ہے اس میں بھی یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی رُو سے مرد، عورتوں سے فائق ہیں۔ اس میں کہا گیا کہ **وَلَا تَحْتَمِزُوا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَيْنَ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ** (۳۲/۳۵)۔ بعض امور میں مرد عورتوں سے افضل ہیں، بعض میں عورتیں مردوں سے افضل، لہذا ان میں سے کسی نوع کو بھی، یہ سمجھ کر کہ دوسری نوع بہرِ حیثِ افضل ہے، یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اے کاش! مجھے وہ خصوصیت کیوں نہ مل گئی، یا میں ایسا کیوں نہ بن گئی۔ مگر جکل چونکہ عورت مظلوم ہے اس لئے وہ سرد آہ بھر کر کہتی ہے کہ اے کاش! میں مرد ہوتی۔ جب اور جن اقوام میں (MATRIARCHY) عورتوں کی بالادستی تھی، اس وقت مرد کہتا ہوگا کہ اے کاش! میں عورت ہوتا۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت کی مساوات سے، ان دونوں خلش اور احساسات کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی رُو سے، ”وجہ امتیاز و اعزاز“ سیرت و کردار کے جوہر قرار پا گئے نہ کہ جنسی تفریق۔ معلوم نہیں کہ خود فریبیوں میں ڈوبا ہوا انسان، قرآن کی اس سطح پر کب آئے گا!

لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش

جہاں تک لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش کا تعلق ہے قرآن کریم میں ہے کہ **يَمْنُ يَشَاءُ اِنَاثًا وَيَمْنُ يَمْنُ يَشَاءُ الذَّكَوْرَ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرًا اَوْ اُنَاثًا جَ وَ يَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ** (۵۰/۴۲)۔ مَن يَشَاءُ کا ترجمہ جسے چاہتا ہے اور قَدِيْرٌ کا ترجمہ ”ہر بات پر قادر ہے“ کی رُو سے اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اللہ جسے چاہے لڑکیاں دے، جسے چاہے لڑکے یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں اور جسے چاہے بے اولاد رکھے۔ وہ ہر بات کا علم رکھنے والا اور ہر شے پر قادر ہے۔ اگر لڑکے اور لڑکی میں (محض لڑکا اور لڑکی ہونے کی وجہ سے) کسی قسم کا فرق مراتب یا (DISADVANTAGE) نہ سمجھا جائے تو پھر ”جسے چاہے“ میں کچھ مضائقہ

نہیں ہو سکتا لیکن اگر ان دونوں میں وہ فرق رکھا جائے جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے تو پھر ”جسے چاہے“ پر وہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے جسے ”مظلوم بچپنوں کے سوال کی شکل میں سامنے لایا جا چکا“ ہے۔ قرآن کریم کی رو سے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) مرد اور عورت میں، انسان ہونے کی جہت سے کوئی فرقِ مراتب نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ”مَنْ يَشَاءُ“ سے مراد یہ ہے کہ اولاد کا مسئلہ خدا کے قانونِ مشیت کی رد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک عقیقہ (بانجھ) ہونے کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے، حضرت زکریا کے قصہ میں خود بتا دیا ہے کہ ان کی بیوی عقیقہ تھی اور اس لئے وہ اولاد کی طرف سے مایوس تھے لیکن اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ ”وَاصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ“ (۲۱/۹۰)۔ اس کی بیوی کا وہ نقص دور ہو گیا اور ان کے ہاں لڑکا (حضرت یحییٰ) پیدا ہو گیا۔ اور اب تو مرد و عورت دونوں کے، بانجھ پن کا علاج عام طور پر ہو جاتا ہے، اس لئے کہ انسان نے اس سلسلہ میں خدا کے قانونِ مشیت (اقانونِ فطرت) کو سمجھ لیا ہے اور اس باب میں مزید تحقیقات ہو رہی ہیں۔

جہاں تک لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا تعلق ہے، اس ضمن میں بھی یورپ میں بڑی ریسرچ ہو رہی ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ ”هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ“ (۳/۵)۔ رحمِ مادر میں جنین کو (FORM) خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق عطا ہوتی ہے۔ اس ریسرچ کی رو سے یہاں تک تو معلوم کر لیا گیا ہے کہ خدا کا وہ قانونِ مشیت کیا ہے، جس کے مطابق ”رحمِ مادر میں جنین کے (نریا ماوہ ہونے کی) تشکیں ہوتی ہے۔ اب وہ اس تحقیق میں مصروف ہیں کہ خدا کے اس قانون کے مطابق ان عناصر میں کس طرح تبدیلی پیدا کی جائے جن کی رو سے جنین کی جنسی ترکیب طے پاتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ریسرچ مکمل ہو جائے تو لڑکا یا لڑکی اپنی مرضی کے مطابق پیدا کر لیا جاسکے گا۔ خدا نے جب کہا تھا کہ ”وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ (۲/۳۱)۔ خدا نے انسان میں تمام اشیائے فطرت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی، تو اس سے مراد یہ تھی کہ انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ عالمِ خلق میں خدا کے جس قدر قوانین کا فرما ہیں (جنہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے) وہ ان سب کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اور جب ان کا علم حاصل کر سکتا ہے تو انہی قوانین کے مطابق وہ تخلیقی ترکیباً میں تبدیلیاں کر کے انہیں، حسبِ منشاء نئی نئی شکلیں بھی دے سکتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں انسان جس قدر تنوعات پیدا کر رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ ”خدا کے قانون

مشیت کا علم حاصل کر کے، لڑکائی لڑکی اپنی مرضی کے مطابق پیدا کیا جاسکے گا، تو یہ اُسی خصوصیت کے مظاہرہ کی ایک کڑی ہوگی جس کی رو سے، آدم کو مسجود ملائکہ قرار دیا گیا تھا (۲/۳۴)۔ خدا کا تخلیقی قانون غیر متبدل ہے۔
 لَا تَبْدِلُ نِلَ الْخَلْقِ اللّٰہُ (۳۰/۳۰)۔ اور اس قسم کی تبدیلیاں اسی قانون کا علم حاصل کرنے سے ممکن ہیں۔
 اس طرح انسان رفتہ رفتہ، ”خود تقدیر یزداں“ بنتا جا رہا ہے۔ لیکن یہ صرف مقام آدم ہے جب آدم، اپنے آپ کو ان قوانین کے تابع بھی لے آئے گا جو وحی کی رو سے (قرآن میں) عطا ہوئے ہیں، تو وہ مقام مومن تک پہنچ جائے گا۔ اور مقام مومن کی بلندیوں کی تو کوئی انتہا نہیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مددِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(اقبالؔ)



لے اقبال کے الفاظ ہیں۔

عجیب ہے شکوۂ تقدیر یزداں

تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

ستر صواہل باب

عَا

اب ہم اپنے سفر تحقیق کی اُس وادی میں اتر رہے ہیں جہاں (بقول کسے) فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ ہمارے موضوع کے اس گوشے کا تعلق قلبِ انسانی کے نازک ترین گوشے سے ہے۔ دُعا کا رشتہ خالصتہً انسانی جذبات سے ہے اور قرآنِ کریم کی تلقین و تاکید یہ ہے کہ تم، تمام مسائلِ حیات کے متعلق فکر و تدبیر سے کام لو اور ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کرو۔ فکر و جذبات کا وہی وہ تصادم ہے جس کے پیشِ نظر ہم نے کہا ہے کہ اب ہم اس وادی میں اتر رہے ہیں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ جب تاریخ کے اسٹیج پر آئیں انسان ہمارے سامنے آتے ہیں، تو ہم انہیں کسی مافوق الفطرت، ان دیکھی قوت (یا قوتوں) سے دعائیں مانگتے پاتے ہیں۔ اور یہ منظر تاریخِ انسانیّت کے ہر دور، ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم میں مسلسل اور متواتر ہمارے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں

جذبہ دُعا کی عالمگیریت ہزار اختلاف، مو، ان کے طرزِ بود و ماند اور اندازِ معاش و معاشرے میں، لاکھ تفاوت ہو، ان کی تہذیب ایک دوسرے سے مختلف اور ان کا تمدن الگ الگ ہو، وہ مختلف زبانیں بولیں، ان کی نسلیں بھی الگ الگ ہوں، مختصر الفاظ میں، ان میں کوئی شے بھی مشترک نہ ہو اس کے باوجود ان میں ایک چیز بطورِ قدرِ مشترک ضرور پائی جائے گی۔ اور وہ ہوگی، کسی مافوق الفطرت قوت سے دعائیں مانگنا۔ اس قوت کے متعلق ان کے تصورات الگ الگ ہوں گے۔ اس سے دعائیں

اے ہمارا مقصد وحی کی رُو سے عطا کردہ خدا کا تصور نہیں۔ اس میں زمان و مکاں کے بُعد و اختلاف سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا مطلب ذہنِ انسانی کا تراشیدہ تصور ہے۔

مانگنے کی رسوم اور آداب مختلف ہوں گے۔ ان کی طلب اور تقاضے بھی متنوع ہوں گے۔ لیکن ان تمام محسوس پیکروں کے پیچھے جذبہ محرکہ ایک ہی ہوگا۔ یعنی اپنی مدد کے لئے کسی ان دیہی قوت سے التجا کرنا، اس سے کچھ مانگنا۔ اسی کو دُعا کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسے پرستش کہا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت دُعا، یا دُعا کی تمہید ہوتی ہے۔ پرستش کے ہر پروگرام کا اختتام دُعا پر ہوتا ہے۔ اُس ان دیہی قوت کے حضور جو نذر نیاز پیش کی جاتی یا منت مانی جاتی ہے، وہ بھی دُعا کی قبولیت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ ”اگر میری فلاں مراد پوری ہو جائے تو میں یہ کروں“ کے الفاظ ہر دور میں سنائی دیتے ہیں۔ دُعا، ہر بے سہارا کا سہارا، ہر بے آسرا کا آسرا، ہر لاپار کا آخری چارہ، ہر ضعیف و ناتوان کا سامانِ تقویت، ہر بے نوا کے لئے نوا، حیات، ہر مایوس کے لئے شمعِ امید، ہر قلبِ مضطرب کے لئے سامانِ تسکین، ہر جگرِ سوزاں کے لئے مرہمِ تشفی، ہر چشمِ گریباں کے لئے پنبہٴ تسلی اور ہر راندہ و در ماندہ کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔ جب فکر و تدبیر کی دنیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو دُعا کی دنیا کا آغاز ہوتا ہے اور سب سے زیادہ پُر خلوص اور پُر سوز وہ دُعا ہوتی ہے جس میں فکر و تدبیر کی ذرا سی بھی آلاش نہ ہو۔ دُعا میں جتنی زیادہ محویت ہوگی اتنی ہی اس کی قبولیت کی توقع زیادہ ہوگی۔ اور محویت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس میں اس قدر جذب ہو جائے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہے۔

آپ سوچئے کہ جس جذبہ کی کیفیت یہ ہو اس کے متعلق فکر و تدبیر سے غور کرنا اور اسے علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنا، دیوانگی نہیں کہلائے گا تو اور کیا ہوگا؟ لیکن قرآن کے طالب علم کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس قدر نازک مقامات میں بھی فکر و بصیرت کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ جو قرآن، آخرت جیسی ماوراء الطبیعیاتی حقیقت پر بھی غور و فکر کی تاکید کرتا ہے (۲۱۹۔ ۲۲۰/۲)۔ وہ کسی موضوع کی نزاکت کی بنا پر اسے گردابِ جذبات کے حوالے کرنے کی اجازت کب دے سکتا ہے۔ وہ اسے بھی علم و بصیرت کی رُو سے سمجھاتا، اور فکر و شعور کی رُو سے سمجھنے کی تاکید کرتا ہے، بالخصوص اس لئے کہ اس (دُعا) کا تقدیر کے مسئلہ سے بڑا گہرا تعلق ہے اور عمل کی دنیا سے بڑا بنیادی رشتہ۔ ہم اس موضوع پر اسی انداز سے غور کریں گے اور اپنے قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ بھی اسے اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کریں اور اس میں اپنے جذبات کو (جنہیں ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات پر ٹھیس بھی لگے) عنان گیر نہ ہونے دیں۔ راستہ دشوار گزار اور پُر خار ہے۔ ایسا دشوار گزار اور پُر خار کہ

یہاں حکیم الامت جیسے دیدہ ور کو بھی کہنا پڑا کہ

مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال

مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

لیکن ہمیں اُمید ہے کہ اگر ہم نے اس منزل میں قرآن جیسے خضر راہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو ہم چشمہ حیاں تک آسانی پہنچ جائیں گے کہ وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِیْنَا لَنَهْدِیْہُمْ یَسَارًا سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ اس کا ارشاد ہے۔

دُعا کا عام مفہوم ہمارے ہاں دُعا کا عام مفہوم، خدا سے کچھ مانگنا لیا جاتا ہے۔ اس میں مانگنے کا تصور ایسا غالب اور عمیق ہوتا ہے کہ ہم ”دُعا مانگنے“ کے الفاظ بھی عام طور پر بولتے ہیں، حالانکہ اگر خود دعا سے مفہوم ”مانگنا“ لیا جائے تو ”دُعا مانگنا“ کی ترکیب بے معنی اور بے ربط ہو جائے گی۔ عربی زبان میں دُعا کے معنی مانگنا نہیں، بلکہ کسی کو آواز دینا، بلانا، پکارنا ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر کسی کو مدد کے لئے پکارا جاتا ہے، اس لئے اس کے معنی مدد مانگنے کے لئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی لفظ ان لوگوں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ کے لائے ہوئے دینِ خالص کے نہیں، بلکہ اس کی محرف شکل، مذہب، کے پیرو ہوتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بھی جو دینِ خالص (قرآن) کے متبع ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک لفظ کو اول الذکر کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے وہی مفہوم لیتا ہے جو ان کے ہاں مروج ہوتا ہے اور جب اسی لفظ کو ثانی الذکر کے ضمن میں استعمال کرتا ہے تو اس سے صحیح قرآنی مفہوم لیتا ہے۔ مثلاً وہ اللہ کا لفظ دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن مذہب پرستوں کے ہاں اس کا تصور کچھ اور ہوتا ہے اور دین کی رو سے کچھ اور۔ یا جب وہ عبادت کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو مذہب پرستوں کے ہاں اس سے مفہوم پرستش، پوجا پاٹ (WORSHIP) ہوتا ہے، لیکن دین کی رو سے اس کے معنی احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصور نہیں بلکہ اطاعت اور محکومیت کا تصور ہوتا ہے اور اللہ سے مفہوم وہ بلند و بالا صاحب اقتدار ہستی، جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے۔ اسی

طرح جب وہ دَعَا۔ يَدْعُو وغیرہ کے الفاظ مذہب پرستوں کے لئے لاتا ہے تو اس سے ان کا وہ تصور مقصود ہوتا ہے جس کی رو سے وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو مدد کے لئے پکارتے ہیں لیکن جب یہی لفظ خدا کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے مقصود محض "پکارنا" نہیں ہوتا، خدا کی اطاعت کرنا بھی ہوتا ہے۔ دعا کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے اس بنیادی فرق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے پہلے ہم قرآن کے وہ مقامات سامنے لاتے ہیں جن میں یہ لفظ، اطاعت کے معنوں میں آیا ہے۔

سورۃ المؤمن میں ہے۔ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (وہ خدا) زندہ ہے اور زندگی بخش۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس لئے

دُعَا کے معنی اطاعت کرنا ہوئے اسے "پکارو" دہم اس کا ترجمہ "پکارو" ہی کریں گے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن کی رو سے خدا کے پکارنے سے مراد اس کی اطاعت کرنا ہے۔ اس کے بعد ہے قُلْ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (اے رسول!) ان سے کہہ دو کہ مجھے اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبودیت (محکومیت) اطاعت اختیار کروں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر "پکارتے ہو" یہاں دیکھئے۔ دَعَا (پکارنا) اور عبادت (اطاعت کرنا) کے الفاظ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور آخر میں ہے وَ أَهْبِطْتُ أَنْ أُسَلِّمَ لِلْهَابِ الْغَالِبِينَ ۝ (۶۵-۶۶)۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف خدائے رب العالمین کے احکام کے سامنے تسلیم خم کروں۔ "اسلم" نے دَعَا اور عبادت کے الفاظ کا مفہوم بالکل واضح کر دیا، یعنی احکام خداوندی کے سامنے جھک جانا۔

سورۃ مریم میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں کہا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا وَ اعْتَزِلْكُمْ وَ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ۔ میں تم سے بھی قطع تعلق کرتا ہوں اور ان سے بھی جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر "پکارتے ہو" وَ اَدْعُوا رَبِّي۔ میں اپنے رب کو "پکارتا ہوں" اس کے بعد ہے فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (۴۸-۴۹)۔ چنانچہ جب اس نے ان سے اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے، ان سے قطع تعلق کر لیا، یہاں بھی دیکھئے تَدْعُونَ اور يَعْبُدُونَ کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

سورہ مؤمن میں ہے وَ قَالَ رَبُّكُمْ اِذْ عُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ تمہارا رب تم سے کہتا ہے کہ تم مجھے "پکارو" میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ "پکار کا جواب دوں گا" اس کا قرآنی مفہوم آگے چل کر سامنے آئے گا اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۝۵ (۲۰/۶۰)۔ جو لوگ میری عبادت (اطاعت) محکومیت سے سرکشی اختیار کرتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر داخل جہنم ہوں گے۔ یہاں بھی دیکھئے۔ دعا اور عبادت کے الفاظ ہم معنی آئے ہیں۔

سورہ طور میں ہے کہ اہل جنت سے پوچھنے والے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جنت کے مستحق قرار پا گئے، وہ جواب میں کہیں گے کہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ (۵۲/۲۸) ہم اس سے پہلے (دنیاوی زندگی میں) خدا کو "پکارا کرتے تھے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد احکام خداوندی کی اطاعت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ محض خدا کو پکارنے سے تو کوئی بھی جنت کا مستحق اور وارث قرار نہیں پاسکتا۔ ایک مقام پر رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّيْ وَ لَا اُشْرِكُ بِهٖ اَحَدًا (۲۰/۴۲)۔ ان سے کہو کہ میں صرف اپنے رب کو "پکارتا ہوں" اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں بھی "پکارنے" سے مراد خدا کی عبودیت اختیار کرنا اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرنا ہے۔ (شُرک کے معنی ہی غیر خداوندی اقتدار کی اطاعت ہے)۔

یہی حضرات انبیاء کرامؑ کی عام دعوت تھی کہ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۱/۲۶ ذ ۲۸/۸۸)۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو نہ "پکارو" (نیز ۱۸/۴۲)۔

سورہ انعام میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اے رسول! ان لوگوں سے کہدو کہ جب مجھے خدا کی طرف سے اس قسم کی روشن ہدایت (راہ نمائی) مل چکی ہے تو اس کے بعد میں بھلا غیر اللہ کو کس طرح "پکار سکتا ہوں" وَ اٰمِرُنَا لِنُسَلِّمَ لِمَا بَآءَ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۱)۔ جبکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدا کے رب العالمین کے سامنے ہی جھکوں۔ اس کے سوا کسی اور کے احکام کی اطاعت نہ کروں۔ ہدایت خداوندی اور اس کے سامنے تسلیم خم کرنے کے الفاظ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ "خدا کو پکارنا" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہے۔

اس کے بعد ہم ان مقامات کی طرف آتے ہیں جہاں ”خدا کو پکارنے“ سے مراد (عرف عام میں) ”دعا مانگنا“ ہیں۔ لیکن ان مقامات کو سامنے لانے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ دعا کے اس مفہوم سے جو شکوک و اعتراضات اُبھرتے ہیں، انہیں بھی سامنے لایا جائے۔

دُعا کا عام مفہوم

اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہو، اسے خدا نے پہلے سے کچھ دیا ہوتا ہے اور یہ (قسمت کا کھٹا) اٹل ہوتا ہے، تو پھر دُعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے۔ اب اس کے لئے وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے کھٹے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنے دن بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا کھٹا اٹل ہوتا ہے۔ جو فیصلہ بدل سکتا ہے۔

اس سے پیدا ہونے والے شکوک

اور اس کے ساتھ ہی، اس عقیدہ کی رُو سے، خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے (یا اس کے متعلقین نے) ہم سے درخواست کی تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے اور اگر یہ غاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچئے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کیسے اشکال لاحق ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہر بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر ٹھوٹا ہے، دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی یا جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ بجز زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کر لے گا جو حق پر نہیں اور مقدمہ کا فیصلہ اُس کے خلاف ہو گا جو برسرِ حق ہے!

اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے (یعنی زید کی) تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ کیا پھر خدا بجز اس کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی؟

اور اگر کہا جائے کہ خدا بہر حال 'حقدار کا ساتھ دے گا' تو اول یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پچھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہ رہا۔ 'حقدار' دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں، وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سنے گا نہیں۔

اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔ دعا سے تدبیر کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس سے پھر وہی دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں لیکن بکر اس کیساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا۔ تو کیا اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیوں کہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیوں کہ اس نے دعا نہیں کی تھی۔ (حالانکہ وہ حق پر تھا)۔

یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد کی رُو سے دعا کے سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے سورہ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ

(۲/۱۸۶)

الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ.....

اور اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

(اے رسول!) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار (کو سنتا اور اُسے قبول کرتا ہوں)۔

اس ترجمہ کی رُو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس

وہی بس، مصیبت زدہ لوگ گڑگڑا، گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی کوئی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم بہتے بہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہذا، اس امر واقعہ کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہذا، اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِ حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا، بڑے دُور رس (تخویری) نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی درست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، تو (مذکورہ بالا جواب کی رُو سے) اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشاء کے عین مطابق ہے، اس لئے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیئے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد، ظالموں کو کس طرح بد لگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو ابھرنے لگے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دستِ ظلم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہو گئی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لئے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے! یا اللعجب۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکموں اور زیر دستوں کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ ان کے شکر گزار ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھتے تو یہ عقیدہ سلنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا۔ وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر ”حضرت صاحب“ کے آستانِ عالیہ پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا، ہجوم

خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا ہے

دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا، گڑگڑا کر ہاتھ باندھے اور اکثر ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لئے دعا کیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا،

برباد ہو جاؤں گا۔ اور یہ سلسلہ ”حضرت صاحب“ کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد جسے وفات نہیں بلکہ وصال کہا جاتا ہے، یعنی ان کا اپنے محبوب — خدا — سے جا کر مل جانا، ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے، سجدوں میں گر کر التجائیں کی جاتی اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں اس لئے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرات مقربین بارگاہ خداوندی ہیں، اس لئے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ یعنی **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَسِيْبٌ - أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ.....** ”جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے فریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔“

ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ ہمارے دورِ ملکیت کی تخلیق ہے۔ اُس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ **السُّلْطَانُ ظِلُّ اللَّهِ عَلَى الْأَرْضِ** کا عقیدہ | پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا ”سایہ“ زمین پر دیکھا گیا اُسی قسم کی اس کی ”اصل“ آسمان

پر تصور کر لی گئی۔ اس سایہ کی رو سے، خدا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کی طرح وہ (شاہنشاہ حقیقی) بھی ایک آمر مطلق سمجھا جاتا ہے۔ نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا۔ جسے چاہا پکڑ لیا جسے چاہا نوازا دیا۔ جسے چاہا بخش دیا جسے چاہا باندھ لیا۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب و دربان کھڑے ملتے تھے۔ پھر اہل دربار میں سے مصائب، امراء، وزراء اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی حام آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لئے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی نقشہ ہم نے دربارِ خداوندی کا متعین کر لیا۔ اس کی رو سے، خدا تک بات پہنچانے کے لئے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر خدا تک دعا پہنچانے کے لئے کسی ”حضرت صاحب“ کے وسیلے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہماری درخواست (دعا) منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذرِ نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعد جس طرح بادشاہوں

کے حضور نذرانہ گزارنا پڑتا ہے یا ان کے مقربین کی ”خدمت“ کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو شاہنشاہیت نے ہمارے ذہنوں پر ترسم کیا اور جس نے رفتہ رفتہ مقدس عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ سے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر اور الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور دامنِ طریقت سے وابستگان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم ”حضرت صاحب“ کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا، حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عِبَادُ امثالُکم (۷/۱۹۴)۔ وہ تمہارے ہی جیسے انسان (خدا کے بندے) ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں، یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے، ان کے متعلق کہا ہے کہ تم انہیں لاکھ پکارو، وہ تمہاری بات ہی نہیں سُن سکتے۔ اور اگر (بفرضِ محال) وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (۳۵/۱۴)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو، وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں (۴۶/۵)۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۱۶/۲۱)۔ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں وہ تمہاری کیا سُنیں گے اور کیا مدد کریں گے؟

اب آئیے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجئے جس کا ایک حصہ ہم دوبار نقل کر چکے ہیں۔ یعنی ”جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں

تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔“ اس کے بعد ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِيْ وَ لِيُوْثِرُوْا لِيْ لَعَلَّہُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (۲/۱۸۶)۔ ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہ نمائی (قوائین) کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو (میری باتوں کا جواب دو)۔ اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

سورہ شوریٰ میں ہے یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ (۲۶/۴۲)۔

دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں، یعنی ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی اؤ

فطری نتیجہ کامیابی ہو گیا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔

سورۃ مؤمن میں ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ لیکن اتنی بات سن رکھو۔
 اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (۴۰/۶۰)۔
 جو لوگ مہری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے، ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی (وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ سورۃ اعراف میں خدا کو پکارنے کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِیْنَ (۷/۵۵)۔ وہ انہیں پسند نہیں کرتا جو حد درجہ سے سنج اور کر جاتیں۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت سے انکار کریں، ان کی دعائیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ (۴۰/۵۰)۔ دعاؤں کی مقبولیت کے لئے ایمان شرط اول ہے۔ اور ایمان کے متعلق بھی سن رکھو کہ ”اپنی لوگوں کے متعلق سمجھا جائے گا کہ وہ فی الواقع ایمان لائے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ جب ان کے سامنے قوانین خداوندی پیش کئے جائیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیں اور پھر خدا کی صفت ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری جدوجہد کریں اور کسی حالت میں بھی اطاعت خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کریں۔ وہ لوگ اس جدوجہد میں راتوں کی نیند تک بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ وَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَ طَمَعًا وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۵۱/۵)۔
 وہ اس طرح بیم ورجا، دونوں حالتوں میں خدا کو پکارتے ہیں اور جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے، اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا کر کھتے ہیں۔

سورۃ آل عمران میں اس حقیقت کو بڑے دلاویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم متعلقہ آیات کا مفہوم،

مفہوم القرآن سے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں، قوانین خداوندی کی حکمت اور ہمہ گیریت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

ان صاحبان عقل و بصیرت اور ارباب فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے بیٹھے، لیٹے، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد، علی وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگاہ، ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو

کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا کر دے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم (علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد) اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح) تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخششوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں مجلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مستحضر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی راہ نمائی پر یقین محکم رکھے۔

لہذا، ان ارباب عقل و بصیرت کی پکاریہ بھی ہوتی ہے کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور خدا پر ایمان لے آئے۔

اس کے بعد ان ارباب علم و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں (وہ دعائیں مانگتے ہیں) کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیر کی غلطیوں کے اثرات مثلاً تھے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔

اسے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے (وحی کی روشنی) جن خوشگوار یوں اور سرفراز یوں کا وعدہ کیا ہے ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہور نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ (۱۸۹ - ۳/۱۹۳)۔

دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنئے۔ ارشاد ہوا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أَضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ
أَوْ اُنْثَىٰ ۖ (۳/۱۹۴)۔

خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ (ہم نے تمہاری دعاؤں کو سُن لیا ہے۔ لیکن تم یاد رکھو کہ ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔

یہ ہوتا ہے خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

انبیاء کرامؑ کی دُعاؤں کی قبولیت | یہ تو عمومی عام مومنین کی کیفیت۔ اب ذرا حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ بات اور بھی واضح ہو جائے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق کہا کہ جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو نَادَا۔ اس سے ہمیں پکارا۔ فَلَنَحْمِہُ اَلْمُجِیْبُوْنَ (۳۷/۷۵)۔ تو ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ انکی دُعا کا کیا جواب دیا گیا تھا، غور سے سنئے۔ فَأَوْحٰیْنَا اِلَیْہِ اِنِ اصْنَعِ الْفُلَکَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحِیْنَا (۲۳/۲۷)۔ ہم نے اس کی طرف وحی کی تم ہماری زیر نگرانی، ہماری ہدایات کے مطابق ایک کشتی بناؤ یعنی حضرت نوحؑ کی دُعا کے جواب میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ ہم تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ انہیں وہ تدبیر بتا دی جس سے وہ اور ان کی جماعت آئیوا لے سیلاب سے محفوظ رہیں۔

جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ فرعون کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجہ استبداد سے نجات دلائیں، تو انہوں نے، اس ہمہ کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے بہت سے تائیدی اسباب و ذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ قَدْ اَوْتِیْتَ سُوْرَۃَ لَکَ یٰمُوسٰی (۲۰/۲۶)۔ اے موسیٰ! جو کچھ تُو نے مانگا ہے ہم نے تجھے عطا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی اور تیری مانگ پوری کر دی ہے تو پھر کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوکَ بِاٰیٰتِنَا وَ لَا تَنِیَا فِیْ ذٰلِکَ (۲۰/۲۲)۔ تم دونوں (حضرت

موسے اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو! جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے، اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے قَالَ قَدْ أُجِيبْتُ دُعَاؤُكُمْ فَاَسْتَقِيمَا وَ لَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَحْكُمُونَ ۝ (۱۰/۸۹)۔ خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دُعا کو قبول کر لیا ہے۔ اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو، تم کبھی ان لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسی طرح حضرت موسےؑ نے دعا کی کہ ان کی اُمت کو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں عطا کر دی جائیں تو جواب میں کہا گیا کہ ایسا ہو جائے گا بشرطیکہ ”یہ لوگ نبیؐ آخر الزمان کا اتباع کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری رحمت ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسانوں میں سے وہ انہی کو ملتی ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ ان کی پوری پوری ہنگامہ داشت کریں اور دوسروں کے لئے سامانِ نشوونما بہتیا کریں“ (۱۵۶ - ۱۵۷/۷)۔

حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے لئے دُعا کی تو انہیں اس کی خوشخبری اسی وقت دے دی گئی۔ لیکن یہ دُعا پوری اس طرح ہوئی کہ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجًا (۸۸ - ۹۰/۲۱)۔ ان کی بیوی میں جو نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، اس کی اصلاح ہو گئی ہے۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا ہے، ان کے سلسلہ میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لئے جن طبعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں بہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ دعا مانگ لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اسی قسم کی دعاؤں کے متعلق سورہ رعد میں ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے دریل کے **لب دریا پیاسا** کنارے کھڑا ہے۔ کیا ایسے شخص کی پیاس کُچھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ پیاس اس کی بجھے گی جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھر لے اور اسے پی لے۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی۔ وَ مَا دُعَاؤُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ (۱۳/۱۴)۔

لے حضرات انبیائے کرامؑ کی دعاؤں کے سلسلہ میں مزید تصریحات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گی۔

جو لوگ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں یوں رائیگاں جاتی ہیں۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائیں، مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی دادریا دہنیں! ان کے دکھوں کا کوئی مسدودا نہیں۔ ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں

لیکن اس کا طریق کچھ اور ہے۔ وہ طریق کیا ہے، اسے غور سے سنئے۔

برسہا برس کی محنتِ شاقہ اور تنگ و تازِ پیہم کے بعد، مدینہ میں جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو گئی لیکن جو مسلمان اس وقت تک مکہ میں محصور تھے، قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ ہماری مدد کر اور ہمارے لئے ان ظالمین کے جو رستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر۔ انہوں نے خدا سے دعا کی اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے مدینہ کی جماعتِ مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے وَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا۔ کیا تم سنتے نہیں کہ مکہ کے مظلوم و مظلوم بے کس و بے بس، کمزور و ناتواں، مرد، عورتیں، بچے کس طرح گڑ گڑا کر گڑ کریم سے فریاد کر رہے ہیں کہ بارِ الہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکتِ اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو نہیں سن رہے؟ اور اگر سن رہے ہو تو پھر تم کس بات کے انتظار میں ہو۔ تم ان کی امداد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں۔ تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس الحاح و زاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَ اجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَ اجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (۴/۷۵)۔ وہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی یار و مددگار پیدا کر۔ کوئی حامی و ناصر بھیج۔

غور کیجئے، مکہ کے مظلوم، خدا سے فریاد کرتے ہیں خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ براہ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اُس مملکت، اُس حکومت، اُس نظام سے کہا جو اس کے نام پر، اُس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا تھا کہ تم ان کی پکار کا جواب دو۔ تم ان کی مدد کے لئے اٹھو۔

یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعتِ مومنین، جوابِ مدینہ میں تھی،

مظلوموں کی دعائیں اسلامی مملکتِ سنتی ہے | تیرہ برس تک، قریش کے بے پناہ مظالم کا تختہ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے

میں، خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں مانگی ہوں گی! لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لئے وجود میں آیا ہو، اس لئے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ تم ہمت و استقلال سے کام لے کر اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا۔ اور اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی، تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے (خدا سے) نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس مبلغِ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا: اَمَّنْ يَتَّخِذُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ۔ کہو! کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے! وہ اس کے لئے کیا کرتا ہے وَيَجْعَلْكُمْ خُلَفَاءَ الْأُمَمِ ۚ (۲۷/۶۲)۔ وہ تمہیں حکومتِ مملکت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریقِ خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے عطا نہیں ہو جاتی۔ یہ ان کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ ہوتی ہے ۲۴/۵۵)۔

دوسرے مقام پر اسی جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے: وَ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلرَّسُولِ بَعَثَهُمْ وَ اَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَ اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۲۲/۳۸)۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ انہی کی روشنی میں، اپنے امورِ مملکت باہمی مشورہ

سے طے کرتے ہیں۔ اور جو سامان زیست خدا نے انہیں دے رکھا ہو، اسے رفاہ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی (مشاورت باہمی سے) اشارہ اسی نظام مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور نا انصافی دور کرنے کے لئے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو قوم فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی تھی۔ سورہ قصص میں ہے کہ

فرعون نے اپنی مملکت میں دھاندلی کی انتہا کر رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس طرح ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کئے چلا جاتا تھا (کہ وہ ابھرنے نہ پائیں) اس کے لئے وہ کرتا یہ تھا کہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جو ہر مردانگی دکھائی دیتے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا اور جو ان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ ان میں ناہمواریاں پیدا کئے چلا جاتا۔

اس کی اس سرکشی اور فساد انگیزی کے پیش نظر ہمارے قانون مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک میں سرکاری اور سروری عطا کر دی جائے اور انہیں ایک ایسے خطہ زمین کا مالک بنا دیا جائے، جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ (۴-۲۸/۶)

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بیکسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے۔ اس کی ضرورت پیش آتی ہے اُس غلط معاشرہ میں جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو۔ ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو۔

دعا مانگنے کی ضرورت کب پڑتی ہے؟ کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے۔ جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں اس شخص کا کوئی پُرسان حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے۔ جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے۔ جہاں افراتفری اور نفسا نفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے، سب اسے روندتے چلے جائیں، کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے۔ جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں۔ جہاں مفلس مریض اس لئے بن آئی موت مر جائے کہ اس کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں تھا اور بیوہ ماں

اپنے جوان پیٹے کی موت پر اس نگر میں گھلی جا رہی ہو کہ اسے گورد کھن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جہاں بیکسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں)۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کہنے والے نے کہا ہے کہ

جو نہیں آشنا مصیبت کا درد و غم کا نہ جوشکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ دقت پڑا جو نہ اٹھا اٹھ کے رات کو روبا

وہ نہیں جانتا دُعا کیا ہے

اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

جب معاشرہ صحیح خطوط (مستقل اقدار خداوندی) پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی صحیح معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوتا | پریشانی اور تردد کے ملتا ہے۔ نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھیلی۔

اس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لئے اس میں کوئی محتاج ہوتا ہے نہ لڑا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرہ میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لئے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔ اس حقیقت کبریٰ کو حضرت عمر فاروقؓ نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جب بھی اس پر غور کیا جائے رُوح وجد میں آجاتی ہے۔ ان کا ایک قول اس سے پہلے بھی آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے، یعنی جب آپ نے طاعون زدہ علاقہ سے منتقل ہو کر اس علاقہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا جو طاعون سے متاثر نہیں تھا تو آپ سے کہا گیا تھا کہ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں۔ اس

حضرت عمر فاروقؓ کا نہایت بلیغ ارشاد | کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ ”ہاں! میں خدا کی ایک تقدیر سے اس کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں“ اب آپ انہی کا ایک اور قول ملاحظہ کیجئے اور سوچئے کہ ان دست پروردگار رسالت نے دین کی

لم کو کس سن و خوبی سے سمجھا تھا اور مہدافض نے انہیں، ایسے عمیق حقائق کو عام فہم الفاظ میں سمجھانے کا کیسا و نکش انداز عطا فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ لوگو! سن رکھو۔

مجھے خلافت کا فیض اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ قیام خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورتمند کی کوئی ضرورت رُک نہ رہے۔ جب کیفیت یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لئے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فیض کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ شخص میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً احتسابِ خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ ضرورت مند کی ضرورت اس سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی راہ نمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لئے خدا سے کچھ مانگنا ہی نہیں پڑتا۔ جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی کیا ضرورت ہوگی! یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں سب اجتماعی ہیں انفرادی نہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں؟

مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں

ہے۔ ملاحظہ فرمائیے مومنین کی چند ایک دعائیں۔

(۱) اے رب العالمین! ہمیں زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ دکھا دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرے سحارِ کرم کی بارش ہوئی تھی۔ (۵-۱/۷)۔

(۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی حسنات عطا فرما اور آخرت میں بھی

حسنات۔ (۲/۲۰۱)۔

(۳) مجاہدین کی دعائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ثبات و استقامت عطا فرماتا کہ ہمارے قدموں میں

لغزش نہ آنے پائے۔ اگر ہم سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت فرما دے اور

ہمیں مخالفین پر کامیابی عطا فرما۔ (۲/۲۵۰) ذ (۱۷۷-۱۳/۱۷۶)۔

(۴) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سہو و زیان سے درگزر فرما۔ ہم جہالت اور غفلت کے اس

بوجھ تلے نہ دب جائیں جن کے نیچے اقوام سابقہ دب گئی تھیں۔ ہمیں اتنی قوت عطا فرما دے جس سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے عمدہ برا ہو سکیں۔ ہمیں ان لوگوں پر غلبہ و نصرت عطا کر دے جو ترے نظام کے مخالف ہیں۔ (۲/۲۸۶) ۱ (۳/۱۵)۔

(۵) اے ہمارے رب! ایسا نہ ہو کہ صحیح راستہ مل جانے کے بعد ہمارے قدم پھر غلط راستے کی طرف اٹھ جائیں۔ تو ہمیں سامانِ نشوونما عطا فرما تا رہ۔ (۳/۷)۔

(۶) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی دسات سے ہم سے کئے ہیں انہیں پورا کر دے۔ (۱۹۲-۱۹۳/۳)۔

(۷) ہمارا شمار صالحین کے زمرے میں ہو۔ (۱۵/۸۴)۔ ظالمین کے زمرے میں نہ ہو۔ (۷/۴۷)۔

(۸) ہمارے اور ہمارے مخالفین کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ (۷/۸۹)۔ (یہ حضرت شعیبؑ اور ان کے متبعین کی دعا تھی)۔ انبیاء اور ان کی جماعتیں، مخالفین کے ساتھ تصادمات میں اسی قسم کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔

(۹) متبعین حضرت موسیٰؑ کی دعا کہ بارالہ! ہمیں ظالمین کا سختہ مشق نہ بننا پڑے۔ (۱۰/۸۵)۔ یہی دعا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھیوں کی تھی۔ (۹۰/۵)۔

(۱۰) عذابِ جہنم سے محفوظ رہنے کی دعائیں۔ (۲۵/۶۵)۔

(۱۱) بیوی بچے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنیں (گھر کی زندگی سکون و اطمینان کی ہو) اور ہم متیقن کے امام قرار پائیں۔ (۲۵/۷۴)۔

(۱۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ایسا کر دے کہ ہمارے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لئے کدورت نہ رہے۔ (۱۵۹/۱۱)۔

(۱۳) جنت میں مومنین کی دعائیں کہ ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ (۶۶/۸)۔

یہ ہوتا ہے انداز، مومنین کی دعاؤں کا۔ ان کی ساری دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں، جن سے پورے معاشرہ، جماعت، نظام کی خیر سگالی کے جذبات چھلک چھلک کر باہر آتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں اجتماعی ہی سہی، ان سے ہوتا کیا ہے؟ ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یہ سوال اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل، اس لئے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دُعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔

کوئی کام کرنا ہو، اس کے لئے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو بیدار ہوتی ہے دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی، اس قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں گے۔ علامہ اقبال نے بچوں کے لئے ایک نظم لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدرسے کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں، یعنی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ

لب پہ آتی ہے، دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس شعر کے مصرعہ اول میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ (یوں تو) بچوں کے لئے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ بڑی غنیق ہے۔ یعنی جب انسان کی دلی تمنا، حروف و الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے، تو اسے دُعا کہا جاتا ہے۔ جتنی گہری تمنا، اتنی ہی مخلص دُعا۔ جتنی شدید آرزو، اتنی ہی پُر کیف پکار۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پھر جس قسم کی وہ

نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے | آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے، خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں،

ایک منزل را نمی دانی ز رہ قیمت ہر شے ز اندازِ نگہ
نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود این زمین و آسماں دیگر شود

اور اگر آپ اس سے زیادہ حسین و جمیل (تغزل کے) انداز میں بات سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

بلکہ یوں کہ

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلہ

جیسا کہ میں نے پیش لفظ میں کہا ہے، میں اس کتاب میں، مسئلہ تقدیر اور اس کے تضمینات پر، فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا کہ اس سے بات عام فہم بھی نہیں رہیگی اور ہمارا سفر بھی بہت طول طویل ہو جائے گا اور نہ (SUBJECTIVE IDEALISM) کا تو یہ کہنا ہے کہ خارجی کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس کے احوال و کوائف، ہمارے دل ہی کے پر تو ہوتے ہیں، بیتل کے الفاظ ہیں:-

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سر و سمن درا
توز غنچہ کم نہ دمیدہ، درد دل کشا بہ چمن درا

یعنی

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سبب نشاط بہار ہے

بہر حال، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدت آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا انداز نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے، اس قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو، عشق کی اک جست قصہ تمام کر دیتی ہے، وہ شدت آرزو ہی کی پیدا کردہ توانائی کی رو سے ہوتا ہے۔ اس باب میں جب ہم ”زبان جاہلیت“ کے عربوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ تمدن و تہذیب سے اس قدر عاری اور فلسفہ و منطق سے اس قدر لابلہ ہونے کے باوجود، ان کی نگاہ کس قدر بلند اور ان کی فکر کس قدر عمیق تھی۔ اور اس کے مظاہرہ کا ان کے ہاں ایک ہی ذریعہ تھا۔ یعنی ان کی زبان۔ لسان عربی، مبین۔ وہ (بادیہ نشین) جب اپنے موشیوں کا دودھ دوہتے تو ٹھوڑا سا دودھ ٹھنوں میں باقی چھوڑ دیتے۔ یہ دودھ، اُس دودھ کے نیچے اتارنے کا موجب بن جاتا جسے جانور نے اوپر چڑھا لیا ہوتا۔ اس طرح چھوڑے ہوئے دودھ کو وہ اَللّٰہِ اَعِیْنہ کہتے

۱۔ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام۔ اس زمین و آسمان کو بیسکراں سمجھا تھا میں (اقبال)

اس سے دُعا کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو انسانی جذبات کو ابھارنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنے جس سے اس کی مضمحل توانائیاں اچھپایا ہوا دودھ، مشہود ہو کر باہر نکل آئیں۔ شدتِ آرزو سے جس کا دوسرا نام دعا ہے، یہ ہوتا ہے۔

آرزو کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو ہے کس قسم کی۔ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن کریم نے، مومن کے سامنے ”صحیح آرزو“ کا جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے کہ مَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۸۱/۲۹)۔ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ تم اپنی آرزوؤں کو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھو۔ جس بات کو خدا برا سمجھتا ہے، تم بھی اسے برا سمجھو جیسے وہ اچھا سمجھتا ہے تم بھی اسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

اپنی آرزوؤں کو مشیت سے ہم آہنگ رکھو | قرآن کریم کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا — یہ نہیں وہ کچھ بنا دے گا

جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تم بنو۔ واضح تر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کی تمام لگ دن از سے مقصود یہ ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اور اس بات کے پرکھنے کا، کہ میری ذات کس حد تک نشوونما پا چکی ہے، معیار یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سے کس حد تک صفاتِ خداوندی کا انعکاس ہوتا ہے۔ خدا کی ایک صفات تو وہ ہیں جو اس کی ذات سے محض ہیں۔ مثلاً هُوَ الْأَوَّلُ ذَا الْآخِرِ — دوسری صفات وہ ہیں جنہیں انسان (علیٰ حدیثِ سیرت) اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ مثلاً رَاحِمٌ، كَرِيمٌ، رُؤُفٌ، رَازِقٌ وغیرہ۔ ایک شخص کا کردار جس قدر صفاتِ خداوندی کا پرتو ہوگا۔ یعنی اس کی سیرت و عمل سے جس قدر ان اوصاف کا ظہور ہوگا جو صفاتِ خداوندی کے مماثل ہوں، اسی قدر سمجھا جائے گا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ لہذا، انسانی سیرت و عمل کے لئے نقطہٴ اولیں یہ ہے کہ اس کے دل میں آرزوئیں ہی ایسی پیدا ہوں جو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوں۔ یہ چیز قرآنی اقدار کو سامنے رکھنے سے پیدا ہونی ہے۔ بنا بریں، سب سے مقدم بات، انسان کی آرزوؤں کی تبدیلی ہے۔ اقبال نے اس حیقت کو بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے

انسانی آرزوؤں کی یہ تبدیلی وحی کی راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر تو انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ يَدْ عِ الْاِنْسَانُ بِالشَّهْرِ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا ۝ (۱۱/۱۷)۔ ”یہ بجائے اس کے کہ ان امور کے لئے دعائیں کرے جو اس کے حق میں بہتر ہوں، ان چیزوں کی آرزو کرتا رہتا ہے جو اس کے لئے مصرت رساں ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔“ ہم اس کی جلد بازیوں کا مشاہدہ قدم قدم پر کرتے رہتے ہیں۔ غیروں ہی کی نہیں، خود اپنی جلد بازیوں اور اس کے بعد خفت اور ندامت کا مشاہدہ بھی۔ اس لئے سب سے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ ویسی نہ ہو، تو اسے تبدیل کر کے مستقل قدر سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔

ذکر خداوندی سے کیا مراد ہے | اگلا قدم یہ ہے کہ اس آرزو، اس مقصد، اس معیار کو ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ قرآن کریم نے مومنین کا جو شعار بتایا ہے

وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ رِقِيًّا وَ قُعُودًا وَ عَلٰى جُنُوبِهِمْ (۱۹۰/۳)۔ جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی آرزو میں بچنگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی پاکیزگی بھی ملوث نہیں ہونے پاتی۔ قرآن کریم نے، سورہ حٰجّہ میں اس حقیقت کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا مَا بَيْنَا و اللّٰهُ شَمًا اَسْتَاْمُوْا۔ وہ لوگ جو دل کے کامل رقیبن و اطمینان سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب، اللہ ہے اور پھر اس دعوے پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہیں۔ اس میں ذرا سا بھی تزلزل نہیں آنے دیتے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ..... اُن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو ان سے کہتے ہیں کہ تم مت خوف کھاؤ۔ مت غمگین ہو اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور مددگار ہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ اس کے بعد ہے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتٰٓئُوْنَ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدْعُوْنَہٗ (۲۱/۳۱) اس میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ اس میں تمہاری ہر آرزو پوری ہوگی۔ ہر دعا قبول ہوگی۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتٰٓئُوْنَ بہت بڑا وعدہ ہے۔ جو کچھ تم چاہو گے وہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ

ان تصریحات کے مطابق جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، مومن، چاہے گا ہی وہی جو مستقل اقدارِ خداوندی (مشیتِ ایزدی) کے مطابق ہوگا، اس لئے وہ کسی غلط بات کو چاہے گا ہی نہیں اور وہ مانگے گا ہی وہی جس کے دینے کا خدا نے مومنین سے وعدہ کر رکھا ہے، یعنی ہر قسم کی خوشگواریاں، سرفرازیاں، رزقِ کریم، غلبہ و تسلط، قوت و اقتدار یعنی فرائی معاشرہ کی تمام برکات۔ اس میں یہ کیفیت نہیں ہوگی کہ

بے نیازی کے ترے ناز اٹھائے کیا کیا جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا نہ ہوا

مہدار فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا

یہ کچھ جتنی معاشرہ میں ہوتا ہے، جتنی معاشرہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں مومن، جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے جو مانگتا ہے وہ ملتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہر مانگ اور طلب، مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ مومنین کی دعائیں کیسی ہوتی ہیں اور وہ پوری کس طرح سے ہوتی ہے! یہ دعائیں اُس جماعت کی ہوتی ہیں جو دنیا میں خدا کے نظام کی تشکیلات و استحکام کے لئے اُٹھے اور سفرِ حیات، وحیِ خداوندی کی روشنی میں طے کرتی جائے۔ سینے میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم، دل میں حصولِ مقصد کی تڑپ، نگاہوں کے سامنے واضح نصب العین، بازوؤں میں قوت اور قدموں میں استقامت۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی ذات، (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مومن کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کے خیالات، ارادے، مقاصد، مطامح، رزائے نگاہ اور منتہائے نظر، سب مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی حقیقت کو میں نے اپنی کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ان الفاظ کے پیرزن میں پیش کیا تھا۔

دعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمہ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا، عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دل کش رعنائیوں سے یک رنگی کی مچلتی ہوئی آرزو، چکور کے سینے میں چاند کو اپنے اندر سمو لینے کی ہلکشاں گیر و فلک پیم، والہانہ امنگ، قلبِ پروانہ میں شمعِ فروزاں کے انداز و اسلوبِ جذب کر لینے کا وجدانِ گزور قصِ آفریں جو شرفِ خروش، یعنی انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لا متناہیت (حیاتِ جاوداں) میں بدل لینے کا ہیستابانہ ولولہ اور اسی ولولہ کی تسکین کے لئے قطرہٴ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے بازوئے شاہیں کی طلب۔ بغور دیکھئے تو ایمان، دعا اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور

ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا اس ہم آہنگی و یکسوئی کی شدید تڑپ ہے اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے کوشش پیہم۔ یہی ہیں مومنین کی وہ دعائیں جو مستجاب ہوتی ہیں۔ انہی کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا فہام عمل میں آتا ہے۔ وہ نظام جس میں کسی کو اپنی انفرادی ضرورت اور حاجت کے لئے رانوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ نظام "ان کی دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتا ہے"۔ وہ اس کا انتظام کرتا ہے کہ ہر صاحبِ احتیاج کی دعا (مانگ) بابِ خداوندی سے ٹکرانے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

باقی رہی ملائکہ کی تائید، سو اس کے لئے قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ لَتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ (۸/۱۰) اس سے انسان کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اس کے قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَوْقَادَ (۸/۱۱)۔ اور اس سکونِ قلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قدموں میں ثبات و استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے جو کچھ دُعا سے ہوتا ہے، یعنی اس سے انسان کے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کس قدر قابلِ صد رشک ہے وہ انداز جس میں اقبالؒ نے اتنی بڑی رفیع و مینع اور عمیق و دقیق حقیقت کو دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے کہ جس سے بیخ اور دیکش انداز تصور میں نہیں آسکتا۔ آپ بھی سینے اور رقص کیجئے کہا ہے کہ

تیری دُعا سے قصہ تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ (فصل سے یہاں مرقا قانونِ خداوندی ہے)۔

باقی رہا ہمارا ایک دوسرے کے لئے دُعا کرنا، تو یہ درحقیقت ان کے حق میں ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار

ہوتا ہے جس سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں ایک دوسرے کیلئے دُعا میں کرنا اسے اخلاقی تائید (MORAL SUPPORT) کہا جاتا ہے۔ اس سے خود اس شخص کے اندر ایک قسم کی نفسیاتی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس کے اثرات ہنایت خوشگوار ہوتے ہیں جس

محبوبِ جاں نواز کے دیکھنے سے (غالب کے الفاظ میں) مریض کے منہ پر رونق آجائے، اس سے چار کلمات تسلی یا دو الفاظِ نحمین سننے سے جو قلبی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی حیثیت، مُردہ کے لئے دُعا کی خیر کی ہے۔ اس سے مُردہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کے پسماندگان کے غم و اندوہ میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے معاشرتی روابط کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو معاشرہ میں نہ ہٹا محسوس نہیں کرتا اور سخت سے سخت جانکاہ مصیبت میں بھی اس کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ اسی لئے حضورِ نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جب اپنے عطیاتِ تیرے پاس لائیں تو انہیں قبول کرنے کے بعد صَلِّ عَلَیْہُمْ نہیں شاباش دیا کر۔ ان کے اس عمل کو (APPRECIATE) کیا کر۔ انہیں دعا دیا کر۔ اس لئے کہ اِنَّ صَلَواتِیْ سَكُنُ لَہُمْ (۹/۱۳)۔ تیری دُعا ان کے لئے بڑی موجبِ تسکین ہوتی ہے۔

انبیائے کرامؑ کی انفرادی دعائیں | قرآن کریم میں حضراتِ انبیائے کرامؑ کی بعض انفرادی دعائیں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً حضرت یونسؑ نے اپنی انتہائی تکلیف میں خدا کو پکارا اور خدا نے ان کی مصیبت کو رفع کر دیا۔ (۲۱/۸۲-۸۳)۔ حضرت یونسؑ نے اپنے غم و الم کی اندوہناکیوں میں خدا کو پکارا اور انہیں مصیبت سے نجات مل گئی (۲۱/۸۸-۸۹)۔ سواوّل تو قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ ان کے مصائب و آلام دُور کرنے کے لئے کس قسم کے اسباب پیدا کئے گئے تھے۔ دوسرے (اور یہ بات بنیادی ہے) کہ نبوتِ ایک ایسا مقام ہے جس کی کنہ و ماہیت کا سمجھنا کسی غیر از نبی کے لئے ممکن نہیں۔ ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا اور نبی کا باہمی تعلق کس قسم کا ہوتا تھا۔ خدا ہی سے کس طرح ہم کلام ہوتا تھا۔ نبی خدا سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ لہذا، جس حقیقت کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے، اس کے متعلق بحث و گفتگو سے کیا حاصل! ویسے بھی ختمِ نبوت کے بعد اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ خدا اور نبی کے اس باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد خدا اور انسانوں کا تعلق، خدا کی اس وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ، خدا سے کسی کے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کا نہ امکان ہے، نہ کوئی ذریعہ۔ جو اس کا دُعا کرتا ہے، وہ درحقیقت نبوت کا دُعا ہی کرتا ہے خواہ اس

لے اب "مقام تھا" کہنا چاہیے کیونکہ نبوت، حضورِ رسالتِ مآب پر ختم ہو چکی ہے۔

کے لئے الفاظ یا اصطلاحات کچھ ہی کیوں نہ استعمال کی جائیں۔ چونکہ اب نبوت کا دعویٰ باطل ہے اس لئے خدا سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کا دعویٰ بھی غلط ہے۔ کشف، الہام وغیرہ قسم کے تصورات سب غیر قرآنی ہیں اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لئے ہوئے۔ قرآن کریم میں تو یہ الفاظ تک بھی نہیں آئے۔ حضور نبی اکرمؐ کی جو انفرادی دُعا قرآن کریم میں آئی ہے، وہ ہر انسان کے لئے، قیامت تک، حُسنِ آرزو کا بلند ترین نمونہ ہے۔ آپؐ سے کہا گیا کہ قُلْ ثَمَّابٌ رَمَذَنِي عِلْمًا (۲۰/۱۱۴) ”کہو! اسے میرے نشوونما دینے والے، مجھے علمِ فرداں عطا فرما۔“ اے کاش، حضورؐ کے نام لیوا، اپنے سینوں کو اس ایک اُردو کا ہوارہ بنالیتے تو آج ان کا مقام کیا ہوتا!

دُعا رحمت اور رحمت سے مایوسی کفر کہایہ جانتے ہیں کہ دُعا اور اس کی قبولیت پر عقیدہ نہ رکھنے سے انسان، خدا کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ ایسا کہنے والوں کو یہ معلوم نہیں کہ قرآن کریم کی دُرو سے رحمت کہتے کسے ہیں اور اس سے مایوس کون ہوتا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے توبہ کے مفہوم کو جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک بار پھر سامنے لائے۔

یہودیوں کی آتشیں مشرقت میں توبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو اسے اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑتی۔ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہی کیفیت ہندوؤں کے ”کرم یوگ“ کے عقیدہ کی دُرو سے تھی۔ جس شخص نے اپنے پچھلے جنم میں بُرے کام کئے تھے، اسے اپنے موجودہ جنم میں ان کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ موجودہ جنم میں اس سے محفوظ رہ سکے کی کوئی شکل نہیں تھی۔ اگر وہ اچھے کام کرتا تھا تو ان کا پھل اگلے جنم میں جا کر ملتا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ (آدم اور حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دنیا میں آتا ہے اور وہ کچھ بھی کر لے، اسے اس آلائش سے نجات نہیں مل سکتی۔ جب خدا نے دیکھا کہ اس طرح تو تمام انسان جہنم میں چلے جائیں گے تو اسے اپنی مخلوق پر رحم آیا۔ چنانچہ اس نے اپنا ”اکھوتا بیٹا“ دنیا میں بھیجا جس نے صلیب پر جان دے کر نوز انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئیں ان کی نجات ہو جائے گی۔ یہ وجہ ہے جو ان کا

عقیدہ یہ ہے کہ نجات، اعمال سے نہیں ہوتی، ایمان سے ہوتی ہے۔ ان کے ہاں جو کہا جاتا ہے کہ خدا رحم ہے (GOD IS MERCY) تو اس سے یہی مراد ہے۔

دنیا اسی افراط و تفریط کی آماجگاہ بن رہی تھی۔ یعنی جہاں عدل تھا وہاں رحم نہیں تھا اور جہاں رحم تھا وہاں عدل کا تصور نہیں تھا۔ کہ قرآن آیا اور اس نے آکر کہا کہ یہ دونوں عقائد غلط ہیں۔ خدا کے قانونِ مکافات میں عدل اور رحم دونوں موجود ہیں لیکن اس میں رحم کا وہ تصور نہیں جو عیسائیوں کے ہاں ہے۔ اس کے رحم کا مفہوم اس مثال سے

سمجھ میں آجائے گا کہ ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اس کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس سے اسے الم انگیز عذاب (درد) ہوتا ہے۔ یہ عدل ہے لیکن جس خدا نے آگ میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ہاتھ کو جلا دے اسی خدا نے ایسی چیزیں بھی پیدا کر دی ہیں جن سے آگ سے جلے ہوئے کا علاج ہو جائے۔ اس قسم کی چیزوں کا پیدا کر دینا، خدا کی رحمت کہلاتا ہے۔ لیکن ان چیزوں سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو آگ سے جلنے کے بعد، ان چیزوں کی طرف رجوع کرے۔ قرآن کی اصطلاح میں اُسے توبہ کہتے ہیں۔ یعنی غلط قدم اٹھانے سے جو نقصان ہو گیا ہے اس کی تلافی کے لئے جدوجہد۔ خدا کی رحمت سے مایوس وہ ہے جو تلافی مافات کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔ جو اپنی لغزش کے بعد اس کی اصلاح نہیں کرتا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آدم کے تمثیلی قصہ کی رو سے آدم سے بھی لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم کو اس کا احساس ہوا تو اسے اپنے کئے پر سخت ندامت ہوئی اور وہ تلافی مافات کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے خدا کی رحمت سے فائدہ اٹھ لیا۔ ابلیس نے اعتراف جرم سے انکار کر دیا اور اپنی سرکشی پر بضد قائم رہا۔ وہ رحمت خداوندی سے محروم ہو گیا۔

یہ ہے رحمت کا قرآنی مفہوم۔ یعنی قانونِ مکافات میں باز آفرینی کی گنجائش۔ دیکھئے
قرآن کریم اس مفہوم کو کس وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورۃ زمر میں ہے قُلْ يُعْبَادُوا الَّذِيْنَ اَسْمٰ
عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ تَّحْمِيَةٍ اللّٰهِ ؕ اے رسول! میرے ان بندوں سے جو
اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، کہہ دو کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ
جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وہ خدا نے ہر لغزش کے نقصان سے محفوظ رہنے کا سامان
پیدا کر رکھا ہے۔ وہ سامان حفاظت عطا کرنے والا اور یوں رحم کرنے والا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ
وَاَنِيبُوْا اِلٰی تَابِكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الْعَذَابُ ثُمَّ

لَا تُنْصِرُون ۝ (۵۳ - ۳۹/۵۵)۔ اگر تمہارا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے تو وہاں سے لوٹ کر پھر خدا کے بخیر کردہ راستے کی طرف آ جاؤ یعنی اس کے احکام و قوانین کے سامنے جھک جاؤ، قبل اس کے کہ تمہاری لغزش کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ اس صورت میں تمہیں نقصان سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

دوسرے مقام پر اس اصول کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ

وَ إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ

اے رسول! جب وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، تمہارے پاس آئیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے۔

وہ رحمت کیا ہے؟

أَنَّهُ مَن عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَ أَصْلَحَ فَإِنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۶/۵۴)۔

وہ رحمت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص نادانانہ کوئی لغزش کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ اس سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لے، تو وہ خدا کو غفور اور رحیم پائے گا۔

یہ ہے خدا کی رحمت سے مقصود۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دفعہ توبہ کر کے پھر جوجی میں آئے کرتا رہے، اس سے باز پرس نہ ہوگی، کہا کہ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ۔ اس طرح خدا تمہیں اپنی رحمت سے نوازے گا۔ وَ إِنِ عُدْتُمْ عَدُوًّا (۱۱۷/۸)۔ لیکن اگر تم پھر اپنی غلط روش کی طرف پلٹ گئے تو ہمارا عذاب بھی پلٹ کر تمہاری طرف آجائیگا۔

ظاہر ہے کہ اپنی لغزش سے توبہ دی کرے گا جسے خدا کے قانونِ مکافات پر یقین ہو۔ جو اس بات پر ایمان ہی نہیں رکھتا کہ غلط روش کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے، وہ اپنی اصلاح کیا کرے گا۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ رحمتِ خداوندی سے ناامید ہوتے ہیں۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَ لِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَكْفُرُونَ ۖ (۲۹)

جو لوگ قوانینِ خداوندی اور مکافاتِ عمل سے انکار کرتے ہیں، وہ خدا کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے وَ مَن يَقْنَطْ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ (۱۵/۵۶)۔ خدا کی رحمت سے

نامید وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اگر غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں تو انہیں لاکھ سمجھاؤ وہ اسی ڈگر پر چلے جائیں گے۔ صحیح راستے کی طرف کبھی نہیں آئیں گے۔

اس کے برعکس یہ بھی دیکھ لیجئے کہ رحمت خداوندی کے امیدوار کون لوگ ہوتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ط وَ اللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۲/۲۱۸)

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا، تو یہ لوگ ہیں جو رحمت خداوندی کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ اپنی کے لئے خدا کی صفت غفور الرحیم بطور میں آئے گی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو رحمت خداوندی کے مستحق قرار پاتے ہیں نہ وہ جو ہاتھ پر ہاتھ دھڑے منتظر فردا بیٹھے رہیں یا زیادہ سے زیادہ، اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَ اَتُوبُ اِلَيْهِ کی تسبیح پڑھتے رہیں دیکھئے قرآن مجید اس باب میں کیا کہتا ہے۔

جماعت مومنین میں سے بھی وہ لوگ جو سہل انگار ہوں۔ بجز ان کے جو معذور ہوں۔ اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کریں، کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا نے، جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو ان لوگوں پر بہ اعتبار مدارج فضیلت دی ہے جو سہل انگاری سے بیٹھے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نظام کی برکات سے سب مستفید ہوتے ہیں لیکن قاعدین کے مقابلہ میں مجاہدین کے مدارج یقیناً بہت بلند ہیں۔ مدارج بلند اور مغفرت رحمت، یقیناً خدا غفور الرحیم ہے۔

(۱۹۵ - ۱۹۶/۲)

اور آخر میں، سورہ اعراف کی ان آیات کو سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے دعا کی کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنی رحمت سے نوازے، تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ اس میں شبہ نہیں کہ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ ہماری رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسانوں میں سے تو وہ اپنی کے حصے میں آ سکتی ہے جو تقویٰ شعار ہوں (تو انہیں خداوندی نگہداشت کریں)، ایتائے زکوٰۃ کریں (یعنی نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں) اور ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں اور آخری زمانہ میں اس نبیؐ ائی کا اتباع کریں جس کے تذکارِ عیلہ وہ تورات اور انجیل میں موجود پائیں گے۔ وہ معروف کا حکم دے گا، منکر سے روکے گا، طیبات ان کے لئے حلال قرار دے گا، منہائے کو حرام ٹھہرائیگا اور ان کی گردنوں سے ہر قسم کی غیر خداوندی غلامی کے طوق اتار دے گا جن میں وہ جکڑے ہوں اور ان کے سروں سے ان بوجھل سہلو

کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ تلے وہ دب رہے ہوں۔ خدا کی وہ رحمت جو سحابِ کرم کی طرح کائنات کی پہنائیوں کو محیط ہے، اسی صورت میں مل سکے گی۔ اس کے سوا اس سے بہرہ یاب ہونے کی کوئی شکل نہیں۔

(۱۵۶۱ - ۱۵۷۷/۷)

یہی ہیں وہ لوگ جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور یہی ہیں جن پر رحمتِ خداوندی کا ابرِ کرم سایہ فگن ہوتا ہے۔ دعا، زندگی کے دورِ راہ ہے پر قانونِ خداوندی کو آواز دینے کا نام ہے، جس کا جواب، کتابِ خداوندی کی بارگاہ سے ہر اس شخص کو مل سکتا ہے، جو اسے علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے اور تطہیرِ فکر و نظرت سے اسے دل کی گہرائیوں میں پیوست کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے اس کی داخلی دنیا میں وہ تغیر واقع ہو جاتا ہے جس پر خارجی دنیا کے انقلابات کا دار و مدار ہے۔ اس تغیر سے ”انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے“ کہ تو اگر دیگر شوی، اُو دیگر است۔

خدا کا محکم قانون ہے اور اس کی رحمت۔ اسی لئے اس نے اپنی کتاب کو بھی رحمت کہا ہے اور اس کے لانے والے کو بھی رحمت۔

نورِ انساں را پیامِ آخریں - حاملِ اُو رحمتہ للعالمین



اٹھا ڈال باب

نگہ باز گشت

عمل سے فارغ ہوا مسلمان بننے کے تقدیر کا بہانہ
گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے بہتر ہے کہ اس پر ایک نگہ باز گشت ڈال لی جائے تاکہ اس
اہم اور نازک ترین مسئلہ کے تمام گوشے از سر نو نکھر کر سامنے آجائیں اور قرآنی حقائق اچھی طرح ذہن نشین
ہو جائیں۔

خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو زمین و آسمان، دریا اور پہاڑ، شجر و حجر، آگ اور پانی، غرضیکہ جمادات و
نباتات میں سے ہر شے کے لئے وہ راستہ پہلے سے مقدر و متعین کر دیا جس پر اسے چلنا تھا۔ اس
کے بعد زندگی کا آغاز ہوا اور وہ (قرآنی تصریحات کے مطابق) مختلف واسطوں میں سے گزرتی، اپنی اترقائی
منازل طے کرتی، پیکر حیوانیت تک پہنچی۔ سلسلہ تخلیق کی اس کڑی میں بھی، ہر شے کے سامنے ایک ہی
راستہ تھا جس پر اس نے طوعاً و کرہاً چلنا تھا۔ بالفطریہ دیگر
جمادات، نباتات و حیوانات مخلوقات کی اس منزل تک کسی کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وہ
اپنے لئے کسی راستے کا خود انتخاب کر لے۔ جب راستہ ہی ایک تھا تو انتخاب و اختیار کا سوال ہی پیدا
نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھے تو زندگی نے ایک نئی کروٹ بدلی اور وہ ایسے پیکر میں نمودار ہوئی
جسے قرآن کریم نے "خلق آخر"۔ ایک نئی قسم کی مخلوق کہہ کر پکارا ہے۔ یہ تھا پیکر
پیکر انسانی انسانیت۔ سورۃ مومنوں میں ہے۔

ہم نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ پھر ہمارا یہ تخلیقی پروگرام روز افزا

اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے۔ اس طرح ہم نے اسے نطفہ بنایا جو رحم کے اندر ٹھہر گیا اور مادہ کے مبیضہ میں قرار گیر ہو گیا۔

پھر اس نطفہ کو علقہ (جونک کی سی شکل) میں تبدیل کیا۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوٹھڑا بنایا۔

پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی۔

یہاں تک تخلیق پر وگرام میں حیوانات بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہر حیوانی پتہ 'رحم مادر میں' اپنی مراحل میں سے گزرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد

ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (۱۲-۲۳/۱۴)

پھر ہم نے اسے ایک اور ہی قسم کی مخلوق بنا دیا۔

یہ اور قسم کی مخلوق کیا تھی؟ اس میں اور حیوانات میں کیا فرق تھا۔ وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر یہ مخلوق تخلیق پر وگرام کی سابقہ کڑیوں سے متمیز و ممتاز ہو گئی؟ اس سلسلہ میں کہا کہ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي۔ خدا نے اس میں اپنی "روح" پھونک دی۔ عربی زبان میں رُوح 'توانائی' کو کہتے ہیں۔ لہذا اس خصوصیت کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اس میں الوہیتی (توانائی) (DIVINE ENERGY) کا شمع ڈال دیا۔ اس سے کیا ہوا؟ وَ جَعَلْ لَّكُمْ السَّمْعَ وَ الْبَصَاۤءَ وَ الْاَفْۤبَادَةَ (۳۲/۹) اسے سماعت و بصر (حواس) (SENSES) عطا کی اور قلب (MIND) جس سے یہ اس قابل ہو گیا کہ حواس (PERCEPTION) کے ذریعے جو معلومات قلب تک پہنچیں اس سے یہ استنباط نتائج کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکے۔

یہ نیا طریق کار جس مقصد کے لئے اختیار کیا گیا، اس کی وضاحت 'سورۃ الدھر میں' ان الفاظ میں کر دی کہ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۙ بَصِيْرًا۔ اِنَّا هٰذَاۙ نَبْنٰهُ السَّبِيْلَۙ اِمَّا شَاكِرًاۙ اَوْ اِمَّا كَفُوْرًاۙ (۲۱-۴۶/۳)۔ اسے سماعت و بصر عطا کی۔ پھر اسے راستہ دکھا دیا اور اس سے کہہ دیا کہ جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ دوسری جگہ ہے وَ هٰذَاۙ نَبْنٰهُ الْيَتٰۤىْمَۙ (۱۰/۱۰)۔ ہم نے اس کے سامنے دونوں راستے رکھ دیئے اور اسے کہہ دیا کہ ان میں سے جو نسا جی چاہے اختیار کر لے۔ اس سے پہلی مخلوق کے لئے صرف ایک راستہ متعین کیا گیا تھا اس لئے ان کے لئے اختیار اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انسان کے سامنے دو راستے (TWO POSSIBILITIES) رکھ

دیئے۔ بالفاظ دیگر، انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنادیا۔ یہ تھی وہ خصوصیت کبریٰ جو اس سے پہلے کسی مخلوق کو حاصل نہیں تھی۔ اسے صرف انسان کو ودیعت کیا گیا۔ کائنات میں صاحب اختیار و ارادہ صرف خدا کی ذات تھی۔ اب خدا نے اپنی اس خصوصیت عظمیٰ کا ایک حصہ انسان کو بھی عطا کر دیا۔ اُسے "نفخ روح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ انسان کا اختیار و ارادہ ہے جس سے نبض کائنات میں موج اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا، پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور زندوں، چرندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن (Zoo) ہوتی۔ حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتش سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب "نفخ روح" کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ، رنگ و تعطر کا کاشانہ بن گیا۔ آپ آدم کی مثیلی داستان میں دیکھئے۔ آدم کا اولین تعارف اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں اس سے کرایا گیا ہے کہ اس میں سجدہ ریزی اور سرکشی و دُنوں۔

قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ یہی اختیار و ارادہ کی قوت اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجود ملائک اور مخدوم خلاق ہے۔ کش مکش حیات میں پُر کیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے درکشائش زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینہ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے موج سے اور اگر اس دل میں پھلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں۔ تو اسی کے تحریک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بُت ہوتا یا اشیائے کائنات میں سے کوئی ایک شے۔ مسجود ملائک و مسخر کائنات کبھی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد ہو۔ نیاز مندی اس کی قابل ستائش ہے جو خود سراپا ناز ہو۔ اسی سرکے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں، اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمہ گیری نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوش غلامی ہے۔ بس کے پاؤں تلے تخت حکومت نہیں اس کا بورے نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا، یہی شرف انسانیت ہے۔ اسی سے استحکامِ خدی پیدا ہوتا ہے اور جس کی خودی میں استحکام ہو، وہی فیض

کہہ سکتا ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ

جبر سے دل پہ اختیار کے ساتھ

اختیار و ارادہ کی انہی بے پناہ قوتوں کا حامل انسان تھا جس کے متعلق کہا کہ **وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ** (۴۵/۱۳)۔ ارض و سموات میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔ اس **سَخَّرَ لَكُم** کی تفسیر اپنے پیش روؤں کی نسبت ہم زیادہ آسانی اور وضاحت سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں جس وقت یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں، ریڈیو سے یہ خبر

سُن رہا ہوں کہ امریکہ کا خلا نورد جہاز 'اپالو ۱۲' اپنے خلا نوردوں سمیت **کائنات مسخر کر دی گئی**۔

بجیر و خوبی، کامیاب و کامران، واپس آ گیا ہے۔ اس تسخیر کاراز کیا ہے؟ صرف یہ کہ کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے تابع مگر عمل ہے اور انسان میں اس امر کی صلا رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان قوانین کو دریافت کر سکے۔ سائنس کی اصطلاح میں ان قوانین کو، قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے لیکن قرآن کی اصطلاح میں انہیں مشیتِ خداوندی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ان اشیاء کا، ان قوانین کے تابع چلنا، ان کی تقدیر کہلاتے گا۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس کی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک طبعی زندگی، جس میں انسان اور حیوان مشترک ہیں۔ لیکن اس کی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے جسے "انسانی زندگی" کہہ لیجئے۔ اس زندگی کے لئے ایک اور ضابطہ قوانین ہے جسے مستقل اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ضابطہ قوانین وحی کے ذریعے عطا ہوتا ہے اور اب قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اگر انسان، فطرت کی قوتوں کو، جو اس کیلئے مسخر کر دی گئی ہیں، مستقل اقدار کے تابع رکھے تو اس سے اس کی انسانی زندگی نشوونما پاتی ہے۔ اسی کو اس کی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ محض فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینا، مقامِ آدم (آدمی کا مقام) ہے۔ لیکن ان قوتوں کو مستقل اقدارِ خداوندی

(۳۹۳ کا فٹ نوٹ) اس موضوع کی اہمیت تھی کہ میری کتاب "ابلیس و آدم" کا یہ حق میرے سامنے کھل گیا اور میں نے اس میں سے یہ الفاظ اس جگہ درج کر دیئے۔ اس کی مزید تفصیل، اس کتاب میں ملے گی۔ اس میں انسان کی پیدائش، آدم، ابلیس، وغیرہ کے متعلق وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۱ء۔ صبح۔

مقامِ مومن کے تابع رکھنا، مقامِ مومن ہے۔ بالفاظِ دیگر، عام انسان، اپنے اختیار و ارادہ کو اپنے مقاصد اور خواہشات کے تابع رکھتا ہے اور مومن اس کا استعمال وحیِ خداوندی کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس سے اس کی مضمر صلاحیتیں اس انداز سے مشہود ہو جاتی ہیں کہ دوسرے انسان اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے یہی وہ جماعت تھی جسے قرآن نے اَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا تھا (۱۳۸/۱۲) یعنی سب سے بلند۔ اقبال کے الفاظ میں۔

مومن بالائے ہر بالا ترے

غیرتِ او بر تابد ہمسرے

اعْلَوْنَ ہونے کا یہی وہ جذبہ تھا جس سے سرشار ہو کر، صدراؤل کی جماعتِ مومنین نے، چند دنوں میں قیصر و کسریٰ کے تختِ اُلٹ دیئے اور دنیا کے ہر نظامِ باطل کی بساطِ لپیٹ کر رکھ دی۔ اور یہی چیز مستبد مفاد پرستوں کی نگاہوں میں کھٹک گئی اور انہوں نے، اس جماعت سے، اپنی شکست و ناکامی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ وہ بادئی تدبیر اس نتیجہ پر پہنچ گئے (اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت تھی جسے سمجھنے کے لئے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت نہیں تھی) کہ یہ قرآن کی تعلیم کا اثر ہے جس نے ان کی رگوں میں حرکت و حرارت کی بے پناہ بجلیاں بھروی ہیں اور ان پر یہ راز افشا کر دیا ہے کہ انسان اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھتا اور اپنا مستقبل اپنی قوتِ بازو سے تعمیر کرتا ہے۔ لہذا، انہوں نے محسوس کر لیا کہ جب تک انہیں اس عقیدہ سے بیگانہ نہیں بنادیا جائے گا ان سے انتقام نہیں لیا جاسکے گا۔ اس زمانے میں مجوس کا

جماعتِ مومنین سے انتقام یہ عقیدہ کہ انسان کا مقدر پہلے سے متعین ہوتا ہے جسے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں ہوتا، ہر مذہب اور ہر قوم میں عام تھا۔

قرآن اس زندگی کش اور انسانیت سوز عقیدہ کے خلاف چیلنج تھا۔ لہذا، انہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے ماتحت، غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر، مسلمانوں میں اس عقیدہ کو پھیلانا شروع کیا۔ پہلے انہیں جبر و قدر کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی زکاتِ آفرینیوں کی پیچیدگیوں میں الجھایا اور اس کے بعد وضعی روایات سے، عقیدہ جبر کو مذہبی تقدس کا نگاہ فریب لباس پہنا دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قرآن مجید کی سب سے پہلی تفسیر (تفسیر طبری) لکھی گئی اور صدراؤل کی سب سے پہلی تاریخ (تاریخ طبری) مرتب ہوئی۔ ان دونوں نفیرِ تاریخ کا مدار زبانی روایات پر تھا جنہیں ذاتِ رسالتِ مآب یا صحابہ کبار کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا، روایات

کے یہ مجموعے بھی اسی زمانہ میں مرتب کئے گئے تھے۔ اس طرح 'رفتہ رفتہ' اس عقیدہ (جبر) کو مذہبی سند بھی حاصل ہو گئی، حتیٰ کہ اسے جزو ایمان تک بنادیا گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے یہ خیال عام ہوتا چلا گیا کہ حکومت اور نکتہ، عزت و ذلت، امیری اور غربی، مسرت اور مصیبت، کامیابی اور ناکامی، سب، خدا کے ہاتھ میں ہے۔

عقیدہ تقدیر عام کر دیا گیا | ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے، انسان کی فکر و تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا۔ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ خدا سے جس حال میں رکھے مطمئن رہے۔ راضی برضار ہونا، مومن کا شعار ہے، جو شخص تمہیں ظالم اور مستبد نظر آتا ہے، وہ مشیت خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ اور آلہ ہے اس لئے اس کے خلاف تمہارے دل میں مخالفت یا منافرت کا کوئی جذبہ بیدار نہیں ہونا چاہیئے۔ تیر، جو کسی کا کلیجہ چھلنی کرے، مورد الزام نہیں ہوتا، اس کا ذمہ دار وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں کمان ہو۔ اس لئے مظلوموں اور ناداروں کو ہر قسم کا ظلم و استحصال بخوشی برداشت کئے جانا چاہیئے کہ یہ مرضی مولا ہے۔ اس کے خلاف حرف شکایت زبان تک لانا، خدا کی شان میں گستاخی ہے۔

یہ ہمارا دورِ ملوکیت تھا اور ظاہر ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں کو اس قسم کے عقائد بڑے راس آتے ہیں۔ ان سے وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے جائیں، مظلوموں اور ستم زدوں کے دل میں ان کے جور و استبداد کے خلاف احساس شکایت تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کوئی فرعون، ہامان کے بغیر اپنی فرعونیت کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے، ان عقائد کو مذہبی تائید حاصل ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے اپنی مشہور نظم۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ میں، ابلیس کو فخریہ کہتے ہوئے دکھایا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

ان سندوں کو اور زیادہ تقدس کا لبادہ اوڑھانے کے لئے، مسلمانوں میں تصوف جیسا ہلاکت آفریں مسلک رائج کر دیا گیا (واضح رہے کہ تصوف کا لفظ قرآن میں ہے اور نہ ہی ہمارے دورِ اول میں اس کا کہیں پتہ نشان ملتا ہے۔ یہ بھی ہمارے دورِ ملوکیت کا اضافہ ہے) اس مسلک کی رُو سے، محکوموں اور مظلوموں کو اتنی سی ایفون ہی نہیں بلانی گئی کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے خدا

تصوف کی تباہ کاریاں

کی مرضی سے ہو رہا ہے، اس میں ان مستبد حکمرانوں کا کوئی قصور نہیں، بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ (معاذ اللہ)۔

فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے انا ما بکمر الا علی، کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا

نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی)

حافظ نے اتنا بیباک ہونے کی جرأت نہ کی اور صرف یہ کہہ دینے پر اکتفا کیا کہ

گناہ گرچہ نبوہ از خطائے ما حافظ

تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است

علامہ اقبال نے مرشد رومی سے کہا کہ تقدیر کا عقیدہ بڑا لالہ نخل ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی ایسا پیچیدہ

مسئلہ نہیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ

بال، بازاں را سوئے شاہاں بُرد

بال زاعاں را بہ گورستاں بُرد

اُڑنے کی صلاحیت عقاب و شاہیں کو بھی حاصل ہوتی ہے اور چیل کوٹے کو بھی۔ عقاب اپنی اندرونی فطرت

کے بل پر بادشاہوں کے ہاں سرفرازی حاصل کر لیتا ہے اور چیل اور کوٹے، اپنی خلقی جبلت کی بنا پر لاشوں

کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مولانا روم نے مشاہدہ پرندوں کا کیا جنہیں خالقِ فطرت نے مجبور پیدا کیا

ہے اور اپنے اس مشاہدہ کا نتیجہ انسان پر منطبق کر دیا جسے خدا نے بال و پر دے کر یہ کہہ دیا ہے کہ تم ان کا استعمال

جس طرح جی چاہے کرو۔ یوں، تصوف نے عقیدہ جبر کو مسلمانوں کے خون کے ذرات تک میں حلول کر کے رکھ دیا۔

تصوف کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد و تصورات کو محسوس تشبیہات اور تمثیلات کے ذریعے پیش کرتا ہے

اور انہیں بطور اصول منوالیتا ہے۔ یہ تشبیہات اور تمثیلات بڑی جاذب اور دلکش ہوتی ہیں۔ یہ دراصل "شاعر"ی

ہوتی ہے۔ اسی لئے صاحب نے کہا تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ یہ تشبیہات انسان کے دل

و دماغ سے چپک جاتی ہیں اور وہ انہیں محکمِ اصول خیال کر کے، ان معتقدات کا گردیدہ ہو جاتا ہے۔ ارباب

تصوف انہیں کبھی دلائل و براہین کی رُو سے پرکھنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ان کے نزدیک فکری دلائل کیمر

ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ عقل و فکر کے تو وہ ہائی دشمن ہوتے ہیں، بلکہ علم و بصیرت کے بھی۔ ان کا عقیدہ

یہ ہے کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تکلیں بود

مسلک خانقاہیت نے، قناعت، توکل، صبر، شکر، راضی برضا، وغیرہ کے غیر قرآنی مفاہیم سے، اس قوم کے اعصاب پر اس طرح موت طاری کر دی کہ یہ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ یہی وہ مرگ آفرین عقائد ہیں جو ہم میں صدیوں سے متواتر چلے آ رہے ہیں اور جنہیں ہر محراب و منبر سے مسلسل و متواتر دہرایا جاتا اور ہر زاویہ و خانقاہ میں، دلوں کی گہرائیوں میں اتارا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی قوم، جس کی نگاہوں سے کبھی دنیا کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں، آج خود، ہر وقت اپنی تقدیر کا رونا روتی رہتی ہے۔ وہ جسکی پیشانی کے تیوروں سے قوموں کی بساط زندگی الٹ جایا کرتی تھی، آج اپنی ”پیشانی کے لکھے“ کے ہاتھوں مجبور و مقہور، سر بزاؤ بیٹھی ہے۔ وہ جس کے متعلق کہا تھا کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستاروں کو تہائے لئے مسخر کر دیا گیا ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ، دنیا کے ”کافر و ملحد“ تو چاند اور سورج پر کمندیں پھینک رہے ہیں اور یہ ”خدا پرست“ اپنی تقدیر کو ستاروں کے تابع سمجھ کر، منجھوں سے فائیں لیتا پھر رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

کیا اس سے بڑا انقلاب بھی آسمان کی آنکھ نے کبھی دیکھا ہے؟ آپ نے غور کیا کہ ایک عقیدہ کے بدل جانے سے کس طرح قوموں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ عقائد کی قوت بڑی ناقابل شکست اور ان کی گرفت ایسی محکم ہوتی ہے کہ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور قوت نہیں کر سکتی۔

لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ چونکہ یہ عقیدہ کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے، علمی دنیا میں

چل نہیں سکتا، اس لئے ہم، ایک کش مکش میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں۔ کوئی شخص ہمارے کسی عزیز کو

قتل کر دیتا ہے۔ عقیدہ ہمارا یہ ہے کہ یہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ مقتول کی عمر ہی **ہماری دو علمی** اتنی تھی۔ اس کے مقدر میں اسی طرح قتل ہونا لکھا تھا۔ قسمت کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔ زبان سے یہ کچھ کہتے جاتے ہیں اور قاتل کے خلاف استغاثہ بھی دائر کر دیتے ہیں۔

استغاثہ دائر کرتے ہیں تو، ایک طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ ہو گا وہی جو اللہ کو منظور ہے، لیکن اس کے

ساتھ، مقدمہ کی کامیابی کے لئے ہر ممکن تدبیر بھی اختیار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں جائز اور ناجائز تک

کی تمیز بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کامیابی ہوتی ہے تو اپنی حسن تدبیر کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ ناکامی ہوتی

ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔

بچہ بیمار ہوتا ہے تو عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ خدا نے پہلے سے لکھ رکھا ہوتا ہے کہ اس نے کب بیمار ہونا ہے۔ کتنے دن تک بیمار رہنا ہے اور اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ لیکن عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کے علاج کے لئے دوڑے دوڑے پھرتے ہیں۔ افاقہ نہیں ہوتا تو علاج بدلتے ہیں۔ ڈاکٹر سے ہر روز پوچھتے ہیں کہ بخار کب ٹوٹے گا۔ منت سماجت کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! کچھ کیجئے جس سے بچہ جلد اچھا ہو جائے۔ وہ اچھا ہو جاتا ہے تو ہر ایک سے اپنی تدبیر کی داد طلب کرتے ہیں اور معالج کی خداقت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ وہ مر جاتا ہے تو اسے قصائے الہی کہہ کر پکارتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے علاج میں تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن جب اس کی لکھی ہی اتنی تھی تو اس میں ہم کیا کر سکتے تھے اور اگر کوئی پوچھے کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ جو کچھ ہونا ہوتا ہے پہلے سے مقدر ہوتا ہے اور قسمت کے بچے کو کوئی بدل نہیں سکتا، تو تم اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتے ہو۔ کیا اس سے قسمت کا لکھا بدل جاتا ہے تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ تقدیر کا کچھ ابر حق ہے، لیکن تدبیر کرنا بھی فرض ہے!

ہر شخص اس قسم کے الفاظ دہرا دیتا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں! اگر تقدیر اٹل ہے تو پھر تدبیر کیوں فرض ہے!

ایک طرف یہ ایمان ہے کہ تقدیر اٹل ہے۔ اس سے انکار کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ ہم کافر نہ بن جائیں۔ دوسری طرف اس سے بھی ڈر لگتا ہے کہ اگر علاج نہ کرایا تو بچہ مرجائے گا۔ سعی و کاوش نہ کی تو مقدمہ ہر جائے گا۔

یہ ہے وہ کش مکش جس میں ہم غیر شعوری طور پر زندگی کے ہر موڑ پر مبتلا رہتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس تذبذب اور بے یقینی کی وجہ سے ہماری تدبیریں بھی ناکام رہ جاتی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوئی نشانہ ٹھیک مقام پر جا کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر قوانین خداوندی کی محکمیت پر ہمالا ایمان ہو، تو اپنی ناکافی پر ہم کھڑے ہو کر سوچیں کہ کس مقام پر ہمارا قدم متعلقہ قانون کے خلاف اٹھ گیا

اس کش مکش کا نتیجہ تھا۔ ہماری تدبیریں کونسی کمی رہ گئی تھی۔ ہمارے پلان میں کونسا نقص تھا اور جب اس کا پتہ لگالیں، تو اس کے لئے از سر نو کوشش کریں۔ ہو نہیں سکتا کہ کوشش، قانون خداوندی کے مطابق ہو تو کامیابی نہ ہو۔ بیج زمین اور حفاظتی تدابیر صحیح ہوں تو فصل کیوں نہ اُگے؟ اور اگر ایمان یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے، انسان کی تقدیر امانت ہے، تدبیر اسے بدل نہیں سکتی، تو پھر

پیش آمدہ معاملات کے لئے تدبیر کیوں کی جائے۔ اطمینان سے گھر بیٹھے رہیں۔ جو ہوتا ہے ہونے دیں۔ اور رفتہ رفتہ کش مکش حیات سے فرار کی راہ اختیار کر کے غاروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہیں۔ منکر مے بودن و ہم رنگ متاں زیستن۔ کاشعار زندگی تو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

یہ ہے وہ کشمکش جس میں یہ اُمت صدیوں سے مبتلا چلی آرہی ہے اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی زندہ و پابندہ کتاب ہمارے پاس ہے جو ہمارے عقائد و مسائل کے لئے سند و حجت ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے ہر مرقبہ عقیدہ کو اس کتاب کی روشنی میں پرکھیں۔ جس کی تائید اس سے ہوتی ہو اسے قابل قبول سمجھیں۔ جس کی وہ تردید **صحیح راہ عمل** کرے، اسے مسترد کر دیا جائے۔ جب ہم اس طرح صحیح قرآنی نظریات کے حامل ہو جائیں گے تو ہماری عظمت رفتہ ہمیں پھر سے مل جائے گی۔ اس لئے کہ

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں

ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ، قانون مکافاتِ عمل ہے، یعنی یہ قانون کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کے سامنے آکر رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار تسلیم کیا جائے۔ اگر صورت یہ ہو کہ جو کچھ وہ کرے اس میں اس کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہ ہو، اس سے مشین کی طرح سب کچھ کرایا جائے تو اس کے لئے جزا و سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس تصور کی رُو سے، قانونِ مکافاتِ عمل، خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت اور حیاتِ آخرت، سب بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس سے نیچے اُتریں، تو عقیدہ جبر کی رُو سے، دنیاوی نظامِ عدل بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ جب ملزم کی صفائی (DEFENCE) کی ٹیل یہ ہو کہ میں نے یہ جرم اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں کیا، خدا نے ایسا لکھا تھا اس لئے ایسا ہو گیا، نہ اس نے ایسا لکھتے وقت مجھ سے پوچھا تھا اور نہ ہی مجھے اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ لہذا مجھے مجرم کیوں قرار دیا جائے۔ اگر اس دلیل کو صحیح قرار دے دیا جائے تو پھر کوئی ملزم، مجرم قرار نہیں پاسکتا۔ اور جب کسی کو مجرم ہی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کے کئے کی سزا کیسی؟

نظام مدلی نہیں، اس عقیدہ کی رو سے ضابطہ اخلاق کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جب انسان کو مجبور تسلیم کر لیا جائے تو کوئی شخص نہ اچھے کاموں کے لئے مستحق تحسین قرار پائے گا اور نہ ہی بُرے کاموں کے لئے سزاوار سرزنش۔ ہم نہ تو بگری کو خوش اخلاق کہہ سکتے ہیں، نہ شیر کو بدکردار۔ اس لئے کہ وہ اپنی مرضی سے منکر المزاج ہے اور نہ ہی یہ اپنے اختیار و ارادہ سے نوحے درندگی کا حامل۔ حسن خلق اور بدکرداری کا سوال بھی وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی کو صاحب اختیار تسلیم کیا جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ کسی زاویہ سے بھی دیکھئے، تقدیر کا مروجہ عقیدہ، قابل تسلیم قرار نہیں پاتا۔ اس کے برعکس اس کی تباہ کاریوں کی زندہ شہادت، خود ہماری حالت ہے۔ قرآن کریم کا بنیادی قانون ہے کہ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (۳۲/۳۰) تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یا تو تمہاری کوئی اپنی غلطی ہوتی ہے اور یا اس کا ذمہ دار تمہارے معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اگر قرآن کی یہ تعلیم ہمارے سامنے ہوتی اور اس پر ہمارے عقیدہ اور عمل کی عمارت استوار ہوتی تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم ذلت اور پستیوں کے ان عمیق اور مہیب غاروں میں گر جاتے اور اگر کسی حادثہ کی وجہ سے ان میں گر بھی گئے تھے تو ان سے نکلنے کی کوشش نہ کرتے۔ یاد رکھیے! خدا نہ تو کسی قوم کو یونہی ذلتوں کے غاروں میں دھکیلتا ہے اور نہ ہی ان غاروں میں گری ہوئی قوم کو خود اٹھا کر باہر نکالتا ہے۔ عالم امر میں خدا کی مشیت کا فرما ہے جس میں انسان دخل نہیں دے سکتا۔ عالم کون و فساد (کائنات) میں انسان کو صاحب مشیت بنایا گیا ہے، جس میں خدا، اپنے لامحدود اختیارات کے باوجود، دخل نہیں دیتا۔ انسانی آزادی کا یہ تصور، قرآن کریم کی منفرد تعلیم ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ اگر خدا کو اس طرح قوانین کا پابند بنا دیا جائے تو اس کے قادر مطلق ہونے پر حرف آتا ہے۔ یہ اعتراض سطح بینی اور غلط نگہی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اور بستی خدا کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی عائد کرے تو اس سے واقعی خدا کے قادر مطلق ہونے پر حرف آتا ہے۔ اگر خدا خود ایک اعتراض | اپنی مرضی سے، اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کرتا ہے تو اس سے اس کے صاحب اختیار ہونے میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ یہ تو بلکہ اس کے صاحب اختیار و اقتدار ہونے کی ایک اور دلیل اور شہادت ہے۔ جب وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ قوانین متعین کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کہہ دیتا

ہے کہ لَا تَبْدِلْ رِکْمَتِ اللَّهِ (۱۰/۶۴)۔ ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہوگی، تو اس سے اس کے صاحب اختیار ہونے پر کیا حروف آتا ہے؟ بے شک وہ ان قوانین میں تبدیلی کر سکتا ہے لیکن جب اس نے خود ہی فیصلہ کر دیا کہ وہ ان میں تبدیلی نہیں کرے گا تو پھر ان میں کون تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت سے، خدا کی ذات درمیان میں سے نکل جاتی ہے۔

اطاعت خدا کی نہیں اس کے قوانین کی رہ جاتی ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دن رات کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں احکام خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر احکام خداوندی کی اطاعت سے، خدا درمیان میں سے نکل نہیں جاتا تو قوانین خداوندی کی اطاعت سے خدا کس طرح درمیان میں سے نکل جائے گا۔ جب ہم کسی مملکت کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ اگر اس مملکت کی اطاعت نہیں ہوتی تو اور کس کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسے اعتراضات کرنے والوں کو اس کا علم نہیں کہ (۱) جب کوئی حکم مستقل طور پر دے دیا جائے، یعنی کہہ دیا جائے کہ یہ حکم غیر متبدل رہے گا۔ اور (۲) اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جائے کہ اس کے مطابق عمل کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا، تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ خدا کے غیر متبدل احکام ہی اس کے قوانین ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے۔ خدا نے پانی کو حکم دیا کہ وہ نشیب کی طرف بہے اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ہمیشہ ایسا کرے۔ تو خدا کا یہ حکم اس کا

غیر متبدل حکم، قانون بن جاتا ہے | قانون بن گیا۔ خدا کے جو احکام کائنات میں نافذ تھے

(اور ہیں) وہ شروع ہی سے (قوانین فطرت کی شکل میں) غیر متبدل تھے۔ انسانی زندگی سے متعلق اس احکام، جو وحی کے ذریعے دیئے جاتے رہے، ختم نبوت کے بعد، خود بخود غیر متبدل قرار پا گئے اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے اور ان سے سرکشی کا نتیجہ کیا۔ لہذا ان کے قانون ہونے میں بھی کیا شبہ رہ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ خدا کی "مرضی" یا اس کا "حکم" کیوں نہ کہا جائے۔ اس کے "قانون کی اطاعت" کیوں کہا جائے۔ الفاظ میں کیا دھڑا ہے جو ان کی تبدیلی کو اس قدر اہمیت دی جائے۔ غواص کو مطلب ہے کہ "نہ صدف سے۔ یہ درست ہے کہ الفاظ مقصود بالذات نہیں ہوتے اس لئے ان کی تبدیلی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن جب کچھ الفاظ یا اصطلاحات ایسا مفہوم اختیار کر جائیں جو اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کر دے جس کے لئے ابتداءً انہیں تجویز کیا گیا تھا اور وہ غلط مفہوم عام ہو جائے تو اس صحیح مقصد

کو پھر سے سامنے لانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی جگہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو صحیح مفہوم کے حامل ہوں۔ ”خدا کی مرضی“ یا ”خدا کے حکم“ سے ہمارے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہر آن بدل سکتے ہیں۔ آج اُس کی مرضی کچھ اور ہے، کل کچھ اور ہو جائے گی۔ قانونِ خداوندی کہنے سے اسکا غیر تبدیل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

لیکن ”حکم یا مرضی“ کے تصور کا اس سے بھی زیادہ دُور رس نتیجہ ایک اور ہے اور وہ بہت اہم ہے۔ ایک شخص اپنے لازم کو حکم دیتا ہے کہ یہ چھٹی فلاں صاحب کو دے آؤ۔ اب اسے نہ اس کا علم ہے کہ اس چھٹی میں کیا لکھا ہے، نہ یہ معلوم کہ یہ چھٹی ان صاحب کو کیوں بھیجی جا رہی ہے۔ اس کا کام اس حکم کی تعمیل ہے اور بس۔ نہ ہی وہ اپنے آقا سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس نے اُسے ایسا حکم کیوں دیا۔ حتیٰ کہ اس چھٹی اور اس کی ترسیل میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اس میں اس کے آقا کا کوئی مقصد مضمر ہوتا ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے گا کہ میں اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس خوش اسلوبی سے اس لئے کرتا ہوں کہ اس سے وہ خوش ہوتا ہے۔ مجھے اس کی خوشنودی مقصود ہے۔

ہم احکم اور مرضی کے تصور کے ماتحت احکامِ خداوندی کی جو اطاعت کرتے ہیں تو اس کا اندازِ بعینہ یہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے قانون کی اطاعت کی جائے تو اس کی شکل اور نتیجہ کچھ اور ہو گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر آپ سے کہتا ہے کہ یہ دوائی لو، اسے اس طرح استعمال کرو اور اس کے ساتھ یہ پریزنگرو اس سے زیادہ سے زیادہ تین دن میں تمہاری تکلیف رفع ہو جائے گی۔ آپ اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ اگر تین دن کے بعد آپ کی تکلیف رفع نہیں ہوتی تو آپ سوچتے ہیں کہ اس پریزنگرام میں کہاں نقص واقع ہو گیا۔ ڈاکٹر کی تشخیص غلط تھی۔ نسخہ صحیح تجویز نہیں ہوا۔ دوائی اصلی نہیں ملی۔ اس کے استعمال میں کوئی غلطی ہو گئی۔ پریزنگرو ٹھیک نہیں ہو سکا اور اس تحقیق کے بعد اس نقص کو رفع اور غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایسا کرتے رہتے ہیں تا وقتیکہ آپ کی تکلیف رفع نہیں ہو جاتی۔ بالفاظِ دیگر جب قانون پر عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ سے ہر کھا جاسکتا ہے کہ اس پر صحیح طریق سے عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ قرآنِ کریم نے جتنے احکام دیئے ہیں، ان کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ مرتب ہو گا۔ (قرآنِ کریم کی اصطلاح میں حکم کو ”کتاب“ اور اس کی غایت یا نتیجہ کو ”حکمت“ کہا جاتا ہے۔

اس نے جو کہا ہے کہ ”کتاب و حکمت“ دونوں منزل من اللہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے یہ قوانین متعین کئے ہیں اسی نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا نتیجہ وہ کچھ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں جو خدا نے بتایا تھا۔ اگر ویسا نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ اور پھر اس کا ازالہ کرنا ہوگا۔ مثلاً قرآن کریم

عمل کا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں | نے ”اقامتِ صلوٰۃ“ کا حکم دیا تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ

وَ الْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵)۔ یقیناً صلوٰۃ بے حیائیوں اور فریب کاریوں کو روک دے گی۔ اقامتِ صلوٰۃ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد اور معاشرہ میں بے حیائیاں اور فریب کاریاں باقی نہیں رہیں گی۔ ہم صلوٰۃ کے ”حکم“ کی تعمیل کر رہے ہیں اور ہو یہ رہا ہے کہ نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور افراد (بلکہ خود نمازیوں) اور معاشرہ میں بے حیائیاں اور فریب کاریاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ صدیوں سے ہمارا یہ عمل جاری ہے اور صدیوں ہی سے معاشرہ میں یہ برائیاں عام ہو رہی ہیں۔ ہم کبھی کھڑے ہو کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اگر ہم اقامتِ صلوٰۃ کو قانونِ خداوندی سمجھتے اور اس کا نتیجہ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ، تو جب اس کا یہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا تو ہم کھڑے ہو کر سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے تھے کہ (معاذ اللہ) کہنے والے نے غلط کہا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا ایسا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ہمیں لامحالہ ہی کہنا پڑتا کہ ہمارے اس عمل میں کوئی غلطی ہے جس سے اس کا موعودہ نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ اور اس کے بعد ہم، قرآن کریم کی روشنی میں یہ دیکھ لیتے کہ وہ غلطی کیا ہے۔ اس کا ازالہ کرتے تو اس کا موعودہ نتیجہ مشکل ہو کر سامنے آجائے۔

یہ تو ہم نے محض ایک مثال دی ہے۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم کا یہی بیج ہے۔ اس میں ہر حکم اور اصول، قانون کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا، اور وہ کس طرح اسی دنیا میں ہمارے سامنے آجائے گا۔ (آخرت کا نتیجہ اس پر ستراد ہے) اگر قرآن میں اس کی وضاحت نہ کی جاتی تو ہمارے پاس اس بات کے پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا کہ ان احکام پر صحیح طور پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہم نے قرآن کی اس حکمت کو نظر انداز کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم ان احکام کی (برزخِ حیث) پابندی میں اس قدر مشغول بھی لگتی ہے اور اس کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ”مذہب“ اور ”دین“ میں فرق یہ ہے کہ مذہب میں احکام کی تعمیل کی جاتی ہے اور اس سے مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے اور دین میں

قوانین خداوندی کی تعمیل کی جاتی ہے جس کا جیتا جاگتا، درخشندہ و تابندہ نتیجہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جب اسلام دین کی حیثیت سے ہمارے سامنے تھا تو خدا کا تصور قانون دینے والے کا سا تھا اور اس کے احکام کی تعمیل کی صحت و قہم کا اندازہ ان کے نتائج سے لگایا جاتا تھا۔ خدا کا بھی یہ تصور تھا اور اس کے نام پر قائم ہونی والی مملکت کا بھی یہی تصور۔ اس میں بھی اطاعت قانون کی ہوتی تھی، حکمرانوں کی مرضی کی نہیں۔ اس کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو خدا کا تصور بھی ایک آمر مطلق کا سا ہو گیا اور حکمرانوں کی حیثیت بھی ڈکٹیٹروں کی سی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج "احکام کی اطاعت" کا مطلب تو ہماری سمجھ میں آتا ہے "قانون کی اطاعت" کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ یاد رکھئے، کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصور ہوگا، اسی قسم کا اس قوم کے معاشرہ کا نقشہ ہوگا۔ قرآنی تصور کا خدا، اپنی لائتھا قوتوں کے باوجود، قاعدے اور قانون والا خدا ہے، اس لئے اسے ماننے والی قوم، دنیا میں انتہائی درجہ کی قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے والی قوم ہوگی۔ یہی تقدیر کا اعلیٰ مفہوم ہے یعنی اپنے اختیار و ارادوں سے قوانین خداوندی کی اطاعت۔

اگر تقدیر کا یہ مفہوم قوم کے سامنے آ جائے، تو اس قوم کی "تمقیر" دنوں میں بدل جائے۔ قرآن کی تعلیم کی تو کیفیت یہ ہے کہ

چوں بجاں و رفت، جاں دیگر شود

اور

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

والسلام

انڈکس

اس کتاب میں جو آیات آئی ہیں (خواہ وہ پوری آیت ہو یا محض آیت کا حوالہ) انہیں صفحہ کیساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ فلاں آیت کا مطلب کیا ہے تو اسے تلاش کرنے میں وقت نہ ہو۔ حوالہ میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔

آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر
سورۃ ۱	۶۱	۸۲، ۳۱۰	۱۷۷	۲۵۱	۱۸۶	۱۲۱، ۳۰۷	۲۵۱
۵-۷	۷۹	۷۰، ۸۲	۱۷۸	۲۵۲	۱۰۹	۲۰۳، ۲۰۳، ۲۲۰	۲۵۲
	۸۱-۸۲	۶۹	۱۸۳	۲۵۳	۲۷		
سورۃ ۷	۸۵	۸۳، ۱۴۵	۱۸۳	۲۵۵	۱۰۹	۶۱، ۲۰۲	۲۵۵
۲	۱۰۳	۱۲۲، ۱۴۵	۱۸۶	۲۵۶	۳۶۵، ۳۶۸	۱۲۱، ۲۵۸	۲۵۶
۳	۱۰۵	۲۳۰	۱۸۷	۲۵۷	۱۱۷	۲۲۲	۲۵۷
۴	۱۱۰	۱۲۶	۱۸۷	۲۵۸		۲۲۷	۲۵۸
۵	۱۱۲	۸۳	۲۰۱	۲۵۹	۶۹، ۹۶، ۲۷۷	۲۳۱	۲۵۹
۶	۱۲۶	۱۲۶	۲۰۶	۲۶۱	۳۱۲	۲۹۰	۲۶۱
۷	۱۱۶	۲۵	۲۱۲	۲۶۲	۲۹۲	۱۶۲، ۲۹۰	۲۶۲
۱۶	۱۱۷	۳۶	۲۱۳	۲۶۳	۲۲۲، ۲۶۱	۲۹۰	۲۶۳
۱۸	۱۲۰	۲۳۸	۲۱۴	۲۶۴	۹۷، ۳۳۰	"	۲۶۴
۲۲	۱۲۳	۷۶	۲۱۶	۲۶۵	۱۰۹، ۱۲۲	"	۲۶۵
۲۵	۱۲۶	۲۸۰	۲۱۸	۲۶۷	۳۸۹	"	۲۶۷
۲۶	۱۳۲	۷۰	۲۱۹	۲۶۸	۲۸۲، ۲۹۰، ۳۶۰	۲۶۱	۲۶۸
۲۹	۱۳۹	۷۷	۲۲۰	۲۶۹	۳۶۰	۱۶۲	۲۶۹
۳۱	۱۴۱	۷۰	۲۲۵	۲۷۰	۶۹	۲۸۲	۲۷۰
۳۲	۱۵۲	۵۷	۲۲۲	۲۷۱	۷۷	"	۲۷۱
۳۶	۱۵۲	۹۹، ۳۲۰	۲۳۵	۲۷۲	۷۷، ۱۰۹	۱۶۲	۲۷۲
۳۸	۱۵۵	۹۸، ۲۹۲	۲۳۷	۲۷۳	۷۷	۶۹	۲۷۳
"	۱۵۶	۹۸	۲۳۵	۲۷۴	۲۹۰	۱۵۱	۲۷۴
۳۹	۱۵۷	۹۱، ۲۲۲	۲۳۷	۲۷۵	۳۰۷	۲۱۶، ۲۲۹، ۲۲۶	۲۷۵
۴۸	۱۷۰	۲۵۲	۲۳۹	۲۷۶	۱۲۰	۷۰، ۲۲۹، ۳۷۸	۲۷۶
۵۹	۱۷۱	۲۵۲	۲۴۰	۲۷۷	۱۲۱، ۳۰۷، ۳۷۷		۲۷۷

آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر
سورۃ ۳		۱۳۹	۹۸	۱۳۹	۱۳۹	۱۳۹	۱۳۹
۳۵۷	۱۳۳	۳۵۷	۳۲	۳۵۷	۳۲	۳۵۷	۳۲
۳۷۸	۱۳۷	۳۷۸	۳۳	۳۷۸	۳۳	۳۷۸	۳۳
۳۱۸	۱۴۷	۳۵۰، ۳۵۴	۳۴	۳۷۸	۳۴	۳۷۸	۳۴
۳۷۸	۱۴۷	۳۵۴	۳۵	۳۷۸	۳۵	۳۷۸	۳۵
۳۷۸	۱۴۷	۳۷۸	۳۸	۳۷۸	۳۸	۳۷۸	۳۸
۳۷۸	۱۴۸	۱۵۹، ۳۷۸، ۳۷۹	۴۰	۳۷۸	۴۰	۳۷۸	۴۰
۳۷۸	۱۴۸	۸۱	۴۲	۳۷۸	۴۲	۳۷۸	۴۲
سورۃ ۵		۳۷۸	۴۵	۳۷۸	۴۵	۳۷۸	۴۵
۳۵، ۳۷۰	۱	۳۷۸	۴۸	۳۷۸	۴۸	۳۷۸	۴۸
۱۵۱	۴	۳۷۹	۷۱	۳۷۸	۷۱	۳۷۸	۷۱
۳۷۹	۹	۳۷۹	۷۵	۳۷۸	۷۵	۳۷۸	۷۵
۳۷۹	۱۴	۸۵، ۱۳۵، ۳۷۵	۷۸	۳۷۸	۷۸	۳۷۸	۷۸
۳۷۹	۱۸	۸۵، ۱۳۵	۷۹	۳۷۸	۷۹	۳۷۸	۷۹
۳۷۹	۲۱	۱۱۲، ۱۹۲	۸۲	۳۷۸	۸۲	۳۷۸	۸۲
۳۷۹، ۳۰۴	۲۴	۵۳، ۳۳۸	۹۲	۳۷۸	۹۲	۳۷۸	۹۲
۳۷۸	۳۲	۳۷۸	۹۳	۳۷۸	۹۳	۳۷۸	۹۳
۳۷۸	۳۴	۳۷۹، ۳۹۰	۹۵	۳۷۸	۹۵	۳۷۸	۹۵
۳۷۵	۳۸	۳۹۰	۹۶	۳۷۸	۹۶	۳۷۸	۹۶
۳۷۵	۳۹	۹۱	۹۷	۳۷۸	۹۷	۳۷۸	۹۷
۳۷۵، ۳۷۵	۴۰	۳۷۹	۱۰۲	۳۷۸	۱۰۲	۳۷۸	۱۰۲
۳۰۰	۴۸	۱۰۹	۱۰۳	۳۷۸	۱۰۳	۳۷۸	۱۰۳
۳۰۰، ۳۷۲	۴۹	۹۸	۱۰۴	۳۷۸	۱۰۴	۳۷۸	۱۰۴
۱۴۵	۵۵	۷۴	۱۱۱	۳۷۸	۱۱۱	۳۷۸	۱۱۱
۱۴۵، ۳۷۹	۵۶	۵۷	۱۱۵	۳۷۸	۱۱۵	۳۷۸	۱۱۵
۳۷۹	۵۷	۳۷۹، ۳۷۷	۱۱۶	۳۷۸	۱۱۶	۳۷۸	۱۱۶
۱۳۷	۷۴	۷۲	۱۲۳	۳۷۸	۱۲۳	۳۷۸	۱۲۳
۳۷۹، ۳۷۰	۷۷	۳۷۸	۱۲۴	۳۷۸	۱۲۴	۳۷۸	۱۲۴
۸۲، ۳۷۱	۸۰	۱۰۹	۱۲۷	سورۃ ۷		۳۱۹	۱۲۲
۳۷۸	۸۳	۳۱۲، ۳۱۳	۱۳۳	۳۷۸	۱	۳۷۸	۱۲۵
۳۷۱	۹۹	۵۲	۱۳۴	۳۷۸	۱۷	۳۷۸	۱۲۸
۹۳، ۹۴، ۱۳۸، ۳۷۴	۱۰۵	۱۸۶	۱۳۶	۳۷۸	۲۲	۳۷۸	۱۳۶
۳۸۰	۱۱۴	۳۰۹	۱۳۹	۳۷۸	۲۵	۳۷۸	۱۳۸

آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱۱۹	۲۳۰	۱۲۰	۲۳۴	۱۵۴	۱۱۷، ۳۲۳، ۳۷۲	۳۹	۱۴۴
۱۲۰	۲۳۰	۱۲۵	۲۴۰	۱۵۷	۳۹۰	۳۹	۱۰۴، ۲۳۰
		۱۲۶	۲۴۸	۱۶۵	۳۲۲	۴۱	۱۲۵
سورۃ ۴		۱۲۸	۳۱۳	۱۷۸	۲۴۱، ۲۴۶	۵۰	۷۹
		۱۲۹	۲۰۷	۱۷۹	۲۵۶	۵۱	۱۰۸، ۱۱۶
۴	۱۰۳	۱۳۲	۱۰۱	۱۹۳	۲۵۲	۵۲	۳۲۲
۱۱	۱۰۳	۱۳۳	۲۹۶، ۳۰۰	۱۹۴	۳۴۸	۵۵	۳۲۲
۱۲	۴۷	۱۳۴	۲۱۳	۱۹۸	۲۵۲	۷۰	۸۳
۱۴	۳۶	۱۳۸	۲۰۰	۲۰۱	۱۵۷	۸۲	۷۰، ۷۲
۱۷	۱۴۷، ۱۴۹	۱۴۱	۲۴۰	۲۰۲	۲۴۰	۸۵	۳۲۲
۲۵	۲۵۳	۱۴۵	۲۴۰			۸۷-۸۷	۲۵۲
۳۲	۴۳	۱۴۹	۲۴۰	سورۃ ۷		۹۳	۲۵۲
۳۵-۳۶	۲۰۲	۱۵۰	۵۴۱، ۱۴۳، ۳۳۰، ۳۴۰			۹۴	۷۲
۳۷	۲۰۱	۱۵۲	۲۴۰	۲	۲۸۰	۹۵	۷۲
۳۹	۲۴۲، ۲۴۷	۱۵۴	۲۷۳	۹	۳۱۸	۱۰۳	۳۸۵
۴۵	۱۰۳	۱۶۵	۶۹	۱۰	۳۱۸، ۳۸۴	۱۰۵	۷۲
۴۸	۱۴۴	۱۶۶	۲۹۹	۱۱	۳۸۴	۱۱۱	۱۵۰، ۲۸۵
۴۹	۳۲۲			۱۲	۳۱۸	۱۱۵	۲۶۸
۵۴	۴۷، ۳۸۸	سورۃ ۸		۱۷	۱۵۰	۱۲۷	۵۷، ۲۵۷
۵۹	۴۲، ۱۱۰			۲۵	۸۹، ۳۲۸		
۶۷	۱۱۱	۱۶	۲۴۴، ۵۴	۲۹	۱۶۵	سورۃ ۹	
۷۰	۲۲۸	۱۸	۵۴	۴۲	۱۰۰		
۷۱	۱۴۷، ۲۳۸، ۲۴۳	۲۰	۱۵۴	۴۴	۳۱۹	۵	۷۲
۷۸	۲۴۱	۲۳	۲۴۱	۴۰	۵۷، ۱۰۰	۹	۲۲۲
۸۱	۲۴۱	۴۷	۳۷۸	۴۵	۹۸، ۳۰۵	۱۵	۷۴
۸۳	۱۶۵، ۲۴۳	۵۴	۳۵	۶۶	۱۲۰، ۱۶۵، ۳۱۹	۱۸	۱۴۷
۸۴	۲۱۹	۵۵	۳۶۹	۶۸	۱۱۶	۲۳	۷۴، ۷۵
۹۷	۵۸	۵۸	۱۱۹، ۱۳۶	۷۴	۲۸۰	۲۵	۲۶۱
۱۰۲	۴۸	۸۹	۳۷۸	۷۸		۲۷-۲۷	۳۱۰
۱۰۵	۷۴، ۲۵۹	۹۶	۱۴۸، ۱۶۵، ۲۷۹	سورۃ ۱۰		۳۰	۸۱
۱۰۸	۲۰۰	۱۲۸	۳۰۶			۳۱	۲۷۲
۱۱۲	۲۶۳	۱۳۷	۳۰۶	۱۹	۲۴۳، ۲۹۶	۴۳	۲۲۵
۱۱۶	۴۲	۱۴۷	۷۲	۲۰	۲۴۳	۴۷	۸۴
۱۱۷	۲۴۶	۱۵۵	۲۶۳، ۳۲۳	۲۲	۲۴۷	۴۹	۱۰۶، ۱۴۷
				۲۵	۲۸۴	۵۴	۸۴

آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر
٤٢	١٤٦ و ٣٠٩	٩٩	٢١٠	سورۃ ١٤	١٨-٢٠	٥٢، ٤٠، ٩٣،	صفحہ نمبر
٤٣	" "	سورۃ ١٣		٣٤	" "	٢٢٢، ٢٤٨ و ٢٩٥	
٤٤	٣٧، ١٤٦ و ٣٠٩	٩	٢٥٩	٢٥٩	٢١	٤٠ و ٢٩٥	
٤٥	٣٠٩	١٢	٢٤٢	٢٤٢	٢٣	٢٩٠	
٤٦	١٠٣	٢١	٣٤٨	٣٤٨	٢٣-٢٩	٢٩٠	
٤٧	٢٥٢	٢٠	١٣٩ و ١٣٠، ١٣٣	١٣٩ و ١٣٠، ١٣٣	٢٠	٢١٤ و ٢٩٠	
٤٨	٢٨٢	٢٣	٨٣	٨٣	٢٣	٢٤٣	
٤٩	٣٤٨	٢٤	٨٠	٨٠	٢١	٢٥٢	
٥٠	٣٤٢	٣٥	١٤٣، ٢٠٣ و ٢٤٠	١٤٣، ٢٠٣ و ٢٤٠	٢٥-٢٧	٢٢٢	
٥١	٣٤٢	٣٦	١٠٣ و ٢٤٠	١٠٣ و ٢٤٠	٥٢	٢٢	
٥٢	٣٤٢	٣٧	٢٢٥ و ٢٤٠، ٢٤٩	٢٢٥ و ٢٤٠، ٢٤٩	٥٨	١٥٤	
٥٣	٣٤٢	٣٨	٢٤	٢٤	٥٨	١٥٤	
٥٤	٣٤٢	٣٩	٢٨٥ و ٣٠٠	٢٨٥ و ٣٠٠	٥٨	١٥٤	
٥٥	٣٤٢	٤٠	١٠٥	١٠٥	٤٠	٣٨٤ و ٣٥٥	
٥٦	٣٤٢	٤١	٢٣٣	٢٣٣	٤٢	٣٨٤	
٥٧	٣٤٢	٤٢	٢٨٥ و ٢٩٣، ٢٩٩	٢٨٥ و ٢٩٣، ٢٩٩	٤٢	٨٩	
٥٨	٣٤٢	٤٣	٢٤٢	٢٤٢	٨٣	٢٠٤ و ٢١٢	
٥٩	٣٤٢	٤٤-٤٥	٥٣	٥٣	٨٤	٢٤٤	
٦٠	٣٤٢	٩٢	٢٩٨	٢٩٨	٩٤-٩٨		
٦١	٣٤٢	٩٣	٢١٤ و ٢١٨، ٢٥٩	٢١٤ و ٢١٨، ٢٥٩			
٦٢	٣٤٢	٩٤	٢٤٢	٢٤٢			
٦٣	٣٤٢	٩٥	١٢٣	١٢٣			
٦٤	٣٤٢	٩٦-٩٧	٤٢	٤٢			
٦٥	٣٤٢	٩٨-١٠٠	١٥٤	١٥٤			
٦٦	٣٤٢	١٠١	٢٢٥	٢٢٥			
٦٧	٣٤٢	١٠٢	٥٣، ٢٥٥ و ٢٤٨	٥٣، ٢٥٥ و ٢٤٨			
٦٨	٣٤٢	١٠٣	٢٥٥	٢٥٥			
٦٩	٣٤٢	١٠٤	٢٥٥	٢٥٥			
٧٠	٣٤٢	١٠٥	٢٤٩	٢٤٩			
٧١	٣٤٢	١٠٦	٥٢	٥٢			
٧٢	٣٤٢	١٠٧					
٧٣	٣٤٢	١٠٨					
٧٤	٣٤٢	١٠٩					
٧٥	٣٤٢	١١٠					
٧٦	٣٤٢	١١١					
٧٧	٣٤٢	١١٢					
٧٨	٣٤٢	١١٣					
٧٩	٣٤٢	١١٤					
٨٠	٣٤٢	١١٥					
٨١	٣٤٢	١١٦					
٨٢	٣٤٢	١١٧					
٨٣	٣٤٢	١١٨					
٨٤	٣٤٢	١١٩					
٨٥	٣٤٢	١٢٠					
٨٦	٣٤٢	١٢١					
٨٧	٣٤٢	١٢٢					
٨٨	٣٤٢	١٢٣					
٨٩	٣٤٢	١٢٤					
٩٠	٣٤٢	١٢٥					
٩١	٣٤٢	١٢٦					
٩٢	٣٤٢	١٢٧					
٩٣	٣٤٢	١٢٨					
٩٤	٣٤٢	١٢٩					
٩٥	٣٤٢	١٣٠					
٩٦	٣٤٢	١٣١					
٩٧	٣٤٢	١٣٢					
٩٨	٣٤٢	١٣٣					
٩٩	٣٤٢	١٣٤					
١٠٠	٣٤٢	١٣٥					
١٠١	٣٤٢	١٣٦					
١٠٢	٣٤٢	١٣٧					
١٠٣	٣٤٢	١٣٨					
١٠٤	٣٤٢	١٣٩					
١٠٥	٣٤٢	١٤٠					
١٠٦	٣٤٢	١٤١					
١٠٧	٣٤٢	١٤٢					
١٠٨	٣٤٢	١٤٣					
١٠٩	٣٤٢	١٤٤					
١١٠	٣٤٢	١٤٥					
١١١	٣٤٢	١٤٦					
١١٢	٣٤٢	١٤٧					
١١٣	٣٤٢	١٤٨					
١١٤	٣٤٢	١٤٩					
١١٥	٣٤٢	١٥٠					
١١٦	٣٤٢	١٥١					
١١٧	٣٤٢	١٥٢					
١١٨	٣٤٢	١٥٣					
١١٩	٣٤٢	١٥٤					
١٢٠	٣٤٢	١٥٥					
١٢١	٣٤٢	١٥٦					
١٢٢	٣٤٢	١٥٧					
١٢٣	٣٤٢	١٥٨					
١٢٤	٣٤٢	١٥٩					
١٢٥	٣٤٢	١٦٠					
١٢٦	٣٤٢	١٦١					
١٢٧	٣٤٢	١٦٢					
١٢٨	٣٤٢	١٦٣					
١٢٩	٣٤٢	١٦٤					
١٣٠	٣٤٢	١٦٥					
١٣١	٣٤٢	١٦٦					
١٣٢	٣٤٢	١٦٧					
١٣٣	٣٤٢	١٦٨					
١٣٤	٣٤٢	١٦٩					
١٣٥	٣٤٢	١٧٠					
١٣٦	٣٤٢	١٧١					
١٣٧	٣٤٢	١٧٢					
١٣٨	٣٤٢	١٧٣					
١٣٩	٣٤٢	١٧٤					
١٤٠	٣٤٢	١٧٥					
١٤١	٣٤٢	١٧٦					
١٤٢	٣٤٢	١٧٧					
١٤٣	٣٤٢	١٧٨					
١٤٤	٣٤٢	١٧٩					
١٤٥	٣٤٢	١٨٠					
١٤٦	٣٤٢	١٨١					
١٤٧	٣٤٢	١٨٢					
١٤٨	٣٤٢	١٨٣					
١٤٩	٣٤٢	١٨٤					
١٥٠	٣٤٢	١٨٥					
١٥١	٣٤٢	١٨٦					
١٥٢	٣٤٢	١٨٧					
١٥٣	٣٤٢	١٨٨					
١٥٤	٣٤٢	١٨٩					
١٥٥	٣٤٢	١٩٠					
١٥٦	٣٤٢	١٩١					
١٥٧	٣٤٢	١٩٢					
١٥٨	٣٤٢	١٩٣					
١٥٩	٣٤٢	١٩٤					
١٦٠	٣٤٢	١٩٥					
١٦١	٣٤٢	١٩٦					
١٦٢	٣٤٢	١٩٧					
١٦٣	٣٤٢	١٩٨					
١٦٤	٣٤٢	١٩٩					
١٦٥	٣٤٢	٢٠٠					
١٦٦	٣٤٢	٢٠١					
١٦٧	٣٤٢	٢٠٢					
١٦٨	٣٤٢	٢٠٣					
١٦٩	٣٤٢	٢٠٤					
١٧٠	٣٤٢	٢٠٥					
١٧١	٣٤٢	٢٠٦					
١٧٢	٣٤٢	٢٠٧					
١٧٣	٣٤٢	٢٠٨					
١٧٤	٣٤٢	٢٠٩					
١٧٥	٣٤٢	٢١٠					
١٧٦	٣٤٢	٢١١					
١٧٧	٣٤٢	٢١٢					
١٧٨	٣٤٢	٢١٣					
١٧٩	٣٤٢	٢١٤					
١٨٠	٣٤٢	٢١٥					
١٨١	٣٤٢	٢١٦					
١٨٢	٣٤٢	٢١٧					
١٨٣	٣٤٢	٢١٨					
١٨٤	٣٤٢	٢١٩					
١٨٥	٣٤٢	٢٢٠					
١٨٦	٣٤٢	٢٢١					
١٨٧	٣٤٢	٢٢٢					
١٨٨	٣٤٢	٢٢٣					
١٨٩	٣٤٢	٢٢٤					
١٩٠	٣٤٢	٢٢٥					
١٩١	٣٤٢	٢٢٦					
١٩٢	٣٤٢	٢٢٧					
١٩٣	٣٤٢	٢٢٨					
١٩٤	٣٤٢	٢٢٩					
١٩٥	٣٤٢	٢٣٠					
١٩٦	٣٤٢	٢٣١					
١٩٧	٣٤٢	٢٣٢					
١٩٨	٣٤٢	٢٣٣					
١٩٩	٣٤٢	٢٣٤					
٢٠٠	٣٤٢	٢٣٥					
٢٠١	٣٤٢	٢٣٦					
٢٠٢	٣٤٢	٢٣٧					
٢٠٣	٣٤٢	٢٣٨					
٢٠٤	٣٤٢	٢٣٩					
٢٠٥	٣٤٢	٢٤٠					
٢٠٦	٣٤٢	٢٤١					
٢٠٧	٣٤٢	٢٤٢					
٢٠٨	٣٤٢	٢٤٣					
٢٠٩	٣٤٢	٢٤٤					
٢١٠	٣٤٢	٢٤٥					
٢١١	٣٤٢	٢٤٦					
٢١٢	٣٤٢	٢٤٧					
٢١٣	٣٤٢	٢٤٨					
٢١٤	٣٤٢	٢٤٩					
٢١٥	٣٤٢	٢٥٠					
٢١٦	٣٤٢	٢٥١					
٢١٧	٣٤٢	٢٥٢					
٢١٨	٣٤٢	٢٥٣					
٢١٩	٣٤٢	٢٥٤					
٢٢٠	٣٤٢	٢٥٥					
٢٢١	٣٤٢	٢٥٦					
٢٢٢	٣٤٢	٢٥٧					
٢٢٣	٣٤٢	٢٥٨					
٢٢٤	٣٤٢	٢٥٩					
٢٢٥	٣٤٢	٢٦٠					
٢٢٦	٣٤٢	٢٦١					
٢٢٧	٣٤٢	٢٦٢					
٢٢٨	٣٤٢	٢٦٣					
٢٢٩	٣٤٢	٢٦٤					
٢٣٠	٣٤٢	٢٦٥					
٢٣١	٣٤٢	٢٦٦					
٢٣٢	٣٤٢	٢٦٧					
٢٣٣	٣٤٢	٢٦٨					
٢٣٤	٣٤٢	٢٦٩					

آيت نمبر	صفحہ نمبر	آيت نمبر	صفحہ نمبر	آيت نمبر	صفحہ نمبر	آيت نمبر	صفحہ نمبر
سورة ٣٤	٥٠	سورة ٣٥	٥٠	سورة ٣٦	٥٠	سورة ٣٧	٥٠
١٠-٢٥	٢٥٥	١٠-٢٥	٢٥٥	١٠-٢٥	٢٥٥	١٠-٢٥	٢٥٥
١١	٢٥٤	١١	٢٥٤	١١	٢٥٤	١١	٢٥٤
١٢	٨٢	١٢	٨٢	١٢	٨٢	١٢	٨٢
٢٢	٣١١	٢٢	٣١١	٢٢	٣١١	٢٢	٣١١
٣٨	٢١٥، ٥٨	٣٨	٢١٥، ٥٨	٣٨	٢١٥، ٥٨	٣٨	٢١٥، ٥٨
٢٣	٢١١	٢٣	٢١١	٢٣	٢١١	٢٣	٢١١
٢٤	٥٥، ١٤٣، ٢٠٣، ٢٩٢	٢٤	٥٥، ١٤٣، ٢٠٣، ٢٩٢	٢٤	٥٥، ١٤٣، ٢٠٣، ٢٩٢	٢٤	٥٥، ١٤٣، ٢٠٣، ٢٩٢
٤٠-٤٢	١٥٢	٤٠-٤٢	١٥٢	٤٠-٤٢	١٥٢	٤٠-٤٢	١٥٢
٨٢	١٩٥، ٣٠٥	٨٢	١٩٥، ٣٠٥	٨٢	١٩٥، ٣٠٥	٨٢	١٩٥، ٣٠٥
سورة ٣٤	١٢	سورة ٣٤	١٢	سورة ٣٤	١٢	سورة ٣٤	١٢
٣٣	٩٠	٣٣	٩٠	٣٣	٩٠	٣٣	٩٠
٢٢	٣١١	٢٢	٣١١	٢٢	٣١١	٢٢	٣١١
٤٥	٣٤١	٤٥	٣٤١	٤٥	٣٤١	٤٥	٣٤١
١٠٢	٢١٠	١٠٢	٢١٠	١٠٢	٢١٠	١٠٢	٢١٠
١٢٥	٣٤	١٢٥	٣٤	١٢٥	٣٤	١٢٥	٣٤
سورة ٣٤	٨٣	سورة ٣٤	٨٣	سورة ٣٤	٨٣	سورة ٣٤	٨٣
٣٩	١٥٤	٣٩	١٥٤	٣٩	١٥٤	٣٩	١٥٤
سورة ٣٩	٤٠	سورة ٣٩	٤٠	سورة ٣٩	٤٠	سورة ٣٩	٤٠
١٣	٤٤	١٣	٤٤	١٣	٤٤	١٣	٤٤
٢٢	٢٤٨	٢٢	٢٤٨	٢٢	٢٤٨	٢٢	٢٤٨
٢٣	٢٢١، ٢٤٢، ٢٤٨	٢٣	٢٢١، ٢٤٢، ٢٤٨	٢٣	٢٢١، ٢٤٢، ٢٤٨	٢٣	٢٢١، ٢٤٢، ٢٤٨
٣٠	٢٢٥	٣٠	٢٢٥	٣٠	٢٢٥	٣٠	٢٢٥
٣٤	٢٤٤	٣٤	٢٤٤	٣٤	٢٤٤	٣٤	٢٤٤
٢٨	١٢٩	٢٨	١٢٩	٢٨	١٢٩	٢٨	١٢٩
٢١	٢٢٠	٢١	٢٢٠	٢١	٢٢٠	٢١	٢٢٠
٢٨	٨٠	٢٨	٨٠	٢٨	٨٠	٢٨	٨٠
٢٩	٢٨٥، ٢٨٨	٢٩	٢٨٥، ٢٨٨	٢٩	٢٨٥، ٢٨٨	٢٩	٢٨٥، ٢٨٨
٥٠-٥٢	٢٨٨	٥٠-٥٢	٢٨٨	٥٠-٥٢	٢٨٨	٥٠-٥٢	٢٨٨
٥٣-٥٣	٣٨٨	٥٣-٥٣	٣٨٨	٥٣-٥٣	٣٨٨	٥٣-٥٣	٣٨٨
٥٤	٢٣٩	٥٤	٢٣٩	٥٤	٢٣٩	٥٤	٢٣٩
٤٩-٥٠	٨٢	٤٩-٥٠	٨٢	٤٩-٥٠	٨٢	٤٩-٥٠	٨٢
سورة ٣٤	١٣	سورة ٣٤	١٣	سورة ٣٤	١٣	سورة ٣٤	١٣
١٤	٤٩، ٤٢، ٨٢	١٤	٤٩، ٤٢، ٨٢	١٤	٤٩، ٤٢، ٨٢	١٤	٤٩، ٤٢، ٨٢
١٩	٤٢	١٩	٤٢	١٩	٤٢	١٩	٤٢
٢١	٨٢	٢١	٨٢	٢١	٨٢	٢١	٨٢
سورة ٣٤	٢٩	سورة ٣٤	٢٩	سورة ٣٤	٢٩	سورة ٣٤	٢٩
١١	٣١٢	١١	٣١٢	١١	٣١٢	١١	٣١٢

آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر	آیت نمبر	صفحہ نمبر
سورة ٥٨	١٤	سورة ٦٤	٨	سورة ٥٨	١٠	سورة ٥٨	١٠
٨٣, ٢٢٧, ٢٨٠	١٤	٣٤٨	٨	١٢٢, ١٢٨	١٠	١٢٢, ١٢٨	١٠
٨٣, ٢٢٧, ٢٨٠	١٤	سورة ٦٤	٢٠	٣١٠	٢٠	٣١٠	٢٠
٨٣, ٢٨٠	١٨	٤٢, ١٢٥, ٣٣٩	٢	٢٤, ١١٤, ٢١٠	٢١	٢٤, ١١٤, ٢١٠	٢١
٨٣, ٢٨٠	١٩	٢٥٤	١٠	سورة ٥٩	٥	سورة ٥٩	٥
٢٨٠	٢٠	٢٤٧	٢١	١١٩	٥	١١٩	٥
٨١	٢٢	٢٤٧	٣٠	٢٨٧	٤	٢٨٧	٤
سورة ٩٠	١٠	سورة ٦٤	٢٠	٣١٥	٨	٣١٥	٨
٥٢, ٢٥٩, ٣٩٢	١٠	سورة ٦٤	٢٠	٣٤٨	١٠	٣٤٨	١٠
سورة ٩١	٩-١٠	سورة ٦٤	٢٠	٨٢	١٨	٨٢	١٨
٤٣	٩-١٠	سورة ٦٤	٢٠	سورة ٦٤	٥	سورة ٦٤	٥
سورة ٩٢	٢-١٠	٢١٣, ٢٥٩	١١-١٢	٣٤٨	٥	٣٤٨	٥
٨٣	٢-١٠	٢٤٧	٢٥-٣٢	سورة ٦٤	٥	سورة ٦٤	٥
١٤٤	٤-١٠	سورة ٦٤	٢٠	٣٤٨	٥	٣٤٨	٥
٢٣٨	١٢	سورة ٦٤	٢٠	سورة ٦٤	٥	سورة ٦٤	٥
سورة ٩٤	٢	٣٥٢	٩	سورة ٦٤	٥	سورة ٦٤	٥
١٥١	٢	٢١٣	٢٤	٥٦, ٢٢٤, ٢٥٤	٥	٥٦, ٢٢٤, ٢٥٤	٥
سورة ٩٨	٣	٢١٣	٢٨	٣١٤	٩-١٢	٣١٤	٩-١٢
١٠٩	٣	٢١٣	٢٨	٣١٨	١٢	٣١٨	١٢
سورة ٩٩	٤-٨	٢١٣, ٣٨١	٢٩	سورة ٦٤	٨	سورة ٦٤	٨
٤٢	٤-٨	سورة ٦٤	٢٠	٢٣٥	٨	٢٣٥	٨
١٢٤	٤-٨	سورة ٦٤	٢٠	٢٤٤	١٠	٢٤٤	١٠
سورة ١٠١	٥-٧	٨٢	٥	٢٨٤	١١	٢٨٤	١١
٤٢	٥-٧	٤٣	١١	سورة ٦٤	٨	سورة ٦٤	٨
سورة ١٠٢	٢	سورة ٦٤	٢٠	٣٠٩	٨	٣٠٩	٨
٢٤٩	٢	سورة ٦٤	٢٠	٣٣٤	١١	٣٣٤	١١
سورة ١٠٩	٤	٤٢	٣٤	سورة ٦٤	٨	سورة ٦٤	٨
٤٤	٤	٢٥٤	١٢	٢٨٤	١١	٢٨٤	١١
سورة ١١٣	١-٢	سورة ٦٤	٢٠	١١٨, ١٢٧	١١	١١٨, ١٢٧	١١
١٣٥	١-٢	٨٤	١٢	١٢٧	١٤	١٢٧	١٤
سورة ١١٣	١-٢	٢١٣, ٣٣٨	٢-٣	سورة ٦٥	٣	سورة ٦٥	٣
سورة ١١٣	١-٢	٢٠٧	٦-٤	٣٩٢	٢	٣٩٢	٢
سورة ١١٣	١-٢	٢٠٧	٦-٤	٥٢, ٣٩٢, ٢٥٩	٣	٥٢, ٣٩٢, ٢٥٩	٣
سورة ١١٣	١-٢	٢٠٧	٦-٤	٣٢٨	٤	٣٢٨	٤
سورة ١١٣	١-٢	٢٠٧	٦-٤	١٣٨	٤	١٣٨	٤